JAN. '86

Rs. 2/-

جانِ صبا
اچھی دُھلائی ، اچھی صفائی کے لیے
لہن مارکہ
لاکھوں کا پسند
دانتوں کی حفاظت اور صفائی کے لیے

مودی
دھلائی کا
صابن
MODI
WASHING SOAP
MODI SOAP
مودی
پنجاب سوپ فیکٹری

ترقی پسند ادب کا ترجمان

جنوری ۱۹۸۶ء

○ مدیر و مؤسس :- ادریس سنہاروی (مرحوم)
○ مدیر اعلیٰ :- مسعود منظر سنہاروی
○ مدیر :- جمیل منظر سنہاروی
○ معاونین :- شکیل احمد جمالی
عبدالقیوم ابدالی

مجلس مشاورت
○ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
○ ڈاکٹر قمر رئیس
○ اصغر علی انجینیر
○ ڈاکٹر برج پریمی

○ جلد نمبر ۳۸ ، شمارہ نمبر ۱
○ بدل اشتراک فی شمارہ ۲ روپے
○ زر سالانہ ۲۴ روپے ، لائف ممبری ۲۵۱
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
○ ماہنامہ سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۵۷۳

۱	عصری ادب (منور)	جمیل منظر سنہاروی	۸
۲	کالی داس گپتا رضا کا غیر مطبوعہ کلام	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	۹
۳	زبان کیا ہے	علی عباس عزلے	۲۵
۴	گیت	آسی رام نگری	۲۹
۵	دھرتی چپ آکاش بھی چپ (نظم)	نفور قریشی	۲۹
۶	نظمیں	منصور اعجاز	۳۰
۷	غزلیں	مشتاق شبنم	۳۱
۸	غزلیں	بدیع الزماں خاور، رؤف خیر، محفوظ کیفی	۳۲
۹	الاسٹر (کہانی)	ڈاکٹر اسلم حنیف	۳۳
۱۰	شب خون (کہانی)	انور ندیم	۳۷
۱۱	نئی کتابوں کا تعارف (تبصرہ)	سید احمد قادری	۴۱
۱۲	شہر خیال	علی عباس عزلے ، عبدالمنان وغیرہ	۴۵

نمود

عصری موضوعات اور پائیدار ادب

ادب پارہ میں عصری میلانات و موضوعات اس بات کی پہچان ہے کہ ادب کی حرکی فلسفہ کا قائل ہے۔ اچھا ادب وہی ہوتا ہے جس میں ہم عصر رجحانات کی عکاسی ہو۔ عصری موضوع اور عصری احساس کے بغیر ادب جمود کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ عصری موضوع تو وقتی، ہنگامی اور لمحاتی ہوتا ہے یہ حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے جو حالات کل تھے وہ آج نہیں ہیں۔ کل کے مسائل ماضی میں ختم ہو کر فنا ہو گئے۔ آج تو آج کے مسائل سامنے ہیں۔ اور وقت کی تیز رفتاری، نیز نئے مسائل کی آمد کے ساتھ آج یہ ادب بھی کل پرانا ہو جائے گا۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ عصری موضوعات وقت کی محدود اکائیوں میں اسیر ہوتے ہیں۔ اور ان کی پیش کش پائیدار ادب کی علامت نہیں بن سکتی۔

بظاہر یہ منطق معقول معلوم ہوتی ہے ——— لیکن جب ہم سچے ادب کے نقوش کی تلاش کرتے ہیں تو اس بحث کے مغالطہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر ادب اپنے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ابھرتا ہے۔ اس پس منظر میں اپنا مفہوم اور اثر پیدا کرتا ہے۔ تاریخ کو سامنے رکھے بغیر ادب کا صحیح مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ شکسپیئر کے ڈرامے کا مطالعہ کرتے وقت اس کلچر، اس ثقافت، اس سیاسی صورت حال کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جس میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ علامہ اقبال کی شاعری کی صحیح تفہیم اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم دو عظیم جنگوں اور ترکی، فرانس اور روس کے انقلابات کے نتیجہ میں مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کریں۔ ہر عظیم آرٹ کا موجب سیاسی حالات ہوتے ہیں۔ اور ان حالات کو سامنے رکھ کر ہی ہم اس ادب کو APPRECIATE کر سکتے ہیں۔

تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی دستاویز پرانی تو ہو سکتی ہے مگر کبھی بیکار نہیں ہوتی۔ بلکہ تاریخ کے سفر میں پرانی دستاویز نئے وقوعوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح عصری ادب بھی اپنے عہد تک محصور نہیں رہتا۔ یہ ادب مستقبل کے ادب کے نقوش متعین کرتا ہے اور معرکے ادب کی فضا پیدا کرتا ہے۔

——— جمیل منظر سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

کالی داس گپتا رضا ـــــ ہنوز غیر مطبوعہ کلام

میری استدعا پر رضا صاحب نے اپنے غیر مطبوعہ کلام کی فوٹو اسٹیٹ بیاض جو ارسال کی ہے وہ ۲۲۵ صفحات پر محیط ہے اور اس میں ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ ورق پر دو نام لکھے ہیں۔

شب نشیں (نظمیں)

شاہد صبح (غزلیں)

نہ جانے کیوں کتاب کے نام پر نظر جاتی ہے تو دل تجزیات سے مخاطب ہونے لگتا ہے بالخصوص اے جی گارڈنر (A. G. GARDINER) کے اس انشائیہ کو پڑھنے کے بعد سے جس میں انہوں نے نام رکھنے اور عنوان دینے کو اپنے خصوصی انداز میں نہایت مشکل کام بتایا ہے۔ مثال کے طور پر اس ہفت خواں کو شیکسپیر نے بھی طے کیا ہوگا نہیں تو وہ اپنے ایک ڈرامے کا نام AS YOU LIKE IT (جیسا تم چاہو) کیوں رکھتا۔

غالباً شب نشیں سے مراد ہے محنت و کاوش کے مراحل جن سے نظم کہتے وقت رضا صاحب گذرتے ہیں۔ صنف غزل ان کو مرغوب ہے لہٰذا "شاہد صبح" کہا گیا ہے "شب نشیں" زیر تبصرہ مجموعہ کی پہلی نظم ہے جو دراصل شاعر کی بجائے اہم خود کلامی کی آئینہ دار ہے وہ جانتے ہیں کہ

غمزہ ہائے شاعرانہ تیری فطرت میں نہیں
افتخار علم و دانش سے بری تیرا مزاج
شوق گل پوشی سے بیگانہ تیرا سادہ ضمیر
خامشی، خلوت نشینی، تیری طینت کا اصول
تو ہے ناموزوں یہ تیری شب نشینی بھی فضول

خیر رضا کی طبیعت ناموزوں تو نہیں ہے مگر با ایں ہمہ وہ اپنی تمام تر کاوشوں کا جواز تلاش کرتے ہیں۔

اے رضا
اے شب نشین محفل شعر و سخن
لمحہ بھر بھی بھول سکتا ہے تو کیا

اس ادب خانے کے آداب و رموز ؟
توبہ توبہ، بزم رنگ ہلاؤ میں
یہ یقین تجھکو کہ تو چھا جائے گا ؟
سب کا دل بہلائے گا ؟
فکر و فن کی مشعلوں سے
روشنی پھیلائے گا

....

چھوڑ یہ نازِ صدارت
مسندِ فخر و مباہ
زینت قالین و تکیہ۔ لطف اوراق و قلم
ادعائے لفظ و معنی
فکر ترسیل و تراش
شوکت تعمیر مضمون
ذوق تخلیق سخن

...... ادبی ذوق و شوق کے لئے یہ سب کچھ کس لئے، کیا ضرورت ہے بالآخر اس تقدیریہ کی۔ (کچھ ادب بیگانہ حضرات "تقدیریہ سر" بھی کہتے ہیں جو یقیناً غلط ہے کیونکہ لفظ تقدیریہ کے مطلب ہی دردسر ہوتے ہیں) اگر دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو رضا صاحب یقیناً گھاٹے کے سودے میں پھنسے رہتے ہیں۔ وہ زر کثیر جو اپنی نجی لائبریری بنانے پر صرف کیا ہے اس کا رخ اپنی بزنس کی جانب بھی ہو سکتا تھا۔ اگر موخرالذکر طریقۂ عمل کو اپنایا گیا ہوتا تو اردو ادبیات کو جو سب کچھ ہمیں ملا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ فکر و فن کی مشعل روشن رکھنے کے لئے ادبیات میں چراغاں کرنے کے لئے رضا کو ادعائے لفظ و معنی فکر ترسیل و تراش تعمیر ارتقائے مضامین و موضوعات، کرب تخلیق سخن وغیرہ کے لئے "شب نشین" ہونا پڑا۔ راتوں رات مطالعہ کے جوئے بزی تحقیق کے دشوار مرحلے، شعر و سخن کے رموز پر پوری گرفت حاصل کرنے کے لئے "شب نشین" ہونا ضروری ہے۔ اشد ضروری ہے بغیر دل و دماغ کی کسرت کے زور و توانائی علم و عرفان پیدا نہیں ہو سکتی۔ غیر معمولی ذہانت، بغیر محنت، و اخراجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ "ٹامس ایلوا ایڈیسن نے پیاری بات کہی ہے،

"GENIUS IS ON PERCENT INSPIRATION AND NIN TY NINE PER-CENT PERSPIRATION"

(INTERXIEWS, LIFE 24)

غرض کہ کوئی یوں ہی غیر معمولی فراست و ذہانت کا حامل نہیں ہو جاتا۔ خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے اور رضا نے فی الواقع کیا ہے

تنا لوے فی صد استعداد لپینوں میں ڈوب کر ہی اس ایک فی صد تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے جس کو وجدان و عرفان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ؎

روئے جاناں طلبی آئینہ را قابل ساز ورنہ ہرگز گل و نسرین ندمد آہن و روئے

گوہر پاک بباید کہ شود قابل فیض ، ورنہ ہر سنگ و گلے لولو و مرجان نہ شود (حافظ)

بڑی شاعری کس کو کہتے ہیں اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہو سکتے ہیں ہماری تنقید ابھی ایسے مسائل سے مخاطب نہیں ہوئی ہے۔ لہذا ابھی تک صورت حال وہی جس کو کلیم الدین نے اپنے حامل اہمیت الفاظ میں یوں کہا تھا کہ "اردو میں تنقید کا وجود اقلیدس کا فرضی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" اس کی تصدیق نیچے پیش مثالوں سے معلوم ہوتی ہے۔

" یگانہ کا لہجہ اسے اچھا تنقید نگار بنا سکتا تھا" (شمس الرحمن فاروقی)

" یگانہ اپنی آزادروی اور بانکپن کی وجہ سے بھلایا نہیں جا سکے گا۔ غالب کے بعد یگانہ ہی جدید ذہن کے قریب آتا ہے"

" جدید شاعری پر یگانہ کے لہجے کا اثر بہت زیادہ ہے" (محمود ہاشمی)

" یگانہ صداقتوں کو اپنے باطن میں محدود کئے ہوئے تھے بیروں میں نہیں۔ یگانہ نے اپنے معاصرین کے تکلیف دہ نمونے پیش کئے جنھوں نے ان پر منفی اثر PRACTICAL CIRITI[illegible] یگانہ کی امان کے لئے ضرب بھی تھی۔ اور ان کو لگے ڈوبی"

(یگانہ سیمینار، اردو اکادمی اترپردیش خبرنامہ جنوری فروری ۸۵)

کیا درج فوق فرمودات کو تنقید کہا جا سکتا ہے۔ لہجہ، آزادروی، جدید ذہن، باطن، منفی اثر وغیرہ محض لفاظیت ہے فاروقی، نارنگ، ہاشمی صاحب وغیرہ اگر میں اس سیمینار میں ہوتا تو غالباً میرے سوالات کا جواب شکست دینے میں کامیاب ہوتے مجھے شک ہے۔ نارنگ صاحب مقرر ہیں، نقاد نہیں ہیں۔ فاروقی صاحب بزعم خود جو کچھ بھی ہوں تنقید کے سماجیاتی اور نظریاتی پس منظر سے واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ وہ اگر مناسب سمجھیں تو میری تردید میں لکھ سکتے ہیں۔ جس سے مجھے بھی راحت ہوگی آل احمد سرور اچھے پروفیسر ہیں نیک النفس انسان ہیں کچھ حد تک معیاری شاعری بھی کر سکتے ہیں۔ مگر بحیثیت تنقید نگار محض کچھ نہ

"ادب زندگی کو جمال کا ذوق اور سماج کو بصیرت دیتا ہے۔ نقاد کی اصل وابستگی فن سے ہوتی ہے۔ اور تنقید میں نقاد کا کام فن کار کے ذہنی سفر میں شریک ہوتا ہے" (ص ۳۶ خبرنامہ جنوری فروری ۸۵ء)

معیاری شاعری، جمال، ذوق، بصیرت، ذہنی سفر، وغیرہ کی تشریح و وضاحت کرنا میں جانتا ہوں ان کے بس کا روگ نہیں ہے دراصل معتقد تناظیم بیاخیالات و نکات سے عبارت نقطہ ہائے نظر کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی فن پارے کو دیکھنے ہی کہا جا سکتا ہے۔ شعری کاوش کو کیا، کیوں اور کیسے کہا ہے؟ کی تثلیث کو دیکھنا چاہئے۔ تثلیث یہاں کلیدی لفظ ہے۔ تثلیث تین اشیا یا نکات وغیرہ کے مجموعہ کو نہیں کہتے بلکہ ایک طرح سے اس وحدت کو کہیں گے جس میں یہ تین اجزائے ترکیبی ایک سانچے میں ڈھل کر اتر آئے ہوں شاعر نے کیا کہا ہے، کیوں کہا ہے یعنی محرکات و تاثرات کیا ہیں، کیسے کہا ہے یعنی انداز بیان و [illegible] کو تاریخی تناظر میں دیکھتے ہوئے ہی دادا ستقاد

دی جا سکتی ہے ۔ توانائی جذبات ، جرأت اخلاق ، تعقل پذیری وغیرہ کی موجودگی ، نیم موجودگی ، یا عدم موجودگی وغیرہ سب کو کاٹتے میں تولنا پڑے گا ۔ رضا کثیر المطالعہ ، چشم و امشاہدہ کرنے والا شاعر ہے ۔

پہلی نظم میں کیا کیوں اور کیسے کو دیکھنے کے بعد دوسری نظم "دکھی نہ ہو" دکھ انسانی حیات کے لئے ہمیشہ سے لاحق رہا ہے ۔ رضا نے بار بار گوتم بدھ اور بودھ دھرم (ملحوظ رہے ، بدھ دھرم صحیح نہیں ہے) کی جانب رجوع کیا ہے ۔ گوتم کے نظریات میں "غم بسیط" کا مخصوص تصور ہے جو رضا کی حساس طبیعت کو مرغوب رہا ہے ۔ گرد و پیش میں "دکھ" ہے "دکھ" قنوطیت کی حدود تک پہنچا سکتا ہے ۔ عرفان و علم کے دروازے بھی وا کر سکتا ہے ۔ اس بات کو فراق نے اپنے مخصوص انداز میں یوں کہا ہے ؎

فراق اس دکھ بھری دنیا کو تو نے جانے کیا سمجھا ✦ اگر یوں دیکھتی آنکھیں در فردوس بھی وا ہیں

فراق کا جو ذکر آگیا ہے تو ایک بات یاد آنے لگی ۔ آج کل ایک نام نہاد ، بزعم خود نقاد ہیں ۔ ڈاکٹر مفتی صاحب ، ان کا انداز گفتگو بغایت تحکمانہ وغیرہ عالمانہ ہوتا ہے ۔ اردو ادب کے فراق ، فراق نمبر میں ان کا مضمون بھی شامل ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ، مشیت تو فراق کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع شئے ہے (حافظے پر تکیہ کرتے ہوئے لکھ رہا ہوں ، اردو ادب سے رجوع کرنے میں طوالت کا احساس ہوتا ہے ، نمبر ہذا میں میرا مضمون بھی شامل ہے اور نمبر کے لئے تبصرہ لکھنے کو خلیق انجم صاحب مجھ ہی سے استفسار کی تھی ۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اس پر میرا لکھا ہوا بالوجوہ حذف کر دیا ۔ میں نے لکھا تھا کہ "فراق کا تصور مشیت داڑھی والے یا تلک دھاری کا تصور نہیں ہے ، بلکہ فلسفیانہ ہے ۔ تاریخ مذہبیات سے بھی عبارت ہے ۔ بطور مثال فراق کا یہ شعر پیش کیا تھا ؎

خدا کو اہل جہاں جب بنا چکے تو فراق ✦ پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

اس خصوصی نمبر میں بھی آزاد صاحب کا مضمون بھی معیاری نہیں ہے ، اقبال زدگی و اقبال گزیدگی کی بدترین مثال ہے ، یہ بھی قابل حذف سمجھا گیا اور خلیق صاحب نے کاٹ دیا ہوگا ۔ یہ دخل در معقولات سمجھ لیجئے ، ورنہ بیچ میں آئی ان باتوں کا ذکر یوں ناگزیر ہو گیا کیونکہ باوجود لاف وگزاف اردو حلقے ابھی تحقیق و انتقاد سے کم آشنا ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ دو چار اصحاب "محراب و منبر" نے مملکت اردو پر ہنگامی قانون نافذ کر رکھا ہے ۔ آپ ان کی رائے سے ہٹ کر کچھ نہیں کہہ سکتے ، بالخصوص "ہماری زبان" کے کالموں میں آپ کی بات کو جگہ نہیں ملے گی ۔ خیر ، ذکر ہو رہا تھا "غم بسیط" کا ، جو رضا کے پردۂ دل پر احتجاجاً دماغ پر چھا گیا ہے ۔ ان کی ہمدردی لفظی نہیں ہے ۔ وہ دکھ درد میں حصہ لینے والے ہیں ۔ وہ فلسفۂ عمل (Tamam am) بطور ادائیگی فرض پر گامزن ہیں ۔ اس پس منظر میں قنوطیت کو جگہ ہی کب مل سکتی ہے ۔ دکھی ہونے کی ایسی بات کیا ہے

مجھے بھگوان کی سوگند دے لو
مجھے انسان کی سوگند دے لو
پہاڑوں کو ، بنوں کو ، وادیوں کو
میں دوں گا خوشی کی مست جھنکار

سروں سے گونج اٹھا یہ سنسار

دکھی نہ ہو — دکھی ہونے کی ایسی بات کیا ہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میں جھانکوں گا روشن کھڑکیوں سے
مری ہر سبول بن جائے گی امرت
وہ امرت جس میں بوندیں پریم کی ہیں
میں تجھ کو بھی یہی اک بوند دوں گا
جسے پی کر امر ہو جائے گا تو
اجر آنند میں کھو جائے گا تو

آگے چلنے سے پہلے، اجر آنند (अजरानन्द) کی ترکیب قابل لحاظ و توجہ ہے۔ اجر (अजर) یعنی جو چیز نہ ہو سکے یعنی شکست و ریخت سے محفوظ و البانہ مسرت، محفوظ رہے (आनन्द) آنند کا مفہوم والہانہ مسرت سے منزلوں بالاتر ہے۔ اردو کو ایسی ترکیب سے آشنا کرنا بہت بڑا کام ہے۔ اور اردو کی وسیع آغوش بے تعصبانہ ذہنیت اش ... ترکیب کو جگہ دے سکتی ہے۔ اور دیکھئے ؎

بڑھے چلو، بڑھے چلو

یہ ہل چلیں نشان ہیں
حصول کے کمال کا
تلاش ہی مقام ہے
فشار دل ہی ہے خدا
جو چل پڑا، وہ ست جگی
جو رک گیا، سو کل جگی
وہ شب گئی، سویرا اگی

بڑھے چلو، بڑھے چلو

تراکیب تراشنے میں بلبیر رہنا خصوصیت سے اہمیت کی حامل ہے۔ ذیل میں "مخول و خرد" ملاحظہ ہو۔

اپنے مخول و خرد کی کرنوں کو
نیلے امبر سے دور ہی رکھو
ہم کو تو یہ ہوا بتاب ہنسے
زندگی تو ابلتا چشمہ ہے
اور تم اس کا کیا ہو؟ بیش از بیش
پانچ فی صد

ذرا خیال کرو۔
جاؤ مرکز کو اپنے کوچ کرو (پانچ فی صد)

ترکیب ہی قابلِ قبول نہیں ہے، بلکہ نظم ہذا کا فلسفیانہ تناظر بھی غائر توجہ کا موجب ہے۔ نیلے امبر یعنی عمق در عمق ذہنی و روحانی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنے "جسم و ذہن" یعنی "جسم و عقل" کو میسر شعاع روحانیت کو کہ فوق اللسان روحانیت جس کو صرف [illegible] یعنی "وہ" ہی کہا جاسکتا ہے۔ دور رکھو۔ اس پر سہانند یعنی بیضہ ایزدی کا تم عشرِ عشیر بھی نہیں ہو، لیکن اس جانب کوچ کر سکتے ہو۔ ویدانت کے مطابق ہر انسان رہرو راہِ ایزدی ہوتا ہے۔ اور ہر راستہ منزلِ مقصود ہی کو جاتا ہے ایسی گیتا میں بھی کہا گیا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کو سنیاس (संन्यास) کہتے ہیں۔ ملحوظ رہے سنسکرت میں لفظ یاس (न्यास) کا مفہوم ہوتا ہے منزل و منہاج اور لفظ (सम) و (सं) سم کا مطلب ہوتا ہے متوازن و مستقیم۔ بالفاظ دیگر سنیاس ایک یوگ (योग) یعنی طریق و مسلک نیز کاوش تجمع کو کہتے ہیں۔ سنیاسی بھکاری کو نہیں کہتے سنیاسی راہب کو بھی نہیں کہتے، جیسا کہ بالخصوص غالی اقبالی اور جماعت اسلامی کے پیروکاروں نے کذب گوئی کہئے یا نافہمی سے غلط خیال کو ہوا دے رکھی ہے۔ بان پرستھ آشرم، یعنی زندگی کا چوتھا چرٹ [illegible] (ملحوظ رہے، میں [illegible] کو ن سے نہ لکھ کر ن میں ط مدغم کر کے یعنی ڑ لکھتا ہوں) یعنی میں بھی وہ آتم سنمکھ (आत्म सम्मुख) یعنی مخاطب بہ روح ہو کر دنیا کے فلاح و بہبود کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر لیتا ہے۔ "نیلے امبر" کا پیکر معنوی نہایت وسیع و کشادہ ہے۔ جس کو سمجھنے کے لئے کشادہ ذہنی و وسعتِ قلبی درکار ہے۔ غیر ویدک دہرکی جن کو عرفِ عام میں ہندو کہا جاتا ہے۔ وہ بھی یہ سب کچھ نہیں جانتے "آخری لمحے" نظم میں جس کو رضا نے "شانتی اوم شانتی اوم" کہا ہے۔ وہ بھی اسی معنویت و رمزیت پر محیط حقیقت (सत्य) ہے۔ لفظ [illegible] حقیقت سے زیادہ معنوی پہنائیوں کا حامل ہے، مگر یہ سب کچھ بتانا غالباً بے محل ہوگا۔ نظم "رقص" بھی فلسفیانہ ہے اور معروف استعاراتی و اساطیری انداز میں پیش ہوئی ہے یہ رقص گیتی ہے، نشو و نما عالم کا مظہر نامہ، جو موسیقی میں تانڈو نرت (ताण्डव नृत्य) ہے۔ در اصل نظم "رقص" میں اسی کی صوتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ [illegible] ..... یہ ہے شلوک شو پران (शिव पुराण) کا۔ شیو سے مراد فعال توانائی اور جس طرح وہ توانائی موجب تخلیق گیتی ہوئی اس کو فنکارانہ تحرک جسدی میں پیش کرنا ہی تانڈو نرت ہے۔ رضا کی یہ نظم قابلِ صد لحاظ تخلیق ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے وسیع مطالعاتی پس منظر کی ضرورت ہے، رونا یہی ہے کہ دریچہ بند ذہنیت" اردو اردو" کے نعرے تو لگاتی ہے، مگر ایسی شاندار تخلیق کو سینے سے نہیں لگاتی۔ یہ وہ رقص تھا جس سے

دیکھنے والے سبھی۔ جیسے یقین آیا نہ ہو
ہکے بکے سے ادھر تکنے لگے
اور کچھ سوچ کے پھر بول اٹھے
اے بشر! اسے ازلی مست رعونت، رقاص!

بس اسی روز سے تفہیم بشر ختم ہوئی
اب یہاں اور نہیں کوئی خداؤں کے سوا۔

اور۔ ویدک فلسفے میں آدمی بھی خدا ہے۔ ایک دلچسپ لسانی حقیقت، سنسکرت اور فارسی دونوں ایک لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہزارہا الفاظ دونوں میں کچھ ردوبدل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مثلاً آپ، سنسکرت میں آپی ری معروف نہیں، اپ بہ زبر سمجھئے) خدا لفظ بنا ہے سنسکرت کے स्वत: سوتہ سے स्व فارسی میں خ اور آخر کات (آم) د (ج) میں بدل جاتی ہے۔ رضا نے بڑا اچھا ژرف بینی پر محیط لفظ استعمال کیا ہے۔ فی الواقع، اسی ایک نظم پر پوری کتاب ہی لکھی جاسکتی ہے۔ کاروبار پر توجہات مرکوز کرنے کے ساتھ مطالعہ کی یہ وسعت تعجب کا موجب ہے۔

"تفہیم بشر" یعنی "تو خدا ہے تو خدا ہم بھی ہیں" یہ ایک ایسا فلسفیانہ نکتہ ہے جس کو وحیانہ طرز و ادا پر استوار دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ تعجب ہے کہ رضا نے اتنا فلسفہ کیسے پڑھ ڈالا "تلاش حق" نامی نظم میں تفہیم کی تشریح بھی ہے
ہر طرف حق ہی حق، بولنا، سننا، سمجھنا دغیر حق ہی ہے۔

اور اس جہان کے لوگ تفہیم بشر سے دور، گمرہی کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سوائے "لوح قبر" ان کا "کارنامہ" بے اہمیت ہو جاتے ہیں۔ اس مجموعے کی آخری نظم "اندھیرا" ہے۔ اندھیرے چھٹ جائیں اگر ہم اصولوں کی شعاعوں کو اندھیرے کے جگر میں پیوست کرنا سیکھ لیں۔ بڑی اچھی Analogical poem تمثیلی نظم ہے۔
رضا کی ہر نظم میں لحن و فکر کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔
صفحہ ۱۹ سے غزلیات کا حصہ شروع ہوتا ہے۔

غزل گوئی آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ دو مصرعوں میں پورے موضوع کو سمولینا اور اگر فنکار اتنا استعداد ہو تو خیال کی صوتی تصویر سے متعلقات کے پس منظر کو بھی پیش منظر میں لے آنا ممکن الوجود ہو جاتا ہے۔ غزل پر ریزہ خیالی کا الزام بھی لگایا جاتا ہے، یعنی ایک شعر میں زمین کا ذکر تو دوسرے میں آسمان کا، تیسرے میں درمیان کا سلسلہ در سلسلہ اذکار کو لوگ ریزہ خیالی سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر فلسفہ اور نفسیات جیسی تنظیم پر محیط دل و دماغ Stream of Thought (رو د خیال) جس کو بعد میں Stream of Consciousness (سیل شعور) بھی کہا جانے لگا، سے واقف ہونے کی بنا پر ریزہ خیالی کے ضمیر میں جھانکنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ جذبے کی لو دیتا ہوا خیال، ایسا خیال جو سماجیاتی پس منظر بھی رکھتا ہو۔ بڑے شاعر ہی کے یہاں ملتا ہے۔ رضا صاحب کی بیشتر غزلیات کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ پہلی غزل میں قطعاً ریزہ خیالی نہیں ہے۔ مرکزی خیال مشیت ہے۔ وہ مشیت جس سے شاعر دوچار ہے، نبرد آزما ہے اور وہ جس پر استفہامیہ بھی لگاتا ہے۔ کون ہے فکر و نظر دینے والا، کیا ہاتھ کی لکیریں، لوح قسمت ہیں، مرگ و زیست کیا ہیں، کون ہنساتا ہے اور کون رلاتا ہے وغیرہم۔ پوری غزل ایک مرکزی الہام تصور سے منزل ہوئی ہے یہ کیفیت صرف پہلی غزل ہی کی نہیں بلکہ متعدد غزلیات کی ہے۔ ملاحظہ ہوں تین غزلوں کے چند ایک اشعار:

جہاں کو کبھی ڈگر پر لگا گیا کوئی — چلا گیا کوئی منزل سے آگیا کوئی

کہاں کا ہاتھ، کہاں کا نجوم کیسا نصیب ۔ لکیریں کھینچ کے بے بس بنا گیا کوئی
میں خشک آنکھ کی دولت ہوں کل کا آنسو ہوں ۔ ڈھے مکان میں مجھ کو بٹھا گیا کوئی

رضا بدلتے تقاضوں کا ساتھ کیوں چھوڑے
ہنسا گیا اسے کوئی، رلا گیا کوئی

واہ وا۔ کل کا آنسو بڑی اچھی تنظیم الفاظ ہے معنویت سے بھرپور، سماجیات کے حقائق میں شرابور، پوری غزل ایک لحن سے معمور ہے، فلسفیانہ لحن سے جس کو استفہامیہ لہجہ میں ادا کیا گیا ہے۔ اور دیکھئے ؎

اندھیری شب میں بھی میں کب رہا اندھیرے میں ۔ مجھے چراغ تو لو دے اٹھیں کئی یادیں
ہمارا حکم ہے، ہم سے جدا نہ ہو کوئی ۔ ہزار ہلنے لگی ہیں ہماری بنیادیں
ٹھٹھرتی رات بھی ہے، کوئی دیکھتا بھی نہیں ۔ الاؤ جلتا ہے، مٹھی بھر آگ ہی لے لیں

تیسرے شعر کا پس منظر بڑا انقلاب آفریں ہے۔ پوری غزل، پہلی غزل کی طرح یک لحنی و[illegible] ہے ؎

شب وہی، وہی انجم، کس کو جشن نو کہہ دوں ۔ سست گام جلوسے کو کیسے تیز رو کہہ دوں

معمولی شاعر جلوسے کو سست گام یا تیز رو کبھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ غزل بھی بڑی کامیاب غزل ہے اور فکریاتی غزل ہے۔ جذباتی صوتیات میں ڈوبی ہوئی۔

ایک ایک غزل کو لے کر مرکزی خیال کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ غزل غزل بھی رہتی ہے اور عنوان کے بغیر ایک نظم بھی۔ اگر ان تمام غزلوں میں سے اپنی پسند کے اشعار پیش کر کے رضا کے نظام فکر و فنکاری پر اپنے خیالات اظہار کروں تو غالباً بہتر ہوگا ؎

چلے بھی آؤ کہ لو دے اٹھیں در و دیوار ۔ اندھیرے اپنی گھنی کاکلیں سنوار چکے

٭ ٭ ٭

یہ بجز مردگی کیا، یہ جوشش نمو کیا ۔ خزاؤں سے پوچھیں بہاروں سے پوچھیں

٭ ٭ ٭

چمک رہی ہے حیات آنسوؤں کے پرتو سے ۔ کسے خبر ہے؟ فلک کہاں ہے، چاند تارے کون
نیا زمانہ سنگھاسن پہ آ براجا ہے ۔ سماج سوچ رہا ہے، آرتی اتارے کون
(آرتی اتارنا، عزت سے استقبال کرنا)
رضا شعور کے سورج کا کچھ پتا ہی نہیں ۔ دھندلکا جہاں کا ہر سمت ہے، نکھارے کون

٭ ٭ ٭

نئے یگ کی تھی بشارت کہ کہانی؟ کیا تھا ۔ شاید صبح کا پیغام زبانی کیا تھا
وہ جو لاوا سا بہا اور مجھے پھونک گیا ۔ آگ تھی اشکوں کی یا شعلوں کا پانی کیا تھا
لڑکھڑاتے سے قدم، پیاسی نظر، جھومتا جسم ۔ یہ سب اک وہم تھا یہ رقص جوانی کیا تھا؟

بجھے بجھے حروف کو ملے کہاں سے روشنی — معنی کے نور کو نصاب میں نہ ڈھونڈ تا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

شبانہ روز کام ہی کا ورثہ ہے — کمال کو عذاب یا ثواب میں نہ ڈھونڈتا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اڑتا بکھرتا غبار ہر سو — یہ دشت رواں کبھی چمن تھا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

وقت سے پیچ لڑا ہے تو لڑائے رکھنا — لاکھ طوفان ہوں اشکوں کو دبائے رکھنا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

کی باتیں ہونٹوں پہ لانا ہرگز — رات سو گئی صبح ہو لی دہرانا کیا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ان کہی باتیں لاکھوں ہیں شور مچا کر کیوں کہنا — ڈھب سے کان میں کہہ سن لو، بے ڈھب بات بڑھانا کیوں

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

زہر بھی تم دے دیکھو، امرت سمجھیں گے ہم — ہم نے مسیحا اپنا تم کو مان لیا
لاکھ ہوں بانکی ٹیڑھی راہیں، اب ہم نے — خود کو مسافر، تم کو منزل مان لیا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

عدل قاتل، منصفی خنجر بکف — ملزم ہستی بیاں دینے لگا
لذت عصیاں کہ بج اٹھے ہیں سنکھ — اور مؤذن بھی اذاں دینے لگا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

کوئی کہہ بیٹھا حدیثِ زندگی — ایک دیا بجھ کر دھواں دینے لگا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ہم کہاں ہوتے ہیں تادیب عمل سے آزاد — دہر بھی چھوڑا، غم طوفِ حرم بھی نہ کیا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

فکر معلیٰ، رخت دوامی — انکار مبہم، لطف خورد خواب

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

زندگی تو ہمیشہ سے جلدی میں ہے — پربتوں سے اترتی ندی کی طرح

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

آئینے میں بال پڑ گیا کیوں — پھیلا تھا بدن سکڑ گیا کیوں

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اتر جائے گا محل میں چتر شاہی — میں گونگے وقت کی گز بھر زباں ہوں
اجالوں نے مجھے دھندلا دیا ہے — میں اب بجھتے چراغوں کا دھواں ہوں

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مرا بچپن، مری خوشیاں مرے خواب — دھواں سی کچھ لکیریں روشنی میں

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جہانِ زندہ کی قدروں کو استوار کرو — خزاں زدوں کو رضاؔ واقفِ بہار کرو
رضاؔ شگفتگیٔ زیست ہی میں سب کچھ ہے — شگفتہ بات کرو اور بار بار کرو

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دوڑ کر دار تک گیا کوئی — کیا جینے سے تھک گیا کوئی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اسی اندھیرے سے نکلے تو جگمگاہٹ بھی — ملال دے کے چکے اب ایک مسکراہٹ بھی
مجھی کو لے کے مکمل ہوئی شبیہ حیات — اخیر نقش تو ہوں، نقش اولیں نہ سہی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

شمع محفل کے ساتھ بجھ جاؤں — اے شبِ ہجر، کیا سحر ہوگی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

شانتی پر اگر من ٹھہرا — نام کئی رکھے بھگوان کے
اندر سے دو ٹکڑے ہو کر — آؤ بھر لیں سوانگ ملن کے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ننھی ننھی میری جنت — میرا ہر قدم ٹیلے ٹیلے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

میری تکمیلِ تمنا کی نہ پوچھ — کام رکھا ہوا کل پر جیسے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آرام اب ہمہ تہمت آرام — دکھ جزوِ حیات بن گیا

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

شیشہ سول لئے گھومے، کوئی پتھر نہ گرا — تجھ کو ارزانیٔ غم، آج گراں دیکھا ہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہنستے بولتے رہے یوں تو گھٹن ہوتی ہے — دل تڑپنے سے بہلتا ہو تمنا یہ ہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جہاں ملے مجھے روٹی، اسے لکھوں دھرتی
میں پہلے لکھوں تجھے امن کا پیامی پھر
جہاں پہنچ نہ سکوں آنکھ کو آسماں لکھ دوں
ہوئیں جو نام پہ تیرے لڑائیاں لکھ دوں

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

جب گلے سے مرے زنار پکڑ کر کھینچا
ساتھ لپٹی ہوئی سو رمزیں وضو کی نکلیں

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

گناہ، شوق، تمنا، فشار، مجبوری
یہ جھوٹے جھوٹے فسانے ہیں اے بڑے لوگو

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

دیوتا دس کروڑ بھی کم ہیں
تو رضا فلسفی بھی، شاعر بھی
اپنا مانگیں بھی تو ہیں بیس ارب
تیرے جتنے غلام اتنے رب

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

میں ہوں وہ جس نے ترے بکھرے ہوئے سجدوں کو
سلسلہ وار کئی ناموں سے ترتیب دیا

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

موند کر آنکھ اور سو رہیے
قربتیں تو یہاں بھی ڈھونڈے گا
جلتے ہم جو آپ تھپکیں گے
فاصلے بھی اُدھر ہی ہیں کیں گے

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

لہروں لہروں بول رہا ہوں
ایک دیا سا ڈول رہا ہوں

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

میں تر و تازہ، کفِ شوق پہ آسودہ ہوں
کچھ توقع تو بہرحال ہمیں تم سے ہے
وہ گرا اشک، میں ہوں کہ اٹھا بھی نہ سکوں
یہ بھلا کیا سامنے ڈوبیں تو بچا بھی نہ سکو

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

چینا رہنما ان کو، یہ کیا کیا
یہاں سے کہاں نقش پا لے گئے

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اک نظر دیکھ، دوستوں کی طرح
کبھی آ گرتی ہیں تمنائیں
کھل اٹھوں گا ترے لبوں کی طرح
بھوکے دامن میں روٹیوں کی طرح

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اک جینے کا چسکا ہے، نہ دکھ ہے نہ درد ہے
تو کلکِ رضا! کون سی تانوں میں مگن تھا
تو جیت لیا سب کو مگر جیت میں کیا ہے
جب شہد ٹپک کر ترے نغموں میں گھلا ہے

پل دو پل کیا چیز ہے، دنیا زمانہ سب ہمیں — اپنی ہستی سب ہمیں، تیرا افسانہ سب ہمیں
زحمت یک گام ہی پر ناز کو گر تاب کیا! — رہنما، منزل، مسافت، دام دانہ، لیلیٰ ہمیں

میں تجھکو کیا خواب دے سکوں گا میں خود ہوں اب تک ادھورا سپنا
مجھے بھی تجھکو خبر نہیں ہے، تیری ہی آنکھوں میں پل رہا ہوں
مل کر ہی اب حال لکھے گا شاید — خطا ہیں تو وہ خود کہ خدا لکھتا ہے

ہم رہ روان شرق کو دیوار سنگ کیا۔ — ضرب نظر سے راہ بنائی، گذر گئے۔

کیسے دیتا نہیں ہے مہلت زمانہ — دم بدم پوچھتا ہے، کب، کہاں، کیوں؟

وقت نے کچھ نہیں کہا ہے ابھی، — ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے ابھی
کھوج معنی کی تھی، کہاں سے ملے — لفظ روتا ہوا گیا ہے ابھی!

ہم نے کس جگ میں نہ کی صبر و رضا کی تلقین — بیڑیاں بیت گئیں حرص و ہوس باقی ہے

ہم وہ دریا ہیں جو چٹان سے ٹکرا کے — ڈھونڈ لیتے ہیں نئی راہ، پلٹ جاتے ہیں!

پل پل کی جو دستک ہے در دل پہ اسی نے — لفظوں کو رواں فکر کو بیدار کیا ہے،
ذہنوں نے اڑا دی ہے تمیز ارض و فلک کی — ملنا پر پرواز کا دشوار کیا ہے!

غم نے ہستی کو جو بھی موڑ دئے — ہم نے بے خوف تم سے جوڑ دئے

لکھ چکا ہوں میں بھی خواب، روایت، حسرت — اب دم نو ہے، کوئی باب نیا بھی لکھوں

یہ ہیں وہ اشعار جو مجھے تلاش و جستجو کے بغیر بادی النظر ہی میں پسند آئے۔ جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے کہ فن شعر گوئی پر رضا نے بغایت توجہ صرف کی ہے۔ اور یہ وہ توجہ ہے جو کسی تنظیم جیسے فلسفہ، بشریات، نفسیات، عمرانیات، مذہبیات وغیرہ پر اتنی ہی مرتکزات رکھتا ہے جتنی ادعائیت و شعوریات پر

بلاخوف و تردید یہ دعویٰ پیش کیا جا سکتا ہے کہ رضا کی غزلیات میں ریزہ خیالی نہیں ملتی۔ قارئین ہر ایک غزل میں ایک مرکزی خیال پائیں گے۔ اور اس مرکزی خیال کا سرچشمہ دوسرے جذبات کو روانی دے کر غزل کے دیگر اشعار میں سموتا چلا جاتا ہے، انسانیت کے ہمدرد، عہد نو بہ نو کے پیامبر، رموز و غوامض و شعری و فنی کے ماہر رضا نے بڑی محنت اور کاوش سے الہام شعری حاصل کیا ہے ؎ ستارۂ درخشید و ماہ مجلس شد

غیر مطبوعہ کلام رضا..... ضمیمہ

فرستادہ بیاض میں ۱۹۸۴ء تک کا کلام اور وہ بھی مارچ ۱۹۸۴ء تک کا کلام منقول ہوا ہے۔ لہٰذا یہ خیال دل میں سر اٹھانے لگا کہ اس کے بعد جو کچھ کہا گیا ہے اس کی فرمائش بھی کرنا چاہئے کاوش میں کبھی ہی میں ہوتا تا کہ اپنے آپ ہی کھنگالنا شروع کر دیتا۔ متعدد بار لکھنے پر صرف ۱۰ صفحات پر محیط کلام اور ہاتھ آ گیا پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

بڑھے مزید فاصلے دراز کم نہیں ہوئی
ہمیں کو صبر آ گیا شکست غم نہیں ہوئی

بغور دیکھنے پر دماغ خود بخود پس منظر کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے۔ نشست الفاظ، طرز انداز بیان وہ بھی بتانے لگتے ہیں جو شعر میں نہیں دیا گیا ہے۔ مگر بطور متعلقات ذہنی و قلبی شعر کے خمیر میں شامل ہے دراڑ کو کم کرنے کی کوشش یعنی معمولی تفریق کو دور کرنے کی بھرپور جدوجہد کے باوجود فاصلے بڑھتے گئے۔ قربتوں کے افق دور ہوتے گئے فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ بالآخر صبر ہی کیا جا سکتا تھا، یہاں "صبر" کو بہ معنی بھرپور بے چارگی کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔ کوہ غم پار نہیں کیا جا سکا۔ آج کل کتنے شاعر ہیں جو اس شان و معنویت کے شعر کہہ سکتے ہیں چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

مری پکار کا اثر لب شرر یہ ہو تو کس طرح　　فلک پگھل نہیں گیا، زمیں نم نہیں ہوئی
یہ وقت وقت پر فقط کہی گئی سنی گئی　　یہ داستان پیار کی کبھی رقم نہیں ہوئی
وہ شاخ آرزو کی تھی تمام وار سہہ گئی　　سمٹ گئی، سکڑ گئی، مگر قلم نہیں ہوئی

ہر شعر نکھرے تغزل کا حامل ہے اور ایک بات قابل توجہ ہے یہ غزل مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن پر کہی گئی ہے جو ایسی بحر ہے جس میں شکست ناروا کا سقم پیدا ہو سکتا تھا مگر رضا محتاط شاعر ہے اور غزل کے کسی شعر میں بھی یہ عیب نہیں پایا جاتا۔ شکست ناروا ویسے کوئی خاص عیب نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی معقولی جکڑ بندی کے تحت ہی آتا ہے۔ مگر اس سے قدرے محتاط رہنا احسن ہی ہے۔

معنویت و متعلقات ذہنی و قلبی کا معنویت میں شامل ہو جانا، خیالات کا جذبات میں متناسخ ہو جانا وغیرہ خصوصیات سے بھرپور درج ذیل اشعار کو کون قابل داد نہیں سمجھے گا۔

اٹھئے، بھنور سے بچنے کا منظر تو دیکھئے　　کتنے جہاز درد کے ساحل پہ آئے ہیں
اشکوں کی تہہ میں چین سے ہیں غم کے سلسلے　　یہ سو جزیرے چاند کے منزل پہ آئے ہیں
تنہائیوں کو کیسے میں ملزم قرار دوں؟　　الزام تو وہی ہیں جو ساحل پہ آئے ہیں

جانے ہم کون جنگل سے گذرتے تھے کل ! / جھنڈ کے جھنڈ پھیلے تھے سائے نہ تھے
کچھ دیئے روشنی دے گئے راہ تک / جانے کیوں دوستوں نے جلائے نہ تھے
اے رضا غم ہی قندیل بنتا گیا / زندگی نے دیئے تو جلائے نہ تھے

کوئی دریا تو ہو رضا کا سا / بہتا بہتا سا، ٹھہرا ٹھہرا سا
رنگ نا معتبر ہے موج بہ موج / ہر سمندر ہے ایک جزیرا سا
ضبط نے گڑھ لئے اصول نئے / درد ورنہ وہی ہے پہلا سا
فکر نو کا نزول کیا کہئے / رات ڈھلتی سی، دن نکلتا سا

وادی وادی چوٹی چوٹی گھوم آیا / سیدھے رستے ٹھوکر کھانے والا میں
آگ کو دامن سے بھڑکانے والے تم / اڑتے دھوئیں سے رنگ اڑانے والا میں

گو ہے پینے کی دھوم دھام بہت / پیاس پھر بھی ہے نا تمام بہت
میں اکیلا ہوں کتنے جیالے ہیں / جرم کم کم ہے انتقام بہت

بیکراؤں خلاؤں کی حد بھی باندھ دی تھی / جب زمیں بنائی تھی، آسماں بنائے تھے
ہم دھوئیں سے گھبرا کر گھر سے کیا نکل جاتے / کھڑکیوں کے باہر بھی بدلیوں کے سائے تھے

سود کیا، کیا زیاں، جو ہوا سو ہوا / غضب دل، غضب جاں جو ہوا سو ہوا
اے رضا اصل سے خود ہم امر ہو گئے / حرف دل جاوداں، جو ہوا سو ہوا

آنا جانا تو اک بہانا تھا / ہم کو راہوں میں ڈوب جانا تھا
بیتے لمحوں میں ڈھل چکا تھا وقت / اور غموں کا وہی فسانا تھا
تازہ تحریر تھی مگر ہر حرف / کل کا لکھا ہوا فسانا تھا

میں تو ہم سفر ہوں وجود تک : مرے جی کو اپنا ہی حق سمجھ
مگر اے سفینۂ جذب دل، ترا نا خدا کوئی اور ہے
میں چلا تو ہوں تیری بزم کو مگر اجنبی سی ہیں راہیں،

کوئی کہہ رہا تھا قدم قدم کہ یہ راستہ کوئی اور ہے
وہ شیام رنگ بجا کہا، مگر اس کا دل تو ہے مرمریں
یہ دھواں دھواں وہ رضا نہیں یہ جگر جلا کوئی اور ہے

ذہن مثبت نے کچھ آرام نہ پایا ہوگا ۔ در کھلا تھا کوئی مہمان تو آیا ہوگا
کوئی چھپر، کوئی کھڑکی، کوئی دیوار نہیں یہ نگر بادِ مخالف نے بسایا ہوگا
لاکھ جی چاہے گا دستک پہ یقیں مت کرنا گھر وہی آیا ہوگا جو خواب میں آیا ہوگا

زمانہ تنگ ظرف ہوگیا تو کیا ضمیر برف برف ہوگیا تو کیا

معنویت کا اثر ہے کہ گھٹا جھومے ہے ایک بارش ہی ورق پر ہے قلم جھومے ہے
مست آنکھوں سے پرے بھی ہے کوئی جام سرور بس میخانہ بھی میخانہ ہے دل جھومے ہے

فہم و فکر کی دھرتی، آسماں نہیں بنتی، میں نے بو کے دیکھے ہیں اس میں چاند تاروں تک
یہ جریدۂ ہستی، ہر زمانہ نکلے گا ہر فسانہ پھیلے گا، آخری شمارے تک

صدرشکر کہ جانتا نہیں میں جس بات کا گیان دے رہا ہوں

بہار آئی گلوں کو ہنسی نہیں آئی کہیں سے بو تیری گفتار کی نہیں آئی
یہ کائنات سب آغوشِ نیم شب میں ہے زمانہ ہوگیا، آواز بھی نہیں آئی
نہ جانے کیسی گھڑی سے گذر رہے تھے ہم کہ جاگتے نہ رہے نیند بھی نہیں آئی

جب شہیدوں نے دار مانگی تھی زلیت بھی بار بار مانگی تھی
تم خزاں دے گئے خزاں ہی سہی ویسے ہم نے بہار مانگی تھی

چھما چھم تیری آہٹ آئی جیسے ہوا دامن میں جل بھر لائی جیسے
وہ مدہوشی وہ آنچل کا سرکنا زمانہ نے جو کا انگڑائی جیسے،

دوست کہا تو ٹل مت جانا ! سن کہ میرا حال بدل مت جانا
کانچ نہیں، چاندی ہو، سونا ہو تم، پاس چتا جلتی ہے پگھل مت جانا

آسماں سے مجھے گھر دیدے دینا خاک ہو جاؤں تو پر دے دینا
سامنا آج 'انا' سے ہوگا ! بات رکھی ہے تو سر دے دینا

محولہ بالا اشعار بادی النظری میں ہاتھ آگئے، رضا کو بات رکھنا زیادہ عزیز ہے جس کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتے ہیں۔ انا یعنی "اہم بھاؤ" یعنی "اہنکار" سے ٹکر لینے کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ رضا ان پست ہمت شاعروں میں شامل نہیں کئے جا سکتے جو اقبال کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے "انا" یا "خودی" کو قابل احترام سمجھیں۔ رضا جس پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں اس کی رو سے "انا" قابل ترک ہے انا تو اہنکار اہنکار ہی سمجھا جا سکتا ہے आत्म अभिमान آتم ابھیمان اور بات ہے۔ موخر الذکر ہندو اصطلاح میں ادائیگی فرض میں فرازداری تک جرأت شامل ہے "رضا من ہستم" پر ایمان نہیں رکھتے۔ انا الحق پر دل و جان نچھاور کرتے ہیں ان کا یہ خیال بغیر کچھ کہے ہی اقبالیاتی دروبست فکر کو سامنے لاکھڑا کرتا ہے اور اس کا سد باب بھی کر ڈالتا ہے۔ رضا کے انانیت کے پرستار ہیں۔ انانیت کے نہیں۔ ان کی شعری و فکری صلاحیت ویدک دھرم یعنی ایمان علم و عرفان سے عبارت ہے ان کے اشعار دراصل فکری تلمیحات ہوتے ہیں۔ جو معمولی خصوصیت نہیں ہے سه

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

رضا اس شرط اول سے آشنا شاعر و مفکر ہیں ●

بقیہ :- کہانی الاسٹر

سردی شباب پر ہے ابھی ایک صاحب جو بہت سے شکستہ الاسٹر پہنے ہوئے ہیں اور ان کا نیچے سے اسٹر ادھڑ کر ہلالی شکل میں زمین کو صاف کرتا جا رہا ہے کو دیکھ کر میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ سنڈے بازار سے ایک حسب توفیق اوور کوٹ خرید لاؤں گا۔ میرا اتنا قابو ہی کہاں ہے کہ دہلی جیسے شہر میں ہزار روپے کی تنخواہ میں ایک عدد بیوی اور دو عدد بچوں کے علاوہ والدین کے اخراجات بھی پورے کر سکوں اور کوئی گرم سوٹ بھی بنوا سکوں۔

سلمیٰ عباس عزیز

زبان کیا ہے !

غالب کا یہ خیال کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا جتنا بھی صحیح ہو، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کے ارتقا میں اس حیوان نے اپنے آپ کو باقی تمام جان داروں سے اس طرح الگ کر لیا ہے کہ اب آدمی کو حیوان کہنا مشکل نظر آتا ہے اور جن خصوصیات کی وجہ سے یہ فاصلہ بڑھتا ہی چلا گیا، وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہیں۔ مثلاً آدمی اپنا کھانا آگ پر پکانے لگا جب کہ دنیا کا کوئی جانور اس زحمت کو اٹھانے کے لئے اب تک تیار نہیں ہے۔ یا زنا بالجبر کو لیجئے۔ اس دھرتی پر حیوانوں کی کوئی دس لاکھ اقسام ہیں۔ ان میں اتنے چھوٹے جان دار بھی ہیں جو آدمی کو نظر نہیں آتے۔ اور اتنے بڑے بھی ہیں جن کے سامنے آدمی نظر آتا۔ بہت امن پسند بھی ہیں۔ بڑے جنگ جو اور خوں خوار بھی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک حیوان ایسا نہیں ہے جو زنا بالجبر کا مرتکب ہو سکے۔ آدمی کے سوا اس فعل ناجائز پر کوئی قادر نہیں اور یہ دونوں خاصیتیں شاید اس لئے ممکن ہو سکیں کہ انسان نے اپنی کمر سیدھی کر لی۔ سیدھے کھڑے ہونے سے ہاتھ اور پاؤں میں کام کی تقسیم واضح ہو گئی۔ دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے۔ آزاد ہاتھوں نے جو چابک دستی دکھائی تو طرح طرح کے اوزار بنا ڈالے۔ اوزار کا استعمال آدمی کی تیسری نمایاں خصوصیت ہے۔ اوزار سازی کے عمل میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ انسانی فکر کا ارتقا تیز ہوتا چلا گیا۔ ہاتوں۔ یعنی محنت و مشقت اور فکر کی بالیدگی میں جو گہرا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے مشہور جرمن فلسفی کانٹ (۱۸۰۴ — 1724) نے ہات کو انسان کا خارجی دماغ کہا ہے اور فکر نے جو اسے باقی تمام حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے، زندگی کو آسان بنانے کے لئے جتنے بھی آلے اس فکری آدم یا حیوان ناطق سے منوائے، ان میں لاکھ اوزاروں کا ایک اوزار زبان یا کلام ہے۔ جس کے بنا کسی نفیس اوزار کی تشکیل ممکن نہیں۔

زبان کی کوئی جامع تعریف کرنا آج بھی مشکل ہے۔ حالانکہ منطق داں، فلسفی، سائنسی محقق، ماہرین نفسیات، عمرانیات اور لسانیات سب کے سب اس میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ زبان کا رشتہ انسانی فکر سے اتنا ہی قریب ہے جیسے کسی سطح پر ایک ہی رنگ کی دو تہیں ہوں۔ گویا ہم زبان کو انسانی فکر کا لباس کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے فلسفی اس کو اپنے میدان میں شمار کرتے ہیں۔ منطق والے فکر کے قوانین اور زبان میں ان کے اظہار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ اسے اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں۔ زبان کا کردار چونکہ شروع سے ہی سماجی ہے لہذا سماجیات کے عالم اسے اپنی بالادستی میں

سمجھتے ہیں۔ بشریات کا ماہر انسان کے مختلف گروہوں پر ان کے مادی ماحول کے اثرات اور بود و باش کا مطالعہ کرتا ہے اور زبان اس کے مخصوص ماحول کا ناگزیر حصہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے مطالعہ میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے۔ اس طرح مختلف علوم کے جاننے والوں کی دل چسپی کے باعث زبان کی تعریف مختلف زاویوں سے کی گئی ہے۔ مثلاً جرمن فلسفی ہیگل (1831 ـ 1770) کہتا ہے کہ زبان نظریاتی ذہانت یعنی (THEORITICAL INTELLIGENCE) کا فن ہے۔ کیونکہ اپنے اصلی مفہوم میں یہ اسی ذہانت کی مظہر ہے۔ فرڈی ننڈ صاسر (1913 ـ 1857) سوئس نامور عالم جس کے بارے میں یہ بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ صاسر پہلا ماہر لسانیات ہے۔ جس نے جدید لسانیاتی نظریے مرتب کرنے میں سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ بھاشا کی تعریف یوں کرتا ہے " علامتوں کا ایسا نظام جو آئیڈیا یا خیال ظاہر کرتا ہے "۔ مشہور اطالوی مفکر، کروچے (1952 ـ 1866) کا کہنا ہے کہ " زبان مربوط آوازوں کا ایک محدود صوتی نظام ہے جس کا مقصد اظہار ہے "۔ ممتاز امریکن ماہر لسانیات ای ـ ساپر (1939 ـ 1844) کے نزدیک زبان ار ـ ادی طور پر پیدا کی گئی علامتوں کے نظام کا وہ خالصاً انسانی اور غیر جبلی طریقہ ہے جس سے خیالات و جذبات اور خواہشات کا ابلاغ ہوتا ہے۔ ایک اور نہایت وسیع عالم السنہ ل ـ بلوم فیلڈ (1949 ـ 1887) کہتا ہے کہ زبان آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ دوسرے آدمی کی تحریک پر وہ اپنا ردعمل ظاہر کر سکے۔ بلوم فیلڈ زبان کو انسانی اطوار کے ان نمونوں میں شمار کرتا ہے جیسے چلنا پھرنا، کھانا پینا وغیرہ۔ اس نکتہ نظر سے اطواری نمونوں (BEHAVIOURAL PATTERNS) کا یہ گروہ ایک لمبے عرصے تک بغیر استعمال ہوئے رہ سکتا ہے اور مناسب تحریک ملنے پر پھر سے عمل میں آنے لگتا ہے۔ ہمارے ملک میں لسانیات کے امام سینتی کمار چیٹرجی مرحوم زبان کو بلوم فیلڈ کی طرح ہمارے فطری اور طبعی حالات سے پیدا ہونے والا آوازی یا صوتی ردعمل مانتے ہیں۔

ان تمام بیانات سے مشہور دانش وروں کے مختلف زاویۂ نگاہ سامنے آتے ہیں جو انہوں نے زبان کے مکمل خد و خال کی تعریف کرنے میں پیش کئے ہیں۔ زبان کی اور بھی بہت سی تعریفیں اور تشریحیں کی گئی ہیں لیکن مندرجہ بالا سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ کوئی تعریف بلا شرکت غیرے نہیں ہے۔ یہ زبان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی تو ڈالتی ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے جوڑتی بھی ہیں لیکن مکمل اور جامع تعریف نہیں بن سکی ہیں۔ زبان کی تعریف انحصار ایک تو کسی محقق کے طریقۂ کار کی ابتدا اور ان مقاصد پر ہے جو وہ لے کر چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فلسفے کے ان بنیادی سوالات کو مجموعی حیثیت سے سمجھنے کے لئے وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ فلسفے کے تمام نظریوں کی بنیاد کا تعلق اس رشتے سے ہے جو خیال اور وجود یا روح اور مادے کے درمیان ہے۔ یہ عالم جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے اس سے ہمارے خیال کا کیا رشتہ ہے؟ کیا ہماری فکر اس جہان رنگ و بو کا یقینی علم حاصل کرنے کی اہل ہے؟ کیا ہم اپنے خیالات و تصورات کی مدد سے حقیقت کی صحیح عکاسی کر سکتے ہیں؟ یہ سوالات اتنے اہم ہیں کہ مفکر ان کا جواب ڈھونڈنے کے لئے شاید اس وقت سے ہی دو گروہوں میں بٹ چکے تھے جب انسانی فکر میں کچھ پختگی آچلی تھی۔ یہ دو گروہ مادیت اور تصوریت کے مکتب خیال کہلاتے ہیں۔

فلسفیانہ مادیت مادے کو یا قدرت کو اولین اور روح کو ثانوی مانتی ہے۔ یعنی وجود پہلے سے موجود ہے اور فکر بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس بات پر زور دیتی ہے کہ فکر و شعور اپنے کردار میں ثانوی ہوتے ہوئے بھی حقیقت میں اسی طرح موجود ہیں جس طرح مادے کی مختلف صورتیں۔ مثلاً مادے کی ایک صورت ہمارے کاسۂ سر میں رکھا ہوا مغز ہے جو فکر یا ذہن کے عمل کو پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح خیال کی تعمیل بھی مادی صورت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ انسانی فکر جو مادی اور طبعی عوامل سے گہرا تعلق رکھتی ہے صرف زبان میں اور زبان ہی کی مدد سے واقع ہوسکتی ہے۔ امریکہ کے جدید ماہر لسانیات نوم چومسکی (جو اپنی تشکیلی گرامر کے نظریے کے لئے بین اقوامی شہرت کے مالک ہیں) ان دانشوروں میں سے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ کسی عقلیت پرست (RATIONALE) انسان یا سماج کے وجود کا تصور زبان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ زبان اور فکر اتنے مربوط ہیں کہ علم السنہ کا ہر مطالعہ انسانی ذہن کو سمجھنے اور اس کے مشاہدے میں ضرور معاون ہوتا ہے (دیکھئے: LANGUAGE AND MIND — NOAM CHOMSKY) اگر ہم حیوانی اور غیر لسانی ذرائع ابلاغ کا تجزیہ کریں تو یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی کلام فکر کی ترسیل کا سب سے اہم سادھن کیوں ہے۔ جن سائنسدانوں نے حیوانی دنیا کا مشاہدہ کیا ہے وہ بتاتے ہیں کہ بعض چھوٹے جانور اپنے احساسات بتانے میں یا کسی کام کی تحریک دینے میں کسی غیر مسموعی یا بے آوازی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے شہد کی مکھیاں ناچ سے اور چیونٹیاں اپنی ننھی ننھی سونڈوں سے کام لیتی ہیں۔ بعض مسموعی طریقے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے جھینگر اپنی ٹانگیں بدن سے رگڑ رگڑ کر شور پیدا کرتے ہیں۔ پرندے مختلف آوازیں نکالتے ہیں اور بڑے جانور خصوصاً چمپینزی کئی طرح کی آوازیں نکال سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب مختلف آوازیں جو غصہ، خوف، غم، خوشی اور خواہش کے اظہار کے لئے نکالی جاتی ہیں۔ انسانی زبان سے کئی اہم وجوہات کی بنا پر بالکل الگ ہیں۔ اول تو یہ سب یکساں اور بے تغیر ہوتی ہیں۔ دوسرے بے ربط اور غیر واضح ہوتی ہیں یعنی بنیادی حیثیت سے ان کی کوئی بناوٹ یا ساخت (STRUCTURE) نہیں ہوتی مثلاً مصوتے (VOWEL) اور مصمتے (CONSONANT) کے درمیان تضاد سے جو ساخت پیدا ہوتی ہے وہ ان آوازوں میں نہیں ملتی اور نہ ہی اس طرح کا ڈھانچا پایا جاتا ہے جس سے ہم انسانی بولوں کو الفاظ میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہم اپنے بیان کو نہ صرف ہر موقع اور محل کے لئے بدل سکتے ہیں بلکہ ایک ہی موقع کے لئے ایک لفظ کی جگہ دوسرا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس طرح حیوانوں کے لئے اشاروں کی تعداد بہت محدود ہے۔ جبکہ انسانی زبان میں کسی موقع اور حالات کے لئے کلام کی تعداد تقریباً لامحدود ہے۔

غیر لسانی ذرائع ابلاغ جو لسانیات کی اصطلاح میں اشاراتی نظام کہلاتے ہیں یوں تو اپنی ساخت، مادی صورتوں اور مقاصد میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر زبان اور ان کے درمیان اور بھی زیادہ فرق ہے لسانیات کے کچھ عالم مثلاً ڈنمارک کے حم صلیف کی رائے میں زبان اور اس طرح کے اشاروں جیسے سگنلوں سے خبر رسانی یا گھڑی کے گجر میں کوئی فرق نہیں۔ خود یہ خیال تو اتنا قابل قبول نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان اور اشاراتی نظام میں بعض خصوصیات مشترک ہیں، مثلاً یہ بھی اظہار کا ذریعہ ہیں۔ خیال اور جذبے کی ترجمانی کرتے

ہیں۔ ان کا کردار سماجی ہے کیونکہ سماج نے ان کو اپنے بعض مقاصد پورا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ اپنی ذات میں مادی ہیں۔ حالانکہ ان کی مادی صورتیں الگ الگ ہیں جیسے آواز کی لہریں، روشنی کی لہریں، برقی لہریں، گراف چارٹ، ٹیلی گراف وغیرہ اور یہ سب طریقے خارجی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر لسانی اور غیر لسانی نظام ابلاغ میں زیادہ اہم اور بنیادی باتیں وہ ہیں جو مشترک نہیں ہیں۔

زبان خیالات و احساسات کی رسالت کا ایک ایسا مجموعی ذریعہ ہے جس سے ایک فرد انہیں دوسروں تک پہونچا سکتا ہے۔ اور جیسے تمام لوگ اپنے تمام افعال و اعمال کے دائروں میں استعمال کرتے ہیں مگر سب اشاراتی نظام اپنے استعمال و اظہار میں محدود و پابند ہیں۔ یہاں تک کہ موسیقی بھی جذبات کا اظہار تو کر سکتی ہے مگر ان کا نام نہیں بنا سکتی، تصورات اور فیصلوں کا اظہار نہیں کر سکتی نہ خیال (یہاں کلاسیکی موسیقی کے "خیال" سے مراد نہیں ہے) منتقل کر سکتی ہے۔ اس کے حلقہ بگوش صرف وہی لوگ ہیں جو موسیقی سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس صوتی نظام کو محسوس تو کر سکتے ہیں مگر فعالی طور پر اسے استعمال نہیں کر سکتے۔ زبان کے علاوہ تمام اشاراتی نظام مصنوعی ہیں۔ رواج انہیں پیدا کرتے ہیں۔ رواج ہی انہیں تبدیل و متروک کرتے ہیں۔ ان کو مجموعی حیثیت سے لوگ نہیں بناتے بلکہ ایک مخصوص کام کا نمائندہ گروہ بناتا ہے۔ زبان کا نشو ونما سماج کے چند افراد کے ارادے پر منحصر نہیں ہوتی، ہر نسل اس زبان کو اپناتی ہے جو اسے ورثے میں ملتی ہے اس لئے زبان کی تنمیہ یا بالیدگی ایک تاریخی عمل ہے جس کے اپنے مادی اور معروضی قانون ہوتے ہیں۔ تمام اشاراتی طریقے زبان کے معاون ہیں۔ ان میں ہر ایک کی اپنی فوقیت اپنا فائدہ ہے۔ مثلاً ان کی عمدگی، نفاست، اختصار، علاحدگی وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی بھی نظام زبان کو بحیثیت ایک آفاقی ابلاغی ذریعے کے ہٹا کر خود اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس وجہ سے یہ اہم نہیں کہے جا سکتے۔

زبان نہ صرف حقائق کا ست یا عطر ہم تک پہونچاتی ہے بلکہ ان حقائق کی طرف بولنے والوں کا جو رویہ ہے اس کی ترسیل بھی کرتی ہے یعنی حقیقت کے بارے میں متکلم کا جو اندازہ اور خیال ہے یا جو اس کا ارادہ ہے وہ سب دوسرے انسان تک پہونچا سکتی ہے۔ زبان صرف منطقی فکر سے ہی منسلک نہیں ہے۔ بلکہ انسانی نفسیات سے بھی اس کا اتنا ہی گہرا رشتہ ہے۔ پہلے زبان کے بارے میں جو بھی خیالات رہے ہوں لیکن اب یہ نظریہ کہ زبان معاشرے کی پیداوار ہے۔ اور اس میں بھی باقی رہ سکتی ہے تمام ماہرین لسانیات کی رائے میں صحیح ہے کہ زبان کا تعین بھی انسان کی سماجی معاشی اور تمدنی تاریخ سے ہوتا ہے۔ اس لئے زبان کا مطالعہ و مشاہدہ ہم بہتر طور پر اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم انسانی سماج سے اس کے گہرے تعلق کو سامنے رکھیں کیونکہ زبان ان لوگوں کے کردار، ذہنیت، سماجی کاموں اور رشتوں کا آئینہ ہوتی ہے جو اسے بول رہے ہیں۔ ●●

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا۔

آسی رام نگری

گیت

پیٹ کا دکھ ہے اپار
سکھی ری! پیٹ کا دکھ ہے اپار
چاہے جتنو دکھ سکھ سہیو
من کی بات کسی سے نہ کہیو
بیری ہے سنسار
سکھی ری! پیٹ کا دکھ ہے اپار

پریم سندھو میں
جھو بر کے
(ناؤ اپنی) گھاٹ سے جھکے
کون [illegible] ہے پتوار
سکھی ری! پیٹ کا دکھ ہے اپار
گہری ندیا ناؤ پرانی
میں برہن اور تیری جوانی
کیسے بڑھا تا پار
سکھی ری! پیٹ کا دکھ ہے اپار
جب پیسہ پاس نہیں ہے
کوئی خوشی بھی پاس نہیں ہے
اب جیون ہے بھار
سکھی ری! پیٹ کا دکھ ہے اپار!!

▲▲▲

نصیر قریشی

"دھرتی چپ، آکاش بھی چپ"...

اڑتی ہے گردِ بربادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
ساری دنیا ہے فریادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
قاتل سائے گھوم رہے ہیں گلیوں میں بازاروں میں
ویرانہ ہے یا آبادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
کون ہے منصف، کون محتسب، عدل کی اب زنجیر کہاں
ہر سو بھٹکے ہیں فریادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
دوش پہ غم کی بھاری صلیبیں لوگ اٹھائے پھرتے ہیں
عظمتِ انساں پہ بربادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
حرفِ شکایت اب ہے بغاوت، اہلِ وفا کی آہیں مدھم
اہلِ ستم کی سن کے منادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
موسم کی بے رحمی لوٹے شاخِ گل کی زیبائی
اجڑی بہاروں کی شہزادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
شیش محل سے کچے مکاں تک نفرت کے شعلے بھڑکے
خاک کی ڈھیر ہے پیار کی وادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
خون کا رنگ ہے ایک ہی سب کا ایک ہی دھرتی اور آکاش
جسم نے روح کی شمع بجھا دی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
گھٹ کر رہ گئی چیخ کسی کی چوڑی سہاگن کی ٹوٹی
ایک چتا اور جشنِ شادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ
نوکِ قلم پہ وقت پڑا ہے محسن کے نغمے ترک کرو
حرف و لفظ ہے فریادی، دھرتی چپ، آکاش بھی چپ

▲▲▲

منصور اعجاز

مجھے معلوم ہے مذہب کے اندھو
تمہاری آنکھ کتنی بے نظر ہے
تمہارا دل بڑا ہی بے خبر ہے
تمہاری حق شناسی !
دردمندی !!
دور بینی !!!
بے اثر ہے۔
مقدس بائیبل، گیتا
کوئی قرآن لاؤ
میرے سر پر رکھو
میں جھوٹ بولوں گا

اور
سب کو!
اندھا، گونگا
بے بس و مجبور کردوں گا

محافظ

تہذیب و تمدن
اور قدروں کی
زنجیروں کو توڑ رہے ہیں
ہاتھی دھرتی روند رہے ہیں
جنگل کا قانون لگا ہے
ہر سو ... ہر سا شور مچا ہے
چپکے سے کوئی بول رہا ہے
دیکھو ۔!
وہ ابابیلوں کا لشکر
سب یہ تماشا دیکھ رہا ہے
لیکن ان کی اندھی آنکھیں
پتھر کس پہ برسائیں گی ... ؟؟؟

منصف

ڈھیری میرے سر پہ کتابیں
کالی پٹی آنکھوں پہ
ذہن و دل پہ تالا اور
میزان ہے میرے ہاتھوں میں
کس کس کے ہے پاؤں میں بیڑی
میں سب کو آزاد کروں گا
اک اک کا انصاف کروں گا

تیرے بعد ......

کوئی چہرا !
کوئی موڑ !
کوئی راہ گزر !
جہاں مل جائیں ....
بچھڑ جائیں .....
یا کہیں دور، بہت دور، ساتھ ساتھ چلیں،
اب تو ایسا بھی نہیں،
صرف تنہائی بھٹکتی ہے، شہر میں ہر سو ۔

خودکشی

رہنما ۔۔۔ جھوٹا
بے وفا محبوب
خون آشام جنگ نسلوں کی
ملک اور قوم کی مسیحائی
تنہا جینے کے کرب سے لیکر
جھوٹی قسمیں جو دل کو چھید گئیں
اور جینے کی صد تمنائیں
ہار جانا بھی موت ہے تم سے
صرف ایک حوصلے کے بل پہ ہم
آج تک جی رہے ہیں یہ کہہ کر
یہ خودکشی تو ہمیں بار بار کرنی ہے

ادھوری کہانی

ادھوری کہانی
کبھی آدھی پوری
میں سوچا تھا بچپن میں جس سے بہل
مگر آج،
جب موت میرے قریں ہے
کہانی ادھوری ہے
لوری ادھوری
میں کب آدھی لوری کو پوری کروں گا
ادھوری کہانی مکمل کروں گا
میں کب تک جنم لیتا مرتا رہوں گا

غزلیں

مشتاق شبنم

پیاس چھلکے تو ساغر سی لگے
بوچھوٹ سلسلۂ کرب حیات
پیار اس کا ہے مسیحا کی طرح
لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی رُت
گھومتے ٹوٹتے بنتے ہوئے خواب کہاں
کیسا موسم ہے کہ پھولوں کی بساط
کون پہونچا مری گہرائی تک
ہے عجب دور کہ ہستی سب کی
شکر ہو یا کہ شکایت شبنم

ایک اک بوند سمندر سی لگے
سانس چلتے ہوئے خنجر سی لگے
زندگی پھر بھی ستم گر سی لگے
کسی محبوب کے تیور سی لگے
چاندنی ڈوبتے منظر سی لگے
کسی بیمار کی بستر سی لگے
یوں تو ہر موج شناور سی لگے
ٹوٹے بکھرے ہوئے پیکر سی لگے
مجھ کو ہر بات برابر سی لگے

تمہیں بلائیں گی رس گھولتی سی آوازیں
اگر رکے تو وہیں روک لیں گی آوازیں
اسے لگے تو بہت دیر ہو چکی لیکن
کہاں سے آتی ہیں کانوں میں اب بھی آوازیں
بھلا سکیں گی نہ اب آنے والی نسلیں بھی
دلوں میں اس طرح اتریں گی میری آوازیں
ہماری روح کے ہر کرب کا پتہ دیں گی
بکھرتی ٹوٹتی سانسیں، لرزتی آوازیں
تمہیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ کون قاتل ہے
ہیں ایک دیر اثر زہر میں بجھی آوازیں
حساب مانگے گا یہ وقت ایک ایک پل کا
جواب دیں گی کیا شرمندگی کی آوازیں
چلو غزل میں نئے تجربے کریں شبنم
سنائی دینے لگیں گی ہماری آوازیں

عجب طرح کا ہے احساس برتری مجھ میں
ضرور فہم و بصیرت کی ہے کمی مجھ میں
طویل فاصلے کم ضو بنائے رکھتے ہیں
وگرنہ کم نہیں سورج سے روشنی مجھ میں
اندھیرے اور گھنے جنگلوں میں تھا لیکن
خضر نے ڈھونڈ لیا آب زندگی مجھ میں
سمجھ سکو گے نہ میرے دکھوں کی گہرائی
بہت اداس ہوں لیکن ہے سرخوشی مجھ میں
ترے خیال کی رو اس طرح ملی مجھ سے
اتر گئی کوئی بہتی ہوئی ندی مجھ میں
میں زندگی سے نبرد آزما رہا تا عمر
مگر ذرا بھی نہ آئی شکستگی مجھ میں
مرے وجود کو ڈس لے گی ایک دن شبنم
ہے ایک سانپ کی صورت یہ آگہی مجھ میں

کار ہستی میں پیدا آسانی کر دو
ہم پر بھی خوشیوں کی کچھ ارزانی کر دو
اک دن گم ہو جاؤ گے تم سناٹوں میں
اپنے فکر و فن کو ہی لافانی کر دو
دکھ ہوتا ہے ٹوٹتے ہیں جب گہرے رشتے
گہرے رشتوں کی اب ختم کہانی کر دو
ڈال کے عکس ماضی حال کے آئینوں میں
اپنے تن پاروں کو پھر لاثانی کر دو
آج زلیخائیں آوارہ سی پھرتی ہیں
یوسف صورت ان کو بھی زندانی کر دو
دیکھ کے جن کو گہرے سمندر بھی شرمائیں
صحرا صحرا برپا وہ طغیانی کر دو
دریاؤں کی پیاس بجھانے نکلے شبنم
تم اس کی در گزر یہ ناداں کر دو

بدیع الزماں خاور

خزاں کی رت ہی سہی

خزاں کی رت ہی سہی زندگی کے صحرا میں
رقم ہوئی ہیں کہاں سنب بہار کی نظمیں!

ٹپک سکیں جو قلم سے تو میرے سینے میں
ابھی بہت ہیں دلِ بیقرار کی نظمیں

میں تیرے وصل کے نغمات گا رہا ہوں تو کیا
ہیں اب بھی ذہن میں کچھ انتظار کی نظمیں

مرے حبیب خدا مجھ پہ اپنا فضل کرے
لکھوں گا اور بھی میں تیرے پیار کی نظمیں

بس ایک شرط یہی ہے کہ تنگ کر کے مجھے
یہ وقت مجھ سے نہ لکھوائے دار کی نظمیں

غزل

محفوظ کیفی

رنج و غم، درد و الم، شعلہ رسانی لکھنا
چار لفظوں میں محبت کی کہانی لکھنا

لوگ اوروں کی طرح تم کو بھی جھٹلا دیں گے
تم مگر خون کو بھولے سے نہ پانی لکھنا

دل کی با معنی کتابوں کا جہاں ذکر آئے
تبصرہ کے لئے وہ باتیں پرانی لکھنا

وہ تو احساس کے چہرے کا ایک دھبہ ہے
کون کہتا ہے اُسے شیریں بیانی لکھنا

کیا بگاڑیں گے نئے دور کے نقاد بھلا
جی میں جو آئے وہ الفاظ و معانی لکھنا

سب کے ہاتھوں میں نظر آتے ہیں پتھر کیفی
دوستوں کو بھی سدا دشمنِ جانی لکھنا

غزل

رؤف خیر

ہمارے نام کا پردہ کہاں اٹھاتی ہے
اسی جگہ تو کہانی بدن چھپاتی ہے

ادھر اُدھر کو بھٹکنے کبھی نہیں دیتی
وہ بوئے خوش بدنی راستہ دکھاتی ہے

کوئی کتاب ہو بین السطور ہی پڑھیے
یہ راکھ وہ ہے جہاں آگ منھ چھپاتی ہے

یہ لوٹنا ہے کہ لٹنا ہے کچھ نہیں سکتے
خدا گواہ ترا حسن سومناتی ہے

خطا وہیں سے تو اندھے کے تیر ہوتے ہیں
جہاں سے نیک گمانی فریب کھاتی ہے

کسی طرح سے بھی دن گزر ہی جاتا ہے
مگر وہ رات کہ جب نیند ٹوٹ جاتی ہے

غلط سلط بھی کبھی فیصلے ہوئے ہم سے
مزاج اپنا ذرا غیر تجزیاتی ہے

انائے کربِ مسکیں ہو یا کہ سرداری
کبھی کبھی تو خود اپنا لہو بہاتی ہے

کسی طرح تو کرائے کی علتوں سے بچے
نواحِ شہر میں اک گھر تو غیر ذاتی ہے

ڈاکٹر طاہر سلیم حنیف
گنور، ضلع بدایوں۔ یو۔ پی۔ پن ۲۰۲۵۲۰

الاسٹر

انسان دماغ کی بنا پر نہیں بلکہ عقل کی وجہ سے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ عقل روزِ اوّل سے اس کی محافظ اور اس کو ترقی پر گامزن رکھنے کی کوشاں رہی ہے۔ ان تمام اختراعات و کرشمہ سازیوں کا سہرا جو معرضِ وجود میں آ چکی آ رہی ہیں یا آئیں گی عقل ہی کے سر ہے۔ لیکن آپ "ہر فرعون را موسیٰ" جیسے مقولے سے تو واقف ہوں گے ہی چنانچہ عقل بھی ہمارے جسم کی مالک و مختار نہیں۔ جب بھی اس کے کسی فعل سے ہمارے جسم کے تمام اعصاب میں مسرت کی لہر دوڑتی ہے حضرتِ دل اس پر پہرے بیٹھا دیتے ہیں۔ یہ سرد جنگ دل و عقل کے مابین ہمیشہ سے چلتی رہی ہے مگر عقل کا مقام کچھ بلند رہا ہے اس لئے اسے دل کی مستقل خلاف ورزیوں پر کبھی غصہ نہیں آیا ورنہ وہ انسان کو اس بات پر ضرور مجبور کرتی کہ جہاں دل دھڑکتا ہے یعنی بائیں جانب کی پسلیوں پر اوور کوٹ میں ایک بڑا سا خلا ضرور رکھا جائے تاکہ دل موسمِ سرما کے خنک تھپیڑے کھاتا رہے اور اپنی ازلی دشمنی کی سزا پاتا رہے۔

ماہرینِ حیوانات کا کہنا ہے کہ دل قوتِ ممیزہ و احساس سے یکسر بیگانہ ہوتا ہے۔ تمام تر صلاحیتوں کا منبع صرف و محض دماغ ہی ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ شدید رنج و غم یا کسی زبردست مسرت کا یکبارگی ایٹم بم پھٹنے پر مائنڈ اٹیک سے زیادہ ہارٹ اٹیک ہوا کرتے ہیں۔ منطقی طور پر یہاں ہمیں شاعری کے اس عظیم حصے کو صحیح تسلیم کرنا پڑے گا جس میں دل اور دماغ کے الگ الگ مقام متعین کئے گئے ہیں۔ لیکن مجھے ان دونوں کے معاملات و تعلقات سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میں تو صرف یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ عقل نے اوور کوٹ جیسی تخلیق پیش فرما کر نوعِ انسانی پر زبردست احسان کیا ہے۔

شروع شروع میں جب عقلِ انسانی خوابیدہ حالت میں تھی تب اسے گردوپیش کی فکر نہیں تھی۔ البتہ جب آہستہ آہستہ جاگنا شروع ہوئی تو اسے گردن سے اوپر اور ٹخنوں سے نیچے کے حصوں کو چھوڑ کر بقیہ جسم کے حصے ننگے معلوم ہوئے ہوں گے تو اس نے جغرافیائی تقسیم کو مدِنظر رکھتے ہوئے لباسوں کی اختراع کی ہوگی لیکن جب آمد و رفت کے راستے ہموار ہوئے ہوں گے تو عقل کو نظر کے فیصلوں پر اکتفا کرنا پڑا ہوگا اس طرح بعض پہناوے جو بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوئے ان میں الاسٹر یا اوور کوٹ منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

ابھی کچھ زمانہ قبل ہمارے ملک میں روئی کے کوٹ چلا کرتے تھے جو افادیت میں ان الاسٹروں سے بدرجہا بہتر تھے بلکہ ہمیں فخر تھا کہ

جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

یہ گھٹنوں تک لانبے بھی ہوتے اور تل اور ہاف آستینی کے بھی مگر انہیں پانی سے سخت ایلرجی تھی یعنی ان کی آب و عافیت نہ ڈھلنے ہی میں تھی اور یہی نازک مزاجی ان کے زوال کا باعث بن گئی مگر ان دونوں کے مابین یہ فرق تھا کہ انہیں کرتا اور قمیص کے اوپر بھی پہنا جا سکتا تھا اور نیچے

جس کے دو مونہہ ہوں۔

ایک صاحب جو تعلیم کے دوران اکثر پبلک سیلرس کی دن پہد کھائی دیا کرتے تھے۔ اب خود ایک لائبریری چلا رہا ہے۔ مجھ سے بہت فرینک ہیں۔ بلکہ ان کی عادت سے پہلے سے واقف ہوں اس لئے میں نے کبھی ان کے یک بہ یک کتب خانے کے معرض وجود میں آنے پر اظہار تعجب نہیں کیا البتہ ایک دن جب میں نے ان کے یہاں عربی کی لغت "قاموس" اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کی کئی جلدیں دیکھیں تو حیرت سے ان کے حصول پر سوال کر ڈالا۔ وہ مسکراتے ہوئے خاموشی سے لائبریری سے ملحقہ اپنے مکان کی طرف چلا گئے۔ واپسی پر ان کے جسم پر اور کوٹ مزین تھا اور جب انہوں نے پائجامہ کا کمربند ڈھیلا کر کے "قاموس" کو اور میں کو بالا سٹر کے بٹن لگا لئے تو سوائے قہقہہ لگانے کے مجھ سے کچھ نہ بن پڑا۔ مگر جب وہ اسی دوران بہ یک وقت اچھل کھڑے ہو تو میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا وہ کہہ رہے تھے کہ اس کی جیب میں بھائی نہ معلوم کیا ہے" ابھی الاسٹر اتر نہیں پایا تھا کہ ایک چوہا کود کر بھاگ چکا تھا۔

سردی بہت شباب پر تھی مجھے ایک صاحب سے ملنا تھا وہ ہمارے قصبہ کے ایک ادبستر محلے میں رہا کرتے تھے۔ میں نے اپنی ہل کا جوتہ پہنا، سر پر بالوں دار ٹوپی رکھ کر اور کوٹ کے کالر اوپر اٹھائے جیبوں کو ہاتھوں پر دستانے چڑھے ہوئے تھے اس لئے جیبوں کے کور بھی باہر ہی نکلے رہنے دئے۔ جب میں موصوف کے محلے میں داخل ہوا تو نکڑ پر حلوائی کی دکان نظر آئی جس کا ایک پٹ کھل رہا تھا اندر لالہ جی بوسیدہ لحاف اوڑھے ایک ٹوٹی اور قدرے بہت چھوٹی چارپائی میں دھنسے ہوئے خراٹے لے رہے تھے اور باہر لیمپ اور چاند کی روشنی میں کچھ کتے بڑے سے کڑھاؤ کو چاٹنے میں مشغول تھے۔ ایک صاحب جو کمبل کا گرم نرم راکھ پر دیجوں کے ڈھیر کو سمیٹے پڑے تھے۔ میرا بغور مطالعہ فرما کر باہر نکلنے چلے غرائے

اور پھر کسرت کے سے انداز میں سینے کو آگے پیچھے کر کے برس پڑے۔ میں نے حقارت سے انہیں دیکھا اور آگے بڑھتا چلا گیا بالکل اس طرح جیسے میرے چپراسی نے مجھے سلام کیا ہو اور میں بغیر جواب دئے آفس کی جانب مڑ گیا ہوں مگر یہ کوئی چپراسی تو تھا نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھی میرے اس حلیے سے مرعوب۔ اس لئے کتوں نے ان کی سنتولیات کو بالائے طاق رکھ کر صدائے احتجاج بلند کی۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ایک اور صاحب جو خاموش طبیعت یا کم سخن واقع ہوئے تھے میری جانب معانقہ کے سے انداز میں لپکے ان کے اچانک اس رویئے پر میری آواز گھٹ گئی

"ہ — ہے — ہے — ہیٹ" بھاگنے کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا مگر جب میری نظر پیچھے گلی سے دوڑتے ہوئے کتوں کی آواز بلند تر ہو گئی تو میں نے سرپٹ دوڑنے کے ساتھ اونچی کود کی مشق بھی شروع کر دی تھی اور وہ تعاقب کے ساتھ ترنم کو برلستہ ہوئے داد بھی دے رہے تھے۔ میں انہیں یہ سمجھا نہ سکا کہ میں نے نشہ میں گایا تھا۔ مگر وہ اپنی عقل سے مجبور تھا جو گدھ کو ٹیپ سمجھ رہا تھا۔ بہتر ہوا کہ لالہ کی آنکھ کھل گئی اور ان کی دھتکار پر میرا پیچھا چھوٹ گیا۔ مگر دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا اور دماغ میں اب یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بھاگنے سے بہتر تدبیر یہ تھی کہ وہیں سرنگوں میں چھپا کر بیٹھ رہتا کتے بگاڑ کیا سکتے تھے؟

شدید سردیوں میں حضرات کم اور سفر میں کچھ زیادہ ہی الجھنوں کا شکار ہونا پڑتا ہے لیکن جو لوگ اور کوٹ جیسی نعمت سے سرشار ہوتے ہیں انہیں ہولڈال، کمبل اور دیگر مانع برودت لبادوں کی چنداں ضرورت پیش نہیں آتی۔ مان لیجئے آپ ہی سفر کر رہے ہیں اور الاسٹر آپ کے پاس موجود ہے اس کے کالر اٹھا لیجئے اور اگر بجلی ہو تب گھٹنے پیٹ کی جانب سمیٹ کر ٹھنک جائیے اس طرح لمبے سفر میں نیند کی تھکان بھی اتر جائے گی اور کمبل اور لحاف کو ساتھ رکھنے وا

سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوں گے۔ مگر ہاں یہ
خیال رکھئے کہ اگر آپ کسی ماہ جبین کو پسند آگئے تو پھر
آپ کو پیرالاسٹر اتنا محبوب ہو جائیگا کہ آپ اسے ہر
موسم میں زیب تن فرمانے کی کوشش فرمایا کریں گے۔ اور
اس کا حال بقول ایک مرحوم شاعر۔۔

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

بہرحال کسی بھی زاویے سے دیکھئے پیرالاسٹر کی
خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اب تو پیرالاسٹر
کی درآمد پہلے سے زیادہ ہونے لگی ہے پہلے لوگ اس کی
اترن کو معیوب سمجھتے تھے، مگر مجبوریاں بھیک بھی
منگوا سکتی ہیں اس لیے اگر اترن کوٹوں کی تجارت
ہمارے ملک میں عام ہو گئی ہے اور اس سے ہر طبقے
کے لوگ فیض حاصل کر رہے ہیں تو یہ کوئی بات نہیں
ایک صاحب جب پاکستان سے تشریف لائے

تو انہوں نے اپنے ایک دوست کو بہت قیمتی اور
قسم کے دوادر کوٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے میرے
خالہ زاد بھائی نے تحفہ پیش کیا ہے" انہوں نے اسے
دیکھ کر صرف اتنا کہا کہ کپڑا بہت عمدہ ہے اور دوسرے
دن ملاقات پر یہ خواب سنا دیا کہ تم میرے قریب سو
رہے ہو الاسٹر تمہارے جسم پر موجود ہے۔ ایک نا
معلوم شخص تمہارے سینے پر بیٹھا کہہ رہا ہے:
"اتار میرا الاسٹر"۔ تمہاری آنکھ کھل گئی اور تم نے پھر
اس سے سوال کیا "تو ہے کون؟" اسنے جواب دیا "میں
ہوں امریکا کا ہنر"۔۔۔ یہ تو حسد کا مسئلہ رہا
ہوگا اگر یہ حقیقت ہوتی تو ہر صاحب الاسٹر کے
سینے پر کوئی نہ کوئی نادر سوار ہو جایا کرتا اور فرانس
کے مانگنے والوں کے علاوہ انہیں شاید ہی کوئی
استعمال کرتا۔

دسمبر کی دانت سے دانت بجا دینے والی شدید

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

انور ندیم (لکھنؤ)

شب خون

فلم چھوٹنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ سینما ہال باہر سے بالکل خاموش تھا۔ اس کی بغل کی عمارت کے اوپری حصے پر ٹیوب لائٹ سے آراستہ لائف کارن کا ایک عظیم الشان اشتہار کا ڈھانچہ جھلملا رہا تھا۔ اور سامنے عمارت روشنی کی گدگدی سے قہقہے لگا رہی تھی۔ سینما ہال کے باہر سامنے والی عمارت، جلتی بجھتی روشنی سے جاذب نظر ہو گئی تھی اور اسی پس منظر میں ایک مزدور نے ڈبیا کو رگڑ کر [illegible] عمارت کی تیسری منزل کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا۔ اُس کی ماچس کے شعلے سے روشنی ہو گئی۔ مزدور مسکرا دیا۔ پھر وہیں اپنی ڈلیا میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ اور متلاشی نظروں سے سینما ہال اور اس کے گرد و پیش دیکھنے لگا ——!

ہال باہر سے بالکل خاموش تھا مگر اندر زندگی، انتہائی سکون و قرار کی حالت میں انسان کو متحرک ہوا تو دیکھ رہی تھی۔ دوکانیں گہری نیند سو رہی تھیں۔ پان فروش آخری کمائی کے لئے جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا۔ کتھے اور چونے کی پیالی کے تناسب ڈبیوں کے ٹکرانے کی آواز ابھر رہی تھی۔ ایک خاص انداز سے حسب مطابق پان [illegible] خاص ترتیب سے ان کے مخصوص ڈبوں میں رکھی جا رہی تھیں۔ پان فروش کی بغل میں بیٹھا اس کا کوئی قریبی دوست قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دوست کے لئے جان دے سکتا ہے۔ اس کا [illegible] چھوٹی موٹی گالیوں اور قہقہوں کے درمیان ایک اعلان کی صورت میں گونج رہا تھا۔ وہ ابھی لڑنے کے جھومتا ہوا اترا تھا ——!

ہال کے سامنے سڑک کے بیچوں بیچ، بہت سی چھوٹی بڑی کاریں سلیقے سے کھڑی تھیں۔ جیسے کسی معاملۂ حسن میں شریک ہونے والی حسینائیں ایک دوسرے کو آنکھ دکھا رہی ہوں۔ پیچھے سڈول اور خوبصورت اسکوٹر ایک ہی جگہ دم سادھے کھڑے تھے جیسے کالج کے شریر لڑکے کسی نئی شرارت کی اسکیم سوچ رہے ہوں ——!

فلم چھوٹ گئی! زندگی اور قہقہہ ایک سیلاب، سڑک پر پھیل گیا۔ شہر کی سب سے چوڑی سڑک، چھوٹی اور تنگی ہو گئی۔ شام کے مسکراتے چہرے، ہال سے باہر نکلے تو نیند کے اثرات میں ڈوبے ہوئے۔ جیسے سبھی نے نیند کی غلامی قبول کر لی ہو ——! کاروں کی آواز گونجی اور بکھر گئی! اسکوٹر چیختے ہوئے گزر گئے ——! سڑک نے پھر اپنے بازو پھیلا دئے۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ چوڑی ہو گئی۔ پان کی آخری دوکان بھی اپنے آپ میں ڈوب گئی! پان فروش کا قریبی دوست قہقہے لگا رہا تھا۔ پان فروش نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اسی کے بیکٹ میں بیٹھ کر کسی گلی میں مڑ گیا ——! ایک پاگل عورت، پان کی دوکان کے سامنے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے شاید پانچ پیسے کا کوئی سکہ مل گیا تھا۔ وہ اچھلتی ہوئی سگریٹ کے ٹکڑے ——
دور گود رکھا، کیدار کسی دوکان کے باہری تختہ پر اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا، کوئی پہاڑی دھن الاپ

رہا تھا، مزدور اسے جانتا تھا! اس نے کئی بار اسے بیڑی پلائی تھی "ہال اور دوکانیں، سڑک اور گلیاں سب خاموش تھیں ـــــ !

لائف کارن کا اشتہاری ڈھانچہ ابھی تک جاگ رہا تھا، ساری عمارت اس کی گدگدی سے قہقہے لگا رہی تھی ـــــ !

مزدور نے پھر تیسری منزل کی طرف دیکھا! ایک چھوٹی سی ڈبیا ملکے ملکے نیچے آ رہی تھی! مزدور نے بڑھ کر اس میں رکھا کاغذ اٹھا لیا! اور اپنی طرف سے ایک خط اسی میں رکھ کر ڈبیا میں رکھے پتھر سے دبا دیا! ڈبیا دھیرے دھیرے اوپر چلی گئی، جہاں ندیرو پاورکی اندھی روشنی میں نرجے اس خط کو بے صبری سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی:

"ڈیڑھ سال پہلے شور اور ہنگامے سے دور، قانونی ضابطوں میں ہم لوگ ایک دوسرے کو اپنا چکے تھے۔
اور بزرگوں کی دعاؤں کے منتظر تھے۔
ہم اپنی پسند، فیصلے اور ارادے کا اظہار کر چکے تھے۔
ہماری عملی قوتیں ظاہر ہو چکی تھیں۔
ہم نے انسانی رشتوں میں حائل، ریت اور پتھر کی ساری دیواریں توڑ دی تھیں مگر پھر بھی ہم پتاجی کی دعاؤں کے طالب رہے۔
اور انھوں نے ہمارا امتحان لے لیا۔
ان ہی کی خاطر سال بھر پہلے ہم ایک دوسرے سے الگ بھی ہو گئے غیر ضروری شرطیں قبول کر لیں تاکہ ان کا کمزور دل کہیں ڈوب نہ جائے!
اچھے کردار کی ضمانت!
خوشگوار نوکری!
اور بینک بیلنس!
پتاجی کو یقین تھا کہ ان نایاب جڑی بوٹیوں کی تلاش میں میں زندگی کے گھنے جنگل میں کھو جاؤں گا اور وہ تمہیں اپنی مرضی سے کسی محل یا بجو کے حوالے کر سکیں گے۔
اپنے پتا جی سے کہہ دو نرجے! کہ میں لوٹ آیا ہوں ـــــ!
میں نے اپنی نرجے کا پتا پا لیا ہے
ظاہر میں ان کے بتائے آدرش پورے کئے ہیں
اور اندر سے ان کے ارادوں کو زخمی کیا ہے۔
کہہ دو ان سے کہ اچھے برے کردار کو دیکھنے اور سمجھنے کی نظر ان کے پاس نہیں ہے جبکہ ایک سال پہلے میں تمہیں کی خاطر تم سے الگ ہو گیا تھا اور اس طرح اپنے کردار کو واضح کر دیا تھا۔
یقیناً میں نے ایک علمی کیریئر پیدا کیا تھا جسے اچھی بری ڈگری سے نہیں آنکا جا سکتا۔ پھر بھی ان کا یہ کہنا ٹھیک ہی تھا کہ میں ایک معمولی کلرک ہوں جس کی تین ماہ کی کل آمدنی بھی ان کی بیٹی کی ایک معمولی فرمائش پوری نہیں کر سکتی۔

کبھی واپس نہ لوٹنے کی غرض سے ——!

تم نے ادھر ایک سال پہلے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا' اور ایک تمسخرانہ تھا۔ سند مسکراہٹ کے لیے ایک نازک شعر! اس میں ایک شبد تھا

"تبسم" میں نے اُسے اپنا لیا ہے۔ اکثر اُسے دہرایا بھی اور اپنی آتما کو مسکراتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ کہتے ہیں دھرم کی راہیں مشکل بھی ہیں اور آسان بھی' اس کے اوپری روپ' کبھی کبھار موت کے ساتھ زندگی بھی تقسیم کرتے ہیں۔ وجہ انگریزی جمع خرچ کے ساتھ "تبسم" ہو جائے تو کیا برا ہے۔ میں اسی آشا کے ساتھ' منہ اندھیرے تمہارے پاس آ رہی ہوں۔

سنا ہے طارق کسی بوڑھے کا نام تھا۔ تم بھی خون کو ختم کر دو' پھر میرے ساتھ دھرم کے اندھے کنوں میں ڈبکی لگانے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے خاندانی چوکھٹ کے باہر طارق اور تبسم کے فرضی نام' زندگی جیسی لطیف اور جاندار چیز کو اپنانے اور پھر بسنے کا پورا اور جائز موقع دے سکیں —!

میں آ رہی ہوں!

تمہاری وڈیلی تبسم ——!

مٹھائیاں اور ٹافیاں

SOHAIL/81

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب : فصیل شب

افسانہ نگار : رضوان احمد
صفحات : ۱۲۸، قیمت : ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ : زیور پبلی کیشنز، باقر گنج، پٹنہ ۴
مبصر : سید احمد قادری

"مسدود راہوں کے مسافر" کے بعد رضوان احمد کا یہ زیر تبصرہ دوسرا افسانوی مجموعہ تقریباً چھ سال کے وقفے کے بعد سامنے آیا ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رضوان احمد بہت زیادہ افسانے لکھنے اور ہر سال چھ ماہ پر افسانوی مجموعہ کی اشاعت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ بہت سوچ سمجھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر اس موضوع کے ساتھ، اس کے فن، اسلوب، آرٹ، تکنیک، زبان و بیان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرکے، خون جگر صرف کرکے افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔

زیر نظر اس افسانوی مجموعہ میں کسی ناقد کا مقدمہ یا تعارف نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالق کو اپنی تخلیقات پر پورا بھروسہ اور اعتماد ہے اور وہ کسی کی بیساکھی کے سہارے قاری کے دل میں اترنا نہیں چاہتا۔

رضوان احمد کے افسانوں کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ وہ حادثات اور واقعات کو دور سے کسی ٹیلے پر کھڑے ہو کر تماشہ نہیں دیکھا بلکہ وہ جن واقعات اور حادثات سے دوچار ہوئے ہیں انھیں کو وہ اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

رضوان احمد کے افسانوں کا MEDIUM بیانیہ ہے۔
[illegible]

تشبیہیں اور استعارے موجود ہیں، وہ رضوان احمد کے افسانوں کے حسن کو دوبالا کرنے کے ساتھ ساتھ مؤثر اور باوقار بناتے ہیں۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

"لیکن آسمان پر اتنا بڑا المیہ کیسے رونما ہوا جبکہ تو ہم زمین والوں کے لئے مخصوص ہے۔ ہمیں ہیں کہ سارے دکھ جھیل جاتے ہیں۔ سب کچھ برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں ایک لاش سڑ رہی ہے تو انھوں نے ساری دنیا کی توجہ اس کی جانب مبذول کرلی ہے۔ لیکن یہاں تو گھر گھر میں لاشیں سڑ رہی ہیں۔ اس قدر بدبو اور تعفن کہ ہر شخص ناقابل برداشت اذیت سے دوچار ہے۔ لیکن کیا کرے، مجبور و بے دست و پا ہے۔ لاشوں کو شانے پر لے کر بھی نہیں چل سکتا کہ لوگ کیا کہیں گے؟"

(ص ۲۹ - ۲۸)

رضوان احمد کے افسانوں میں عہد حاضر کی سسکیاں، دم توڑتی تہذیب، اقتدار کی کشمکش، ٹوٹتے بکھرتے سماجی رشتے، اور سیاسی بازی گری کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں موجود ہے۔ "تلاش ہما"، "بنات النعش"، "شہر ستم"، "کہانی کا قتل"، اور "کرو نو" اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب کی کتابت و طباعت مناسب ہے۔ گٹ اپ بھی
[illegible]

کتاب: **سلگتے خیموں کا شہر**

افسانہ نگار: فخرالدین عارفی

صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۱۵ روپے

پتہ: محمد پور شاہ گنج - پٹنہ ۶

مبصر: سید احمد قادری

فخرالدین عارفی کا شمار آٹھویں دہائی کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے فکرو احساس، اسلوب، آورڈ اور عصری حسیت سے اُردو افسانہ نگاری کو ایک نئی جہت دی ہے۔

عارفی کے اس زیرِ تبصرہ پہلے افسانوی مجموعہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عارفی نے حیات و کائنات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ خود کلامی کی تکنیک پر عارفی کے افسانے زندگی کے مختلف حادثات اور واقعات کو بڑے خوبصورت اور صداقت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان میں عصرِ حاضر کی بے چہرگی، خوف، دہشت، بیزاری، محرومی، یاس، بے کیفی، فرار، بے وفائی، بے حسی سب کچھ ہے۔ اور ان حالات سے افسانہ نگار نبرد آزما ہونے کی جرات بھی کیا ہے:

"لیکن اے اہلِ شہر کی بے حسی کی انتہا کے لئے کہ آج تک کسی نے اس شہر میں لگی ہوئی آگ اور دہکتی ہوئی چتا کو سرد کرنے کی بات نہیں سوچی ہے اور شاید کہ میں پہلا اور واحد آدمی ہوں جو اس شہر میں لگی ہوئی آگ پر قابو پانے کی بات کر رہا ہوں۔" (ص ۱۹)

عارفی کے افسانوں کا میڈیم بیانیہ ہے جس میں قاری پوری طرح ڈوب جاتا ہے۔ علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا بھی خوبصورت استعمال عارفی کے افسانوں میں موجود ہے۔ جو ابہام اور ترسیل کا مسئلہ پیدا کرنے کے بجائے افسانے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں:

"پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے گھڑی کی ساری سوئیاں ایک ساتھ تیزی سے گردش کرنے لگے ہوں۔" (ص)

"سلگتے خیموں کا شہر" میں موجود افسانوں سے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی، احمد یوسف، ڈاکٹر علیم اللہ حالی اور شفیع مشہدی کی آرا شاملِ کتاب ہیں۔ جن میں مبالغہ آرائی کم اور حقیقت آمیزی زیادہ ہے۔

عارفی کے بعض افسانوں میں فلسفہ کا گمان زیادہ ہونے لگتا ہے۔ جس سے افسانہ جس ہلکی ہلکی فضا کا متقاضی ہے اس کی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ایک بوجھل فضا سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ بات بس چند افسانوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

عارفی کا یہ مجموعہ سنجیدہ ادب نواز حضرات کے درمیان مقبول ہوگا اسکا ہمیں یقین ہے۔

کتاب کی کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق قابلِ تعریف ہے اس لحاظ سے قیمت کم ہے۔

(سید احمد قادری)

کتاب: **اُردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی**

مصنف: ڈاکٹر شکیل احمد

ضخامت: ۲۴۴ - قیمت: ۵۰ روپے

تقسیم کار: نصرت پبلیشرز، حیدری مارکیٹ - امین آباد - لکھنؤ

مبصر: سید احمد قادری

ڈاکٹر شکیل احمد نے اپنے اس طویل تحقیقی مقالہ "اُردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی" کو فخرالدین

حمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے کتابی شکل دیدی
، جس پر انہیں گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری
یض کی گئی ہے۔

اس کتاب میں سات ابواب ہیں اور ہر باب جامع اور مبسوط
۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کے سامنے اپنے تحقیقی
ر کو لکھتے وقت صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا ہی
مود نہ تھا بلکہ اپنی تحقیق کی عرق ریزی سے اردو زبان و ادب
پہ دینے، کچھ اضافہ کرنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

کتاب کے ساتوں ابواب:

۱۔ اردو افسانہ، تعمیر و تشکیل، اردو افسانہ، مقصد و منہاج
۲۔ سماجی بیداری
۳۔ خواتین کے مسائل، ازدواجی زندگی میں۔
۴۔ خواتین کے مسائل، معاشرتی زندگی میں
۵۔ خواتین اور اخلاقی پستی کے مسائل
۶۔ سماجی نابرابری اور حیوت حیات کے مسائل
۷۔ معاشی مسائل کی عکاسی

ے مطالعہ سے غیر منقسم ہندوستان کے مختلف عہد اور ادوار کے
ماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی تبدیلیوں
اندازہ ہوتا ہے جسے ڈاکٹر شکیل احمد بڑی خوبصورتی کے
ساتھ اپنے خوبصورت اسلوب اور منفرد لب و لہجہ میں پیش
کیا ہے

"مغربی تہذیب کے اثرات خاندان کے نظام پر
پڑے۔ روزمرہ کے معمولات میں عیاں پن پیدا
ہوا۔ آہستہ آہستہ ادب اور احترام کا مشرقی
تصور، آزادی اور خود پسندی میں تبدیل
ہوتا گیا۔ نئی نسل نئے نئے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔
ان کے سامنے مغربی طرز کے وہ خاندان بھی تھے
جن میں افراد کو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔"
(ص ۱۶۳)

زیر نظر کتاب میں پلے دم، سلطان حیدر جوش، اعظم
کریوی، ل۔ احمد، پریم چند، راشد الخیری، علی عباس
حسینی، حجاب امتیاز علی، عصمت، نیاز فتح پوری، مجنوں
گورکھپوری، بیدی، احمد ندیم قاسمی، [illegible]، احمد
علی، عابد علی عابد، عزیز احمد، اوپندر ناتھ اشک، اختر
انصاری، منٹو، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی،
اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، اور افسانہ نگاروں جیسے شامل
افسانہ نگاروں کے افسانوں میں جن سماجی مسائل کی
کا جائزہ ڈاکٹر شکیل احمد نے بڑی محنت اور خوبصورتی
سے لیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر موصوف نے تقریباً ۱۱۷
کتابوں اور ۲۰ اہم رسالوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زیر نظر کتاب مواد اور معیار دونوں
اعتبار سے اہم اور منفرد ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد یقیناً
لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک اہم موضوع کا
انتخاب کیا اور اپنی محنت اور لگن سے اس موضوع کے
ساتھ پورا پورا انصاف کرکے اردو ادب میں اضافہ کیا
ہے۔

کتاب کی خوبصورتی بھی قابلِ دید ہے۔

بقیہ شہرِ خیال

ہے۔ کہیں اندھیرے کا ذکر ہے کہیں اجالے کا۔ کہانی پڑھ کے
پر کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سویرا اور شام میں
کوئی فرق نہیں ہے۔ جگہ جگہ قواعد کی غلطیاں ہیں۔ حسن
نجمی سکندر پوری نے اس میں بھی مایوس نہیں کیا ہے۔
ترقی پسند ادبی تحریک پر اچھا خاصہ مضمون ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے
دن بدن سہیل کے گرتے ہوئے معیار پر افسوس ہے مجھے
یقین ہے کہ مدیر اس خط کو سہیل کی قریبی اشاعت میں
جگہ دیکر شکریہ کا موقع دیں گے اور اپنی صحافتی ذمہ داری
نبھائیں گے تاکہ اس خط کو پڑھ کر لوگ سدھار کی طرف
مائل ہوں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ [illegible]
میں کافی تبدیلی نظر آئے گی اور "گیارہواں بچہ" جیسی کہانی
سے پرہیز کیا جائے گا۔ عبدالمنان۔ اصغر علی انصاری۔
سرفراز نواز۔ اسلام پور۔ مغل سرائے

نئے خیال

قارئین کے خطوط

سہیل برابر مل رہا ہے۔ اگست کا شمارہ ملا جس
میں میرا مضمون "جواب گریزاں" شامل ہے۔ کتابت کی
غلطیاں کئی جگہ رہ گئی ہیں۔ مثلاً "پراچین سنسکرتوں" کی جگہ
"پراچین سنسکرت"؛ "فلاطون کے مکالمات" کے بجائے
"مقالات"؛ "مسی سیرو" کے بجائے "سیرو" وغیرہ وغیرہ۔
اسی پرچے میں مشتاق شبنم صاحب کا مضمون "اردو کی مروجہ
بحر" نظر سے گزرا۔ اردو کی عربی بحر کے بارے میں تو ان
کا دفاع مجھے معقول لگا مگر ایک تو تمہید نفس مضمون سے
الگ ہو گئی ہے، دوسرے ایک دو باتیں اس میں ایسی
کہی گئی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مثلاً موصوف
نے فرمایا کہ "انگریزی زبان میں سب سے زیادہ اردو،
فارسی، عربی کے الفاظ شامل ہیں۔" اگر ہم کسی ایسی انگریزی
لغت کا مطالعہ کریں جس میں الفاظ کا اشتقاق بھی دیا گیا
ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں سب سے زیادہ الفاظ وہ
ہیں جو چند یورپی خاندان کی قدیم زبانوں مثلاً یونانی،
اور لاطینی وغیرہ سے آئے ہیں۔ مگر انگریزی میں عربی کے بہت
سے الفاظ ایسے ہیں جو اصلاً عربی یا سامی زبانوں سے
آئے ہیں مگر عام اور غلط تحقیق کی وجہ سے انہیں کسی دوسری
زبان کا مانا گیا ہے۔ انگریزی میں عربی الفاظ کی بہتات
حیرت انگیز ہے ۔۔۔ صاحب مضمون کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے
کہ انگریزی میں عربی اور فارسی کے الفاظ اردو کے وسیلے
سے داخل ہوئے ہیں۔ اس بیان کے لئے موصوف نے مثال کے
طور پر جن الفاظ کی فہرست دی ہے ان میں ایک لفظ بھی
ایسا نہیں ہے جو انگریزی میں اردو کے ذریعے پہنچا ہو۔
شتب عربی کے وہ الفاظ ہیں جو ہندوستان میں انگریزوں
کی آمد سے صدیوں پہلے ان کی زبانوں میں یا تو یورپ کی
قدیم و جدید زبانوں مثلاً یونانی، لاطینی، جرمن، فرانسیسی
وغیرہ سے ہوتے ہوئے پہنچ سکتے یا صلیبی محاربات
Crusades کے دور میں اور اسپین پر مسلمانوں کی حکومت
قائم ہونے کے بعد داخل ہوئے تھے۔ مگر خالص اردو کے
الفاظ انگریزی میں بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔
ان میں زیادہ تر الفاظ وہ ہیں جو انگریزوں نے ہندوستان میں
اپنا کام چلانے کے لئے استعمال کرنا شروع کئے۔ خود انگلستان
میں بولی اور لکھی جانے والی انگریزی میں یہ عام نہ ہو سکے
جیسے "پنکھا" اور "بندوبست" وغیرہ۔ انگریزی اردو میں
لین دین کا معاملہ یکطرفہ ہی رہا۔ اردو نے جتنے زیادہ
انگریزی الفاظ اپنائے انگریزی نے اردو کے الفاظ اتنے
ہی کم لئے۔ فطری بات تھی۔ وہ حاکم تھے ہم محکوم ---

علی عباس عزل (بمبئی)

مئی کا پرچہ کافی دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔ اقبال کے
سلسلے میں جو کچھ بھی نثر کی صورت میں آیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر
تارا چرن رستوگی، نذیر احمد خان اور اشتیاق انجینیر
کے مضامین پڑھنے کے لائق ہیں۔ خصوصی طور پر اشتیاق انجینیر
کا مضمون، "قال سلیمان" کافی معلوماتی ہیں۔ غزلیں بیشتر
صرف سیدہ شادی مزاج کی غزل کے علاوہ اور سب کی سب بیکار
ہیں۔ کسی کسی غزل کا مصرعہ بھی بحر میں نہیں ہے۔ اشعار
کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے کافی کوشش کے باوجود کامیابی
نہیں ملی۔ وحید بخاری کا افسانہ "جوگن" ہے تو چھوٹا لیکن
برگد کے پیڑ کی طرح گھنا ہے۔ اس کے بعد نسیم بھا رتی کی
جلوہ گری کا دور شروع ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ
افسانہ نگار کا پہلا افسانہ ہے جو بغیر اصلاح کے شائع ہوا ہے۔
افسانے کے سلسلے میں جو بھی کہا گیا ہے اس میں انتہائی بعد ہے

تاریخ

- **تاریخ** کہتے ہیں اس اہم واقعہ یا حادثہ کو جس کے ظہور پذیر ہونے سے مثال قائم ہوجاتی ہے اور وہ زندۂ جاوید بن جاتے ہیں۔ مثلاً غدر ۱۸۵۷ء، عالم گیر جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء یا تقسیم ملک ۱۹۴۷ء۔
- **تاریخ** اسے بھی کہتے ہیں جو روزانہ بدلتی ہے.......... جیسے آج نومبر کی ۱۵ تاریخ ہے۔
- **تاریخ** وہ بھی کہلاتی ہے۔ جس دن عدالت میں پیشی ہو مثلاً آج فلاں مقدمہ کی تاریخ ہے۔
- **تاریخ** وہ بھی ہے جو بخشی جنتری میں درج ہوتی ہے۔ مثلاً ۱۹۰۲ء میں ۲ رمضان المبارک کون سا ہجری سنہ تھا، انگریزی مہینہ کی کیا تاریخ تھی یا ۱۹۲۵ء میں چاند/سورج گرہن کس تاریخ کو تھا۔ یا ۱۹۸۶ء میں ۹ شوال کو شادی کے لئے سعد تاریخ ہے یا نہیں۔ یا بارہ وفات انگریزی کس تاریخ کو ہے۔

یہی تاریخ، اصل تاریخ ہے۔ ایسی ہی صحیح اور مستند تاریخ کے لئے تاریخ ساز بخشی جنتری ہمیشہ اپنے پاس رکھئے، جو سو برس پہلے بھی اتنی ہی کار آمد تھی جتنی اب سے سو برس بعد ہوگی۔

اردو لیجئے یا ہندی — جنتری لیجئے تو بخشی

بخشی جنتری سنہ ۱۹۸۶ء

اپنے مقامی کتب فروشوں سے طلب کریں یا نمونہ کیلئے ایک روپیہ کا ڈاک ٹکٹ روانہ کریں

منیجر بخشی جنتری ۳۲/۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۴۵

POST BOX NO. 12345

Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 1573

FEBRUARY-1986

Rs. 2

★ ★ ★

موڈی
دھلائی کا
صابن
WASHING SOAP
پنجاب سوپ فیکٹری

روغن بینظیر
قبل از وقت بالوں کا گرنا
اور سفید ہو جانا نیز درد سر اور
دماغی کمزوری کیلئے بہترین تیل
ہے، بالوں کی جڑوں کو
مضبوط کرتا ہے اور نئے
بال نکلنے اور بڑھنے لگتے
ہیں، اس کے استعمال سے اچھی اور گہری
نیند آتی ہے اور دماغ کو تروتازگی بخشتا ہے۔
روغن بینظیر دیسی جڑی بوٹیوں
سے طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

TEKKA
ROSE WATER
عطر مجموعہ
TEKKA
KEORA WATER
عطر فردوس
عرق کیوڑہ نمبر ۲۰۰۰
عرق گلاب نمبر ۵۰۰۰
Show Room-GAZIPUR STAR CHEMICAL WORKS
P-11 NEW HOWRAH BRIDGE APPROACH Rd. CALCUTTA

[نمود]

جشنِ جمہور

۲۶ جنوری کا دن ہمارے ملک کے لئے خاص اہمیت کا دن ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں اسی دن آزاد ہندوستان نے اپنا آئین نافذ ہوا جس کے مطابق ہمارا ملک جمہوریہ ہندوستان کہلایا۔ اس لئے یہ دن ہر سال یوم جمہوریہ کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ لیکن آزاد ہندوستان کے آئین کے نافذ ہونے کے ۳۶ سال بعد بھی حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے عام لوگ غریبی اور بدحالی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وقت وقت پر سرکاری پالیسیوں میں جو تبدیلی ہوتی ہے اس سے معاشی ترقی نہیں ہو پاتی، غریبی اور بے روزگاری دور نہیں ہو پا رہی ہے۔ علاقائی تعصب بڑھ رہا ہے۔ فرقہ پرست اور الگاؤوادی طاقتوں کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ پنجاب اور آسام بھی اس سے ان طاقتوں کو دھکا ضرور لگا ہے لیکن ان کی خطرناک سازش میں کمی نہیں ہوئی ہے۔ قیمتوں کا بڑھنا جاری ہے۔ روپے کی قیمت گھٹ کر صرف ۱۲ پیسے رہ گئی ہے۔ یہی حال بے روزگاری کا ہے۔ رجسٹرڈ بے روزگاروں کی تعداد قریب ڈھائی کروڑ ہو گئی ہے۔

مختلف مسائل کو سلجھانے کے لئے سرکار غیر جمہوری طریقہ اور پالیسی اپناتی ہے جس سے سماجی اور سیاسی تناؤ پیدا ہوتا ہے اور اکثر ملک کی ایکتا اور آزادی پر خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں سامراج وادی طاقتوں کو ہمارے ملک میں بدامنی پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔

[illegible] جنگ اور سامراج واد کے خلاف، حکومت کی نئی معاشی پالیسی اور غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ سمجھوتے [illegible] کے خلاف، نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف، مرکز اور صوبے کے تعلقات کو قائم کرنے کے لئے، سیاست اور تعلیم سے مذہب کو الگ کرنے کے لئے، الیکشن کے طریقوں میں تبدیلی لانے کے لئے، بنیادی حقوق اور شہری آزادی کی حفاظت کے لئے، حد بندی سے فاضل زمین کا بٹوارہ، کھیت مزدوروں کے لئے واجب اجرت اور کھیتوں [illegible] دلانے کے، محنت کے مطابق تنخواہ اور کام کو بنیادی حق بنانے کے لئے ہم تمام شہریوں کو [illegible] ہوگا۔

[illegible] یوم جمہوریہ کے موقع پر ہم تمام ہندوستانی جمہوریہ کو جسے آئین میں [illegible] جمہوریہ کہا [illegible] لانے کی قسم کھائیں گے۔

جمیل منظر شہسواری
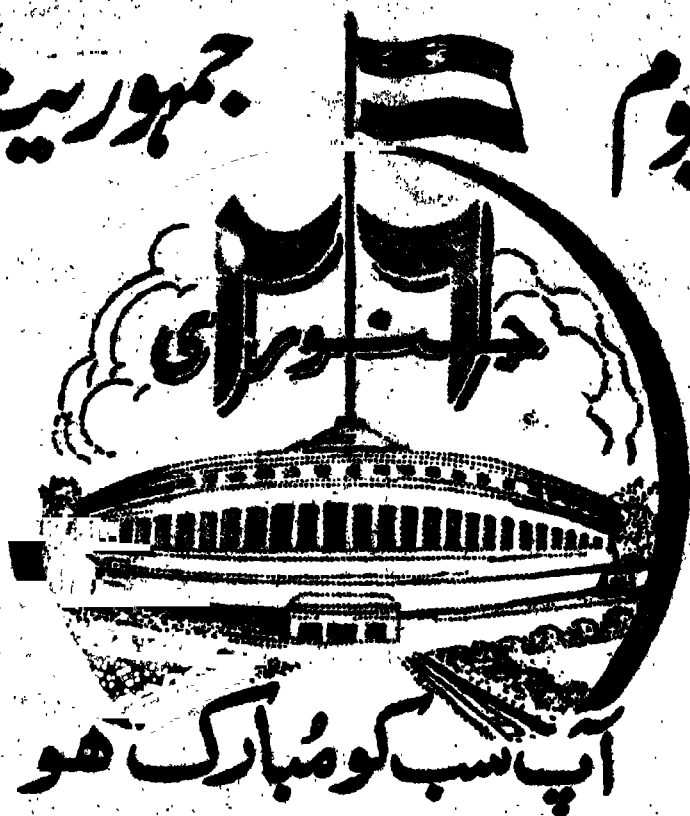
یوم جمہوریت
۲۶ جنوری
آپ سب کو مبارک ہو
برسوں سے آزمائی ہوئی مشہور عام
گھریلو دوا
ہند تیل
جسمانی درد۔ چوٹ۔ موچ۔ زخم۔ جلنے
کے لئے سب سے بہترین علاج
ہند۔ سی۔ سی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن۔ یوپی

[illegible]
22/2 - 939 ذاکر نگر۔ نئی دہلی

عروضیات اور شعریات کے مسائل پر

پروفیسر عنوان چشتی سے گفتگو

اُردو کے تنقید کا بیشتر حصہ شاعری کی تنقید سے متعلق ہے۔ نثر کی تنقید پر اس سے کم توجہ کی گئی ہے۔ اور عروضی مسائل پر تو نہیں کے برابر کام ہوا ہے۔ چنانچہ جب میں نے پروفیسر عنوان چشتی صاحب کی نئی کتاب "عروضی اور فنی مسائل" کا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہونچا کہ یہ تازہ تصنیف جو [illegible] ابواب پر مشتمل ہے اُردو کے تنقیدی سرمائے میں عموماً اور شعریات اور عروضیات کی تنقید میں خصوصاً اپنی انفرادیت کے باعث اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ان مضامین میں شاعری کی تنقید عام ڈگر کی نہیں ہے۔ مثلاً غالب کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ یا اصغر کا شعری مرتبہ [illegible] کے [illegible] دیوانِ غالب کا عروضی تجزیہ! [illegible] عروضی اور لسانی امکانات! رباعی کے اصول اور نئے [illegible] اصغر کی شاعری کا عروضی تجزیہ! جدید اردو [illegible] عروضی تجربے! نثری اور شعری آہنگ! عروضی تجربے کی [illegible] ایک شعر ایک [illegible] [illegible] تنقیدی جائزہ! غالب اور مسائل [illegible] [illegible] یہ عنوانات [illegible] [illegible] کتاب پر تبصرہ [illegible] [illegible]

لفظ کی تجزیہ سے ہی تبصرہ تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک روایتی انداز ملتا ہے۔ میں ہمیشہ نئے طور پر اور عام ڈگر سے ہٹ کر سوچتا ہوں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے بجائے خود صاحبِ کتاب سے گفتگو کر لیا جائے تاکہ اس کتاب کی تحقیقات اور مضمرات کا ایک خاکہ سامنے آ جائے۔ میں نے پروفیسر عنوان چشتی صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ (جس کا موقع مجھے تقریباً ان کے گھر کے پانچ چکر لگانے کے بعد ملا تھا) کہنے لگے — آپ تبصرہ کر دیجئے یا زیادہ سے زیادہ ایک مضمون لکھ سکتے ہیں۔ گریہ کیا کہ آپ مجھ سے ہی میری تصنیف پر گفتگو کریں۔

میں نے کہا دراصل میرے ذہن میں چند سوالات مطالعۂ کتاب کے بعد ہی پیدا ہو رہے ہیں۔ جن کے جواب آپ ہی دے سکتے ہیں۔ آپ کوئی وقت مجھے عنایت کر دیں۔

پروفیسر عنوان چشتی صاحب نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگے: آپ جمعہ کا دن رکھ لیجئے [illegible] بجے میرے غریب خانہ پر آجایئے۔

شکریہ —

جمعہ کی صبح [illegible] گھر سے باہر آیا [illegible] [illegible] گھر کا گیٹ [illegible] کے [illegible] میں [illegible]

تھا۔ میں تیار ہو کر اس دھند سے گزرتا ہوا ڈاکٹر صاحب
کے دولت کدہ پر پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہی دروازہ
کھولا۔

سلام و دعا ہوئی، کلام باقی تھا۔ صاف ستھرا اور سادگی
کے ساتھ سجا ہوا ڈرائنگ روم۔ دریچے کے پاس بڑے دیوان
نما صوفے پر ڈاکٹر صاحب گرم چادر لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے۔
میں وہیں صوفے پر کاغذ قلم لے کر انٹرویو کا ماحول بنانے لگا۔
میں ان کی کتاب "عروضی اور فنی مسائل" اپنے ساتھ لے
گیا تھا تاکہ سوالات میں آسانی ہو۔ جھٹ چائے اور اس کے
ساتھ "والے" بھی آ گئی۔ سرد موسم میں گرم چائے کا ایک
گھونٹ لیتے ہوئے میں نے پروفیسر عنوان چشتی صاحب کے
سامنے پہلا سوال رکھ دیا۔

سوال: اس دور میں جبکہ شاعروں اور نقادوں کی نگاہ
میں لسانی، عروضی اور فنی پہلو کی حیثیت ثانوی ہے
آپ نے ان مسائل پر توجہ کی اور ایک اہم تحقیقی کتاب
شائع کی۔ آپ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیوں کر آیا۔؟

جواب: (ڈاکٹر صاحب انگلیاں بالوں میں پروتے ہوئے بڑی
سنجیدگی سے گویا ہوئے) اس میں شک نہیں کہ کچھ تو مغربی
تنقید کے زیر اثر اور کچھ سہل انگاری کی بنیاد پر اس دور
میں عروضی، فنی اور لسانی مسائل پر توجہ نہیں دی جا رہی
ہے۔ پھر بھی اس دور میں پروفیسر مسعود حسین خاں،
پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر سعید حسن خاں اور دوسرے
بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے اس طرف توجہ کی ہے۔
شمس الرحمن فاروقی نے "عروضی آہنگ اور بیان" نیز
ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے "ہندی اور اردو عروض کے
جدید اوزان کا تقابلی مطالعہ" شائع کر کے عروض اور فنی
مسائل کے بند دروازے پر دستک دی ہے۔ چونکہ
ذہنی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں شاعری
کے معنوی پہلو کے ساتھ اس کی زبان، اسلوب اور
ہیئت کے جمال کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لئے
مجھے ابتدا سے ہی ان مسائل سے دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ
میں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں مغربی افکار و انداز
کے ساتھ مشرقی شعریات کے اصولوں سے بھی بھرپور
استفادہ کیا ہے۔ اور شاعری کی قدر شناسی میں
ان اصولوں کا اطلاق بھی کیا ہے۔ زیر نظر کتاب "عروضی
اور فنی مسائل" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

سوال: آپ کی کتاب کے نام میں دو الفاظ بنیادی حیثیت
رکھتے ہیں۔ ایک عروضی اور دوسرا فنی۔ عروضی مسائل
اور فنی مسائل سے کیا مراد ہے۔ اور آپ نے کون کون
سے مسائل کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا ہے؟

(چائے کا کپ ڈاکٹر صاحب نے میز پر رکھا اور فرمایا)

جواب: آہنگ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زبان کا آہنگ،
جس کو عام طور پر نثری آہنگ کہا جا سکتا ہے۔ اور
دوسرا شعری آہنگ، جو رکن کی تکرار اور ترتیب
سے پیدا ہوتا ہے اور جس کو اوزان و بحور کا آہنگ
کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اوزان و بحور سے متعلق مسائل
کو عروضی مسائل کہا ہے۔ اسی طرح فن سے مراد فن شعر
یا شعریات، یعنی عروض کے علاوہ وہ تمام مسائل اور وسائل
جو شعریات کے ضمن میں آتے ہیں، فنی مسائل ہیں۔ چونکہ
شاعری خاص طور پر غزل کی جمالیات میں اس کی ہیئت
کا حسن خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس ضمن میں
زبان، اسلوب، تکنیک اور ہیئت کا فنکارانہ استعمال
خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عروض اور فنی مسائل کا ادراک
شاعر اور نقاد کے اسی شعور کو خاص طور پر جلا بخشتا ہے۔
اب میں آپ کے جواب کے دوسرے حصے کی طرف چلتا
ہوں۔ میں نے اپنی کتاب "عروض اور فنی مسائل" میں دونوں
قسم کے مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ عروضی مسائل میں
رباعی کے اصول اور نئے تجربات، "دیوان غالب کا عروضی
تجزیہ"، اصغر کی شاعری کا عروضی تجزیہ، [illegible] عروضی تجربہ
کی ایک عبرتناک مثال، [illegible] اردو شعر کا آہنگ [illegible]
اردو غزل میں عروضی تجربے اور ایک شعر ایک بحر دو
اوزان شامل ہیں۔ اس کتاب میں ایک طرف عروض
کے [illegible] اصولوں کا تعین کر کے اردو شاعری پر
ان کا اطلاق کیا گیا ہے [illegible] چونکا دینے والے

[illegible] رباعی کے اوزان کا دائرہ اخرم اور اخرب
[illegible] رباعی کے سلسلے میں غلط فہمی پیدا کی ہے۔ اس
[illegible] دائروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رباعی کے جملہ اوزان
[illegible] ہزج سے ہی ماخوذ ہیں۔ یہ اوزان ۲۴ نہیں بلکہ ۳۶
[illegible] اب میں میں نے بحث بھی اٹھائی ہے کہ اگرچہ زحافات
[illegible] تسکین اوسط کا عمل ایک ہی ہے۔ لیکن اوزانِ رباعی
[illegible] تخلیق کا عمل ہوتا ہے۔ تسکین اوسط کا نہیں۔ اگر اس
[illegible] کے نتائج پر دھیان دیا جائے تو یہ بحث رباعی کے
اوزان اور اصولوں کے ضمن میں تحقیقِ حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔
[illegible] عروض کے نئے امکانات کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وہ
لوگ جو عروض کو ایک جامد شے تصور کرتے ہیں، ان کو اپنے
[illegible] نظرِ ثانی کی دعوت دیتا ہے۔ نجم الغنی کے
ذکر کردہ اوزانِ رباعی کی بات۔ سو میں بے تکلف عرض کر دوں
نجم الغنی نے بحر الفصاحت میں روایتی عروض کو پیش کیا ہے۔
انھوں نے اپنی کتاب میں دادِ تحقیق نہیں دی ہے۔ انھوں نے
بنیادی طور پر ان ۲۴ اوزان کا ذکر کیا ہے جو سراسر غلط ہے
اور زحافات کے ضمن میں ۹ زحافات کا ذکر کیا ہے جو سراسر
غلط ہے۔ انھوں نے سینکڑوں اوزان کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی
محلِ نظر ہے۔

سوال: آپ نے اردو عروض کے ساتھ ہندی چھندوں پر بھی کام
کیا ہے۔ "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" اور
"اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں اردو
عروض کے ساتھ ہندی چھندوں کا ذکر [illegible] "[illegible]
اور فنی مسائل" میں بھی آپ نے اردو غزل میں عروضی
تجربے" کے باب میں ہندی چھندوں کا ذکر کیا ہے۔ کیا
اردو میں دوہا چھند کے علاوہ اور بھی چھند ملتے ہیں؟
جواب: میں نے اردو عروض اور ہندی پنگل کا تقابلی
مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اردو میں
ہندی کے ایسے چھند مستعمل ہیں جن کا آہنگ متبادل

اور ہموار ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اردو میں صرف دوہا چھند
ملتا ہے۔ میں نے دوہا چھند کے علاوہ اردو میں
سار چھند، سرسی چھند اور برکھنگا چھند کی نشاندہی
کی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھندوں کا پتہ
لگایا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ
پاکستان کے جمیل الدین عالی (جو ایک اچھے شاعر ہیں)
نے سرسی اور سار چھند کو دوہا کہا ہے۔ جو اصولاً غلط
ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندوستانی
شاعروں سے زیادہ ہندی چھندوں کا استعمال پاکستانی
شاعروں نے کیا ہے۔ یہ مشترکہ قومی تہذیب کی فتح ہے۔
اور اس بات کی تکذیب کرتی ہے کہ ہندوستان
میں ہندو کلچر ہے اور پاکستان میں اسلامی کلچر ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں مشترکہ قومی تہذیب
کی جلوہ گری ہے۔ جس کو ہندوستانی اور اسلامی
دونوں رنگوں میں سنوارا اور سجایا ہے اور اس میں
مغربی تہذیب و تمدن کا آہنگ بھی شامل ہے۔
برسبیلِ تذکرہ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ میں نے جدید
اردو غزل میں عروضی تجربے کے ضمن میں ایک طرف
ان تجربوں کی نشاندہی کی ہے، جو روایتی عروض کے
دائرے میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بانی، شمس
الرحمان فاروقی اور بعض دوسرے شاعروں نے اہم
تجربے کیے ہیں۔ اور دوسری طرف نثری غزل اور آزاد
غزل کا عروضیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔ اور
اس کے ساتھ غالباً پہلی بار دمن فرودنی کے حوالے
اردو میں ہندی چھندوں کی نشاندہی کی ہے۔ اردو
کریم صاحب یہ چیزیں بتانے سے زیادہ مطالعے کا
تقاضا کرتی ہیں۔
سوال: آپ نے اپنی کتاب میں غالب اور اقبال کے کلام کا
عروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان تجربوں سے آپ نے کیا

نتائج اخذ کئے ہیں ؟

جواب : جی ہاں ! میں نے دیوانِ غالب کا عروضی تجزیہ اور اصغر کی شاعری کا عروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہوا یوں کہ میری نگاہ سے صفیر النسا بیگم کی کتاب غزلیاتِ غالب کا عروضی تجزیہ گزری۔ مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ اس کتاب میں بہت سی عروضی غلطیاں ہیں جو قاری کو گمراہ کرتی ہیں۔ اس خیال سے ایک مقالہ میں نے اس کتاب کی غلطیوں پر سپردِ قلم کیا۔ یہ ایک منفی کام تھا۔ اس لئے میں نے دیوانِ غالب کا عروضی تجزیہ بھی کردیا۔ جس کے دلچسپ نتیجے برآمد ہوئے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ سامنے آئی کہ غالب کا عروضی وجدان اگرچہ سخت تھا مگر انھوں نے اپنی شاعری میں تین قسم کی عروضی غلطیاں کی ہیں (۱) ان کی شاعری میں شکستِ ناروا ملتا ہے (۲) انھوں نے سقوطِ حروفِ علت کو روا رکھا ہے (۳) انھوں نے غلط رکن یا غلط زحافت کا استعمال کیا ہے۔ اگر اس بات کو تعلّی نہ سمجھی جائے تو کہوں کہ میں نے غالب اور اصغر کے کلام کا عروضی تجزیہ کرتے ہوئے پہلی بار اس بحث کو اٹھایا ہے کہ ان دونوں شاعروں نے اپنے کلام میں محض لاعلمی کی بنیاد پر غلط رکن اور غلط زحافت کا استعمال کیا ہے۔ اس تجزیے سے نہ صرف عروضی غلطیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بلکہ [illegible] سامنے آئی کہ غالب نے [illegible] بحروں [illegible] اصغر نے سات بحروں [illegible] شاعری کی ہے۔ غالب کا تین چوتھائی کلام [illegible] مضارع، ہزج اور مجتث میں ہے [illegible] اصغر کا بیشتر کلام [illegible] مضارع [illegible] ہے۔ ان بحروں کا آہنگ سڈول [illegible] ہے۔ جو تفکر آمیز جذبے یا [illegible]

ہے۔ چنانچہ غالب اور اصغر کو اپنے فکر و جذبے کے اظہار میں یہ اوزان و بحور بہت راس آئے ہیں۔

(ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ہے)

سوال : اب آخری سوال اصلاحِ سخن کے سلسلے میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک اصلاحِ سخن کی روایت پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ غالباً عروض اور فنی مسائل میں آپ نے اس موضوع پر پہلی بار تفصیل سے لکھا ہے۔ کیا اصلاحِ سخن کی روایت نے اردو شاعری کو متاثر کیا ہے ؟ اس سلسلے میں اس نے کس طرح کا کردار ادا کیا ہے ؟

جواب : اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کو اصلاحِ سخن کی روایت نے بہت متاثر کیا ہے۔ داخلی سطح پر بھی اور خارجی سطح پر بھی۔ داخلی سطح پر استاد شاعر کے خیال کی اصلاح کرتا ہے۔ جذبے کی صحت و صداقت پر زور دیتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر استاد اپنے شاگرد کے کلام پر خارجی طور پر اصلاح کرتا ہے جس میں زبان، بیان، [illegible] اور [illegible] شامل ہے۔ چونکہ غزل کی جمالیات میں اس کی ہیئت کی صحت [illegible] کی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے عروضی [illegible] اور قواعد [illegible] نظر سے اس پر غور کیا جاتا ہے۔ اصلاحِ سخن کی روایت نے شاعری کی زبان اور اندازِ بیان کو بہتر [illegible] ہے۔ عروضیات اور شعریات کا [illegible] اس دور میں استادی، شاگردی کی روایت کمزور ہو گئی ہے۔ مغربی تنقید کے زیرِ اثر مشرقی شعریات [illegible] کی جا رہی ہے۔ اس لئے اس [illegible] شاعروں کے یہاں [illegible] کی وجہ سے شاعری کی ہیئت کا حسن [illegible]

عظیم فیروزآبادی

جگن ناتھ آزاد بحیثیت سوانح نگار اقبال

پروفیسر ضیاء الانصاری صاحب کی رائے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو چھوڑ کر ہندوستان میں تین اقبالیے ہیں۔ آل احمد سرور، سردار جعفری، اور جگن ناتھ آزاد۔ ان تینوں اقبالیاتیوں میں کمیت کے لحاظ سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پلہ بھاری ہے۔ اور کیفیت کے لحاظ سے معاملہ شاید الٹا ہے۔ اب تک پینتیس کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ جن میں بیشتر کا موضوع صرف اقبالیات ہے۔ ایک ادیب اور دانشور کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دئیے ہیں بلکہ بیرونی ممالک مثلاً برطانیہ، روس، برما، مصر وغیرہ کا بھی دورہ کیا ہے۔ ہند و پاک کے معروف جریدوں کا کوئی اقبال نمبر یا اقبال پر منتخب مضامین کا کوئی ایسا مجموعہ شاید ہی دیکھنے میں آئے جو ان کے افکار سے مزین نہ ہو۔ اقبال کے مفسر یا سوانح نگار کی حیثیت سے عام طور پر ان کی خدمات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ چند سال قبل صدر مملکت پاکستان نے انہیں اقبال میڈل سے نوازا تھا۔ اور سب سے بڑا اعزاز جو انہیں وہاں حاصل ہوا تھا وہ تھا اقبال منزل سیالکوٹ میں ہند و پاک کے مشترکہ مشاعرہ کی صدارت۔ جو غیر معمولی دانشوروں کے عظیم الشان اجتماع میں اپنے محترم استاذ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے اصرار پر انہیں قبول کرنا پڑی۔ یہ وہ اعزاز ہے پروفیسر موصوف اس پر جتنا بھی فخر کریں بہت کم ہے۔ آزاد صاحب ہند و پاک کے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے اقبال کی عظمت کا مینار بلند کرنے کے لیے اپنا زور قلم صرف کیا ہے۔ حال ہی میں ([illegible]) "محمد اقبال" کے نام سے انہوں نے علامہ اقبال کی ایک ادبی سوانح عمری سپرد قلم کی ہے۔ اقبال پر یہ ان کی دسویں تصنیف ہے۔ اس کے بعد کا ارادہ اقبال کی مبسوط سوانح عمری لکھنے کا ہے۔ ذیل میں "محمد اقبال" اور ان کے دوسرے متعلق مضامین کا تجزیہ کر کے ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں اقبال کے خاندان کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کا تعلق کشمیر کے ایک برہمن خاندان سے تھا [illegible] گیا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ راجہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام محمد صالح رکھ لیا تھا۔ اقبال کو اپنی اس اصل نسب پر ناز تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے متعدد اردو اور فارسی اشعار میں کیا ہے۔ آج تک کوئی سوانح حیات یا کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں اس خاندانی روایت کو دہرایا نہ گیا ہو۔ پروفیسر

چند پشتیں اوپر جا کر اقبال کا خاندان سلسلہ ہندوستان کے نامور کول [illegible]

سپرو سے مل جاتا ہے " (محمد اقبال ص ۳۰)

یہ بغیر کسی حوالے اور ثبوت کے ہے۔

اقبال کے خاندان کی روایت جتنی عام ہے اتنی ہی (زیادہ) ناقابل اعتماد ہے۔ اس میں ہوا یہ ہے کہ ہندوستان میں جب مسلمان فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہاں کے مقامی باشندوں نے ان کے زیر اثر اسلام قبول کیا تو وہ ان مسلموں کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ جس طرح برطانیہ کے انگریز ہندوستان کے نیٹو عیسائیوں کو دیکھتے رہے ہیں۔ اس حقارت سے بچنے یا غیر ملکی حکمرانوں کی نظر میں رسوخ اور وقار حاصل کرنے کے لئے ان نو مسلموں نے بھی اپنا شجرۂ نسب ایرانیوں اور افغانوں سے ملانا شروع کر دیا۔ یہ رجحان قدیم زمانے میں عام تھا۔ اور ابھی کل کی بات ہے ۱۹۴۳ء [illegible] کا جب شعراء کا اپنا انتخاب نمبر شائع ہوا تو ایم ڈی تاثیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے طنز کیا

" اردو کے ان شاعروں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی شاعر ایسا نہیں جس کے آباؤ اجداد ہندوستانی رہے ہوں ہر ایک کا سلسلہ نسب ایران یا توران سے مل جاتا ہے "

ایک سادہ سی بات ہوا ہے۔ ان کے والد نتھو نام کے ایک غریب آدمی تھے۔ اقبال جب بیرسٹر ہو گئے اور ایک [illegible] اور عالی مقام شاعر کی حیثیت سے انہیں نواب ذوالفقار علی خان اور سر محمد شفیع جیسے رؤسا اور ذی اثر افراد کی ہم نشینی حاصل ہو گئی اور پنجاب ہائی کورٹ کے جج سے لے کر ہندوستان کے وائسرائے تک کی نظر میں انہوں نے اپنا مقام بنا لیا تو نتھو جیسے ناخواندہ اور نادار آدمی کا فرزند ہونا ان کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ایک [illegible] اور غیر معروف باپ کا بیٹا ہو کر بلند مقام اور ناموری حاصل کر لینا۔ اقبال کے لئے تحقیر نہیں فخر و مباہات کی بات تھی۔ فیض احمد فیض کے اس کھلے اعتراف سے ان کے باپ نے بکریاں چرائی تھیں۔ اور قلی گیری بھی کی تھی آج ان کی عزت لوگوں کی نظروں میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن یہ آج کی بات ہے اس عوامی ذہن کی بات ہے جو جام جم پر جام سفال کو ترجیح دینے میں فخر و مسرت محسوس کرتا ہے۔ اقبال کا زمانہ اور تھا اس زمانے میں وہی قدیم رجحان یعنی اپنے آپ کو کسی اعلیٰ خاندان سے منسلک کرنے کی روایت زندہ تھی۔ لہٰذا اقبال نے خود جستجو کر کے اور اپنے دوستوں کی مدد سے قیاس آرائی کے ذریعہ ایک ایسا شجرۂ نسب تیار کر لیا یا ان کے پرستاروں نے گڑھ لیا جس کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کی حقیقت افسانہ و افسوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ انگلینڈ سے بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں جو محمد دین فوق کو جو خط لکھا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے برہمن زادہ ہونے یا اپنے گوت سپرو ہونے کے متعلق انہیں [illegible] نہیں تھا۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

" ان شاء اللہ [illegible] میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور میں کشمیری گوت کے متعلق چند باتیں آپ سے کروں گا " ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء

(انوار اقبال)

[illegible]

جاتے۔ کہ بابا لول حج واقعی اقبال کے جد اعلیٰ تھے۔ اور پھر کئی اور کڑیوں کے غائب ہونے کے بعد [illegible] بابا صالح سے قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ بابا صالح کہاں سے آ گئے؟ محمد دین فوق اور ڈاکٹر اقبال نے تو بابا لول حج کے جد اعلیٰ ہونے کا سراغ [illegible] تھا۔ دراصل یہ مرحلہ جگن ناتھ آزاد نے عبدالمجید سالک کی رہنمائی میں طے کیا ہے۔ سالک نے ذکر اقبال میں صفحہ [illegible] پر لکھا ہے:

"بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے، علامہ کے جد اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، صالح نام پایا"

لطف کی بات یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد کے شجرہ کے بموجب بابا صالح کئی پشتوں کے اوپر بابا لول حج کے بزرگ اجداد ہیں۔ اور اکبر حیدری کشمیری کی تحقیق کے مطابق بابا صالح کا دور، بابا لول حج سے کوئی دو سو سال بعد شروع ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ شیخ جمال الدین سے پہلے علامہ کے خاندان کا رشتہ جن بزرگوں سے جوڑا جاتا ہے اس میں کوئی تاریخی صداقت نہیں ہے

جگن ناتھ آزاد نے اپنے آپ کو اس شجرہ کا مرتب بتایا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ یہ شجرہ کہاں سے اخذ کیا ہے۔ وہ محض ناقل نہیں، محقق نہیں، اس شجرہ میں انہوں نے آفتاب اقبال اور معراج بیگم کی تاریخ ولادت نہیں لکھی۔ اگر معمولی سی کاوش کی ہوتی۔ تو آسانی سے ان دونوں کی تاریخ ولادت معلوم ہو سکتی تھی۔ معراج بیگم ۱۸۹۵ء میں اور آفتاب اقبال ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ آفتاب کے بعد ایک لڑکی اور پیدا ہوئی تھی جو پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ آزاد صاحب نے شاید اس کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی۔ آزاد صاحب کا یہ مرتبہ شجرہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اس میں اقبال کی پہلی لڑکی کا نام معراج بیگم درج ہے۔ آزاد صاحب کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ محمد اقبال جو انہوں نے ۱۹۸۵ء میں تصنیف کی ہے اس میں معراج بیگم کی جگہ اقبال کی لڑکی کا نام مریم بیگم لکھ دیا ہے۔ یہ نتیجہ ہے ذکر اقبال کی آنکھیں بند کر کے نقل کرنے کا۔

مجھے احساس ہے کہ اقبال کے خاندان کا یہ قضیہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ اصل میں اس سلسلے میں جس قدر خوش فہمی (WISHFUL THUNKING) راہ پا گئی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے یہ طول نگاری ضروری تھی۔ اگر میرا یہی بے احتیاط اطناب قائم رہا تو مجھے اندیشہ ہے میرا یہ مضمون ایک خوفناک کتاب کی ضخامت اختیار کر لے گا۔ اس لئے آئندہ اختصار سے کام لیا جائے گا۔

اردو بائیوگرافی میں صداقت نگاری کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس میں تحقیق کی بجائے گپ بازی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔ آزاد صاحب کا مزاج بھی محققانہ نہیں۔ ذیل کے اقتباس سے ان کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

"اگرچہ اس بات کا صحیح طور سے تعین کرنا دشوار ہے کہ اس خاندان نے کشمیر سے کب ہجرت کی۔ لیکن تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالباً اٹھارہویں صدی کے آخر میں بابا صالح کے خاندان کا ایک فرد شیخ جمال الدین [illegible]

کر کے سیالکوٹ کو اپنا مسکن بنا یا ہوگا"

یہ کہنا کہ مسکن بنا لیا ہوگا، تحقیق نہیں، کھلا ہوا قیاس ہے۔ تحقیق کا اقتضا تو یہ تھا کہ لکھا ہوتا "مسکن بنا لیا تھا" تحقیق یہ انداز پوری کتاب پر حاوی ہے۔ شاید آزاد صاحب قیاس کو تحقیق سمجھتے ہیں۔ مختصراً ذیل میں ان کے تحقیقی نتائج کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

صفحہ ۲۱ پر فرماتے ہیں اقبال کے والد شیخ نور محمد زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔ ساری کتاب کھنگال ڈالیے، کہیں بھی اقبال کے والد کا نام شیخ نتھو نہیں ملے گا۔ حرف غلط کی طرح اس کو مٹا دیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں صرف شیخ نور محمد ملتا ہے۔ حالانکہ ان کا اصل نام صرف نتھو تھا۔ ۱۸۹۵ء میں جب انھوں نے شیخ جہاں گیری سے ایک پختہ دوکان مبلغ چھ سو روپے میں خریدی تھی۔ تو اس کے بیع نامہ میں ان کا نام خریدار کی حیثیت سے شیخ نتھو لکھا گیا ہے۔ ساٹھ سال کی پختہ عمر میں اور بیع نامہ جیسی قیمتی دستاویز پر اقبال کے والد کا نام خریدار کی حیثیت سے صرف شیخ نتھو لکھا جانا، ثابت کرتا ہے کہ ان کا نام صرف نتھو تھا، نور محمد نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس بیع نامے کا تعارف کراتے ہوئے صفحہ ۲۱۹ پر روزگار فقیر کے مصنف سید وحید الدین صاحب نے اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو لکھا ہے۔ اس طرح چنگی کے پیدائش و اموات کے رجسٹر میں ہر جگہ ان کے والد کا نام صرف نتھو لکھا ہوا ہے۔ سیالکوٹ چنگی کے اس رجسٹر کا تعارف کراتے ہوئے اقبال درون خانہ کے مصنف خالد نظیر صوفی نتھو کی جگہ شیخ نور محمد پڑھتے ہیں۔

صفحہ ۱۵۵۔ اس سے بھی زیادہ گندم نمائی اور جو فروشی کی ممتاز مثال پروفیسر آزاد کا مرقع اقبال ہے۔

صفحہ ۳۵۔ پر بی اے اور ایم اے کی ڈگریوں کے وہ فوٹو ہیں جن میں اقبال کی ولدیت شیخ نور محمد باور کرانے کے لئے گڑھا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مڈل اور ہائی اسکول کے بعد کسی بھی امتحان کی سند میں ولدیت مذکور نہیں ہوتی۔ مرقع اقبال میں مڈل، بی اے اور ایم اے کی تینوں اسناد کے فوٹو جعلی ہیں۔ کیونکہ مڈل کے سرٹی فکیٹ میں نہ اقبال کی ولدیت درج ہے اور نہ اس میں تاریخ پیدائش ہی مذکور ہے۔ جبکہ یہ دونوں چیزیں اس میں ہونی چاہئے تھیں۔ اس طرح ایم اے کی ڈگری میں اقبال کے نام کے بعد بی اے لکھا ہوا ہے جو کسی بھی سند میں نہیں ہوتا۔ ایم اے کے امتحان میں اقبال کی تھرڈ ڈویژن آئی تھی۔ فوٹو میں سے لفظ تھرڈ اڑا دیا گیا ہے۔ آزاد صاحب نے یہ فوٹو کہاں سے نقل کئے ہیں۔ اس کا حوالہ نہیں دیا۔ لصورت موجودہ ان کی تمام تر ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح مسجد قرطبہ میں علامہ اقبال کا نماز پڑھتے ہوئے جو فوٹو دکھایا گیا ہے اس کے بارے میں آزاد صاحب نے یہ صراحت کی ہے کہ وہ ہسپانیہ سے لائے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ فوٹو کہاں سے حاصل کیا تھا۔ کیا یہ مسجد قرطبہ کے دروازے پر چسپاں تھا۔ یا وہاں آنے والے زائرین کے کسی رجسٹر میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ فوٹو بھی جعلی ہے۔ تفصیلی بحث ... [illegible]

جبل سازی کا یہ شرف تنہا آزاد صاحب کا مقدر نہیں ہے۔ اقبال کی عظمت کا مینار بلند کرنے کے لئے منظم منصوبہ بندی سے کام لیا گیا تھا۔ ابتدا میں پنجاب کے کچھ معماروں نے یہ خدمات انجام دیں۔ بعد میں یو پی یا دیگر مقامات کے اور اقبالین بھی مصلحتاً یا نادانستہ طور پر اس کارواں میں شامل ہو گئے۔ اس ضمن میں سید وحید الدین صاحب بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ روزگار فقیر میں صفحہ ۱۹ پر ایک تمغہ کا فوٹو دکھایا گیا ہے جو میٹرک کے امتحان میں فرسٹ آنے پر اقبال کو ملا تھا۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے پر انہیں بارہ روپے کا وظیفہ ملا تھا تمغہ نہیں ملا تھا۔ یونیورسٹی میں ان کی پوزیشن آٹھویں تھی۔ وہ فرسٹ نہیں آئے تھے اول آنے والے کو ۱۶ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ وحید الدین صاحب کے پیش کردہ تمغہ کے اس فوٹو میں اقبال کا نام پڑھنے میں نہیں آتا۔ یہ ان پڑھت (ILLEGIBILITY) بے سبب نہیں ہے۔ اقبال کے امتحانات کے نتائج دیکھنے کے لئے ہمیں ڈاکٹر حسن کا مضمون اقبال ریویو جولائی ۸۳ء میں صفحہ ۲۲۳ - ۱۲۰ پر دیکھنا چاہئے۔ سید صاحب کی کتاب "اقبال تصاویر میں" (IQBAL IN PICTURES) مجھے دیکھنے کو نہیں ملی۔ ہو سکتا ہے آزاد صاحب نے اکثر فوٹو اس سے نقل کئے ہوں، انہیں ہر فوٹو کے نیچے ماخذ کا حوالہ دینا چاہئے تھا۔

صفحہ ۲۱ پر اسی جلے میں آزاد صاحب فرماتے ہیں "اقبال کے والد زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے" جبکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ سرے سے پڑھے لکھے تھے ہی نہیں۔ عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں صفحہ ۸ پر لکھا ہے: "خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے" اسی طرح فکر اقبال میں صفحہ ۱۴ پر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں "نبی امی کی طرح وہ بھی امی تھے"، فقیر روزگار میں صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے:

> "ایک دن شیخ عطا محمد سے کاغذ اور قلم دوات لانے کے لئے کہا۔ فرمایا جو کچھ میں بولتا جاؤں تم اسے لکھتے جاؤ اگر اقبال کے والد لکھنا جانتے ہوتے تو یقیناً اپنے ہاتھ سے لکھتے وہ آج کل کے کوئی بڑے افسر تو تھے نہیں جو (DICTATION) دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔
> اس کے علاوہ اگر انہیں لکھنا آتا ہوتا تو اقبال نے ضرور ان کی تحریر کے عکس کی نمائش کی ہوتی۔ کیونکہ انہوں نے اپنا، اپنے باپ کا، اپنے بھائی کا، حتیٰ کہ پردے کے کٹر حامی ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں کا فوٹو بہ اہتمام شائع کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ صوفی رہے ہوں، صوفی ہونے کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں، اکثر ناخواندے بھی صوفی ملتے ہیں۔ اور صوفی پرست تو زیادہ تر ناخواندے ہی ہوتے ہیں۔"

خالد نظیر صوفی نے اقبال درون خانہ میں صفحہ ۲ پر جو ان کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے وہ ایک ان پڑھ فلسفی کی بجائے ایک ازلی دیہاتی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایک شکل اور ہے بہت کم لوگوں کو ان کے دیدار کا شرف حاصل ہوا تھا۔ حتیٰ کہ عبدالمجید سالک نے جو اقبال کے شب و روز کے حاضر باشوں میں تھے۔ اور جن کا اقبال کے اولین سوانح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اقبال کے والد کا حلیہ سید ذکی شاہ کی روایت پر بھروسہ کر کے بیان کیا ہے۔ خود ذکی شاہ کا بیان جو "روایات اقبال" مصنفہ عبداللہ چغتائی میں منقول ہوا ہے، اقبال، اقبال کے والد، ان کی بہنوں، ان کی والد

بھائی اور اس کی بیوی کے روزمرہ کے حالات اور ان کے طرز معاشرت کی کسی حد تک تصویر کشی کرتا ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ درج ہے۔

صفحہ ۲۲: ڈاکٹر اقبال کے والد شیخ نور محمد پہلے دھسوں کی تجارت کرتے تھے پھر برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔۔۔۔۔ بیچ میں وزیر علی مال افسر کے یہاں ملازم بھی ہو گئے۔ دوکان اس وقت چھوڑی جب ڈاکٹر صاحب بہت مشہور ہو گئے۔ اور انہوں نے مجبور کیا کہ اب کام چھوڑ دیں اور آرام کریں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کی بڑی ہمشیرہ مسماۃ جیونی[1] تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری ہمشیرہ کریم بی بی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی سب سے چھوٹی ہمشیرہ زینب بی بی تھیں جن کی شادی وزیرآباد میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ وہ اگرچہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔

صفحہ ۲۶: سپرو کی پرانی دتی کنچنی (گانے اور ناچنے والی) ڈاکٹر صاحب کی برات گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ادھر ادھر سے کتابیں لاتے تھے۔ پیلے رنگ کا تہمد باندھتے تھے۔

صفحہ ۲۷: شیخ عطا محمد انجینئرنگ سروس میں ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں بہت روپیہ کمایا۔ شیخ صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ والد صاحب اس بات پر بہت ناراض ہوئے اور پوچھا تم نے طلاق کیوں دیدی شیخ صاحب نے کہا جناب! وہ افیون کھاتی ہے۔ والد صاحب نے فرمایا اگر تم کو افیون لگ جائے۔ تم نے ایک بے گناہ پر ظلم کیا ہے۔ چنانچہ آخری عمر میں عطا محمد خود افیون کھانے لگے۔ شیخ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم میں بہت مدد کی تھی۔

صفحہ ۲۹: ڈاکٹر صاحب اسی زمانے میں لاہور میں ایم اے میں پڑھتے تھے۔ انہیں لکھا ہماسے لئے (سیر بھی) کے لئے) ٹکٹ خرید لینا۔ ڈاکٹر صاحب نے چھاؤنی کی بجائے سینٹر کے ٹکٹ خرید لئے۔ والد صاحب نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ تم اس سال کے امتحان میں پاس نہیں ہو گے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب فیل ہو گئے۔

صفحہ ۳۲: جہاں تک مجھے علم ہے ڈاکٹر صاحب کے دادا سیالکوٹ میں مقیم ہوئے تھے وہ دھسوں کی تجارت کرتے تھے۔ ڈپٹی وزیر علی بلگرام سے آکر مدتوں سیالکوٹ میں مقیم رہے انہوں نے ایک باغ لگوایا جو ڈپٹی کا باغ کہلاتا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے والد کو کپڑے سینے پر ملازم رکھا۔ اور کپڑے سینے کی مشین سب سے پہلے ان کو منگوا کر دی۔

مجھے افسوس ہے میں بہک گیا۔ صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لئے شاید بہکنا بہت ضروری تھا۔ اب پھر آزاد صاحب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ سلسلہ چل رہا تھا آزاد صاحب کی کتاب محمد اقبال کے صفحہ ۱۲ کا۔

---

[1] یہ مسماۃ جیونی وہی ہیں جن کا نام ابتداً درون خانہ میں محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہ بتایا گیا ہے۔ اس سے اس شبہ کو تقویت پہنچتی ہے کہ کہیں اقبال کے نامور ہونے کے بعد ان کے رشتہ داروں کے نام تو تبدیل نہیں کر دیئے گئے تھے۔ بالخصوص ان کے والد صاحب کا نام!

صفحہ ۳۱ پر آزاد صاحب فرماتے ہیں اس زمانے میں سیالکوٹ میں ایک صاحب مقیم ہو گئے ـــــ میر مظہر علی، اردو کی مشہور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر ان ہی مظہر علی کے خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ شاید افسانہ نگاری کا یہ فن آزاد صاحب نے قرۃ العین حیدر سے ہی سیکھا ہے۔ ذکر اقبال میں، اقبال درون خانہ میں، فقیر روزگار میں، سرگزشت اقبال میں ہر جگہ ڈپٹی صاحب کا نام وزیر علی ملتا ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اردو ادب کے اقبال نمبر میں صفحہ ۱۲ پر ضرور ان ہی قرۃ العین حیدر صاحبہ نے ان کا نام مظہر علی لکھا ہے۔ شاید آزاد صاحب نے میر مظہر علی کا نام وہیں سے لیا ہو۔

صفحہ ۳۲ پر لکھا ہے شیخ نور محمد کے یہاں دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ بیٹیوں کی تعداد چار تھی۔ بیٹیاں کم عمری میں ہی وفات پا گئیں۔ بیٹیوں کے متعلق آزاد صاحب کی معلومات صحیح نہیں ہیں۔ چار بیٹیاں تھیں اور چاروں شادی شدہ ہو گئیں تھیں۔ ان کے نام سلسلے وار یہ ہیں۔ سب سے بڑی بیٹیا محترمہ فاطمہ بی بی، (۲) طالع بی بی یہ اقبال کی چھوٹی بہنوں کا نام تھا۔ کریم بی بی اور زینب بی بی؛ جو وزیر آباد میں بیاہی تھیں۔

صفحہ ۳۲ پہ لکھا ہے۔ شیخ نور محمد کا ۷ اگست ۱۹۳۰ء میں سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے ۱۷ اگست ہونا چاہئے۔

صفحہ ۳۳ پر لکھا ہے اقبال اسی شہر سیالکوٹ میں ۹ ستمبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے اقبال کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں محققین میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کا انہوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ مالک رام اور ڈاکٹر نظیر صوفی کی پیش کردہ تاریخ پیدائش یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو صحیح نہ سمجھتے ہوئے اقبال کمیٹی پاکستان کی تعین کردہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء سے اتفاق کیا ہے۔ راقم کی رائے میں ڈاکٹر نظیر صوفی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی مجوزہ تاریخیں زیادہ صحیح ہیں۔ نقوش کے اقبال نمبر حصہ دوم میں صفحہ ۴۴ پر ڈاکٹر وحید قریشی نے جو استدلال پیش کیا ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکست خوردہ ہو کر پاکستان اپنے اندرونی خلفشار میں ایسا الجھا کہ وہ اپنے اس بطل عظیم کی صد سالہ تقریب منانا بھول گیا۔ نومبر ۱۹۷۳ء کے بعد جب حالات قدرے اصلاح ہوئے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تاریخ پیدائش متعین کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اقبال کی تحسین کے ساتھ اقبال کے سوانح خاکہ پر مندرجہ تاریخ کو صحیح قرار دیا۔ مصلحتاً وہاں کے محققین نے اسے تسلیم کر لیا۔ ورنہ اس کے خلاف ڈاکٹر وحید قریشی نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خالد نظیر صوفی اور ڈاکٹر اکبر حیدری نے سیالکوٹ کی چنگی کے اندراجات کے جو فوٹو پیش کئے ہیں۔ انہیں جھٹلانا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر نے اقبال ریویو میں صفحہ ۱۰۰ پر یہ لکھا ہے کہ اقبال نے انٹرنس کے امتحان کا فارم بھرتے وقت اپنی عمر ۱۷ سال لکھی تھی۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اور آج کل بھی طلبا امتحان کے فارم میں اپنی عمر دو تین سال کم ہی لکھتے ہیں۔ تاکہ آئندہ کام آئے۔ اقبال کے صاحب زادے ڈاکٹر جاوید نے "اذکار پریشاں"

(STRAY REFLECTION) ۱۹۶۱ء میں ایڈٹ کی تھی۔ اس کے دیباچہ میں تین جگہ مختلف صفحات (VI, XI, XV) میں جہاں جہاں اقبال کی عمر کا ذکر کیا ہے اس سے اقبال کی پیدائش کا سنہ ۱۸۷۳ء ہی نکلتا ہے۔ اب جاوید اقبال نے بھی احتراماً پاکستان کی اقبال کمیٹی کی مقرر کردہ تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ ڈاکٹر نظیر صوفی کا املا، آزاد صاحب نے نذیر صوفی لکھا ہے۔ اس میں قصور آزاد صاحب کا نہیں۔ سید نذیر نیازی اپنا نام 'ذ' سے لکھتے ہیں۔ اور ڈاکٹر نظیر صوفی اپنا نام نظیر 'ظ' سے لکھتے ہیں، آزاد صاحب کس کو صحیح مانیں۔

صفحہ ۲۴ پر آزاد صاحب نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے اقبال کی پیدائش کے موقع پر ایک خوب صورت پرندے کا شیخ نور محمد کی گود میں آ گرنے کا خواب کو بھی نقل کیا ہے۔ آج کے سائنٹی فک دور میں اس قسم کے خوابوں کا ذکر کرنا اپنی بے بصری اور ضعیف الاعتقادی کا بھانڈا پھوڑنا ہے۔ اقبال کو ایک زمانے میں میلاد کی محفلوں میں جانے کا شوق ہو گیا تھا اور وہ ان محافل میلاد کو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ (اقبال ریویو جنوری ۱۹۸۲ء صفحہ ۲۴۸) یہ حربہ انہوں نے رسول اکرم کی بعثت کے وقت کی معجزہ نمائیوں کا اتارا ہے۔ اس قسم کی پیشین گوئیاں مہاتما گوتم بدھ اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائشوں سے بھی منسوب ہے۔ اور تو اور امرتیا یتیم کی پیدائش کے وقت بھی (شاید علامہ کی پیدائش سے متاثر ہو کر) ایسے ہی معجزے کا ظہور ہوا تھا۔ اگر اس خواب میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو شیخ عبدالقادر نے بانگ درا میں جہاں غالب کی روح کو اقبال میں حلول کرنے کا ذکر کیا تھا۔ اس خواب کو ضرور دہراتے۔ اسی طرح محمد دین فوق جنہوں نے ۱۹۳۲ء کے نیرنگ خیال میں مختصر سوانح حیات کے عنوان سے اقبال کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ ضرور اس خواب کا ذکر کرتے خصوصاً جبکہ حال ہی میں (۱۹۳۰ء) اقبال کے والد کا انتقال ہوا تھا۔

صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے اقبال ذہانت اور شوق علم میں محلے کے اور بچوں سے کہیں آگے تھے۔ اور لہو و لعب اور آوارہ گردی کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ خلاف واقعہ ہے۔ محلے کے پڑھنے والے بچوں سے عمر میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آگے تھے جب لوئر پرائمری میں ان کا داخلہ ہوا۔ تو ان کی عمر ۱۱ سال تھی۔ (اقبال ریویو جولائی ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۳۴) مڈل اور انٹرنس کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی، دوسرے ہم جماعت طلبا سے عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے تھی۔ ایف اے بی اے اور ایم اے میں یہ فوقیت ختم ہو گئی تھی۔ جہاں تک لہو و لعب اور دوسرے شوقوں کا تعلق ہے ان میں وہ سارے شوق موجود تھے جو اس وقت کے اور آج کل کے مسلمان لڑکوں میں عام رہے مثلاً کبوتر اڑانا، بٹیریں پالنا اکھاڑے پہ جانا اور کشتی لڑنا، اور کبوتر پالنے کا شوق تو جاوید کے لڑکپن تک باقی رہا۔ ہیرا منڈی میں ان کی آوارہ گردی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے۔ سر ایڈورڈ میکلیگن نے بتایا کہ حکومت برطانیہ انہیں سر کا خطاب دینا چاہتی ہے۔ اور انہوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ جب تک میرے استاد کو شمس العلما کا خطاب نہیں ملے گا میں اس خطاب کو قبول نہیں کروں گا۔ [illegible] خطاب قبول کرنے کے بعد جب ایڈورڈ میکلیگن نے ان سے شمس العلما کا خطاب کے لیے کسی موزوں نام کے تجویز کرنے کے لئے کہا تو اقبال نے یہ شرط لگا دی کہ یہ نام تبھی پیش کروں گا جب

ہنا مہ سہیل گیا

آپ اس نام کے سوا کسی اور نام پر غور کرنے کا خیال چھوڑ دیں۔ ایڈورڈ نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ (ذکر اقبال صفحہ ۱۱۹) اس دور میں جب ہر ہندوستانی کا سینہ وفورِ آزادی کے جوش میں آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ گھر گھر بدیشی کپڑوں میں آگ لگائی جارہی تھی۔ سرکاری درسگاہوں، نوکریوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جارہا تھا۔ جلیانوالا باغ کے زخم مندمل بھی نہیں ہوئے تھے۔ ٹیگور نے نفرت بھرے لفظوں میں سر کا خطاب واپس کر دیا تھا ایسے نازک دور میں اس حق گوئی اور آزادی کے علمبردار کا سرکار کی دہلیز پر سر جھکا دینا گویا پوری مسلم قوم کے نام پر دھبہ لگا دینا تھا۔ اس سلسلے میں کسی قسم کا تاویل پیش کرنا عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مرادف ہے۔

صفحہ ۲۸ اقبال نے پرائمری کا امتحان ۱۸۸۸ء میں پاس کیا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ پرائمری کا امتحان ۱۸۸۵ء میں پاس کیا تھا۔ (اقبال ریویو جولائی ۱۹۸۳ء) مڈل و کولیشن کے امتحان میں وظیفہ کے علاوہ ایک تمغہ بھی پایا، تمغہ کی بات غلط ہے۔ (اقبال ریویو جولائی ۱۹۸۳ء)

صفحہ ۲۹ اس بیوی سے ایک لڑکی مریم اور فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ اقبال کی پہلوٹھی لڑکی کا نام معراج بیگم تھا۔ حیرت ہے اس نے پہلے ہما اقبال نمبر میں صفحہ ۲۴۴ پر وہ اس کا نام معراج بیگم لکھ چکے ہیں۔ لیکن اب چھ سال بعد اس کا نام مریم بیگم بتا رہے ہیں۔ بے اعتنائی کی اس بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۳۰ مگر جناب داغ جلد پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں ہے۔ انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ آزاد صاحب نے یہ بانگ درا کے دیباچے سے نقل کر دیا ہے۔ تحقیق نہیں کی۔ داغ کے مجموعہ مکاتیب زبان داغ اور مجموعہ انشائے داغ میں محمد دین فوق کے نام تو تین چار خط ملتے ہیں۔ اقبال کے نام ایک بھی خط نہیں ملتا۔ اور فوق کے نام کے خطوط میں بھی کہیں اقبال کا ذکر تک نہیں آیا۔ یہ شیخ عبد القادر کی، اقبال کی ہوا باندھنے کی بات تھی۔ ورنہ اصلاح کی گنجائش تو اقبال کے کلام میں آخر تک رہی۔ اقبال نے اردو شاعری غالباً ۱۸۹۳ء میں شروع کی تھی۔ یہ غلطیوں کا اندیشہ ہی تھا جس کی بنا پر بانگ درا کے چھپنے کی نوبت ۱۹۲۴ء میں آئی۔ جب تک اہل نظر نے اس پر نظرِ ثانی نہیں کر لی۔ اقبال نے اسے شائع ہونے نہیں دیا۔

صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے: جب ۱۸۹۷ء میں اقبال نے بی اے کا امتحان دیا تو صرف یہی نہیں کہ آپ یونیورسٹی بھر میں اول آئے بلکہ انگریزی اور عربی میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے پر انہیں دو سنہری تمغے انعام میں ملے۔ یہ غلط ہے کہ وہ پنجاب میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ انہوں نے صرف سکنڈ ڈویژن میں بی اے پاس کیا تھا۔ اس مبالغہ آرائی سے آزاد صاحب کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ظ انصاری نے انہیں اقبال مجرم غلط نہیں کہا ہے اقبال نے عربی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ جسے میر حسن کے علاوہ ان کی پہلی بیگم کریم بی بی کا بھی فیضان کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ عرب میں پیدا ہوئی تھیں۔ اور عربی ان کی مادری زبان بن گئی تھی۔ انگریزی میں اول آنے والے لڑکے کا نام گوپال سنگھ چاؤلہ تھا۔ جسے پٹیالہ سائم گولڈ میڈل انعام میں ملا تھا۔ عربی میں اول آنے کی وجہ سے اقبال کو خان بہادر سید جمال الدین میڈل ملا تھا۔ (اقبال ریویو) اس میڈل کا فوٹو روزگار فقیر جلد دوم صفحہ ۲۰ پر ملتا ہے۔

۳۶ [illegible] اول آئے اور انہیں

انعام میں نانک بخش میڈل انعام میں ملا۔ ایم میں اقبال کی تھرڈ ڈویژن آئی تھی۔ اس سال میں کلاس میں تنہا ہونے کی وجہ سے تھرڈ ڈویژن فرسٹ پوزیشن بن گئی تھی۔ آزاد صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال پہلی دفعہ میں ایم اے میں فیل ہوگئے تھے۔ دوسرے سال کہیں جاکر پاس ہوئے۔ سید ذکی شاہ نے لکھا ہے کہ یہ میرے والد کی بددعا کا اثر تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن اصل میں یہ نتیجہ تھا اقبال کے مے نوشی اور عیاشی کے خوگر ہوجانے کا۔ (اپنی تلاش میں۔ ذکی الدین احمد۔ صفحہ ۲۱۔ ۱۲۰) ممکن ہے عطا محمد کی رشوت کی کمائی سے اقبال کو ناکامی کا مزا چکھنا پڑا ہو۔ کیونکہ وہی ان دنوں اقبال کے کفیل تھے۔

صفحہ ۳۶، اقبال کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس قدر علم وفضل رکھنے والا مولوی جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ اس خیال سے ان کا سکون قلب جاتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ پڑھائی سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ پروفیسر آرنلڈ اس تبدیلی کو بھانپ گئے۔ آزاد صاحب نے یہاں اقبال کو تعریف کے بانسوں پر اچھالنے والی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں ان کا دوش نہیں۔ وہ محض ناقل ہیں۔ مولوی صاحب کے جھوٹ بولنے پر اقبال کی افسردگی کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کبھی جھوٹ ہی نہیں بولا ہوگا۔ حالانکہ بعض نازک موقعوں پر انہوں نے اتنا سنگین جھوٹ بولا ہے کہ اس کا علم ہوتے ہی ہر قاری کو کوفت ہونے لگتی ہے۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے انگلینڈ جب وہ دہلی اسٹیشن سے گذرے، مسلمانوں نے سوال کیا علامہ ہمارے حقوق کی ترجمانی کے لئے آپ نے کیا کیا مواد اکٹھا کیا ہے، آپ نے کہا میرے پاس حق وصداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن) ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کروں گا۔ (سرگزشت اقبال صفحہ ۳۵۲) کس کا جگر تھا کہ علامہ سے پوچھے کہ قرآن موجودہ ہندوستانی مسائل میں ہماری کیسی رہنمائی کرسکتا ہے۔ پھر بھی علامہ کے اس دل افروز جواب سے ان کے دل شاد ہوگئے ہوں گے۔ لیکن کیا کانفرنس میں اقبال نے کوئی قرآن کا کرشمہ دکھایا۔ مسلمانوں کے مسائل کو سنجیدگی سے پیش کرنے کی بجائے سچ پوچھئے تو انہوں نے گول میز کانفرنس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ اور ان کی گول میز کانفرنس کی شرکت۔ نشستند، گفتند، و برخاستند سے آگے نہیں بڑھی۔ سوال یہ ہے انہوں نے دہلی کے مسلمانوں سے جو وعدہ کیا تھا کیا اسے ایفا کیا۔ اور کیا وہ دروغ گوئی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وائسرائے ہند نے مسلمان نمائندوں کی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے جو فہرست بھیجی اس میں اقبال کا بھی نام تھا۔ لیکن وزیر ہند نے اقبال کا نام نامنظور کرتے ہوئے لکھا ——— اقبال پچھلی کانفرنس میں بالکل خاموش اور چپ چاپ تماشائی کی حیثیت سے بیٹھا رہا اور کسی بحث میں اس نے حصہ نہیں لیا۔ ایسے بے زبان خاموش اور کم سخن شخص کو کانفرنس میں بلانا بیکار ہے۔ (سرگذشت اقبال ۴۸)

اب دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے جو دروغ گوئی میں پہلی سے کم سنگین نہیں ہے۔

"کرسچین کالج لاہور کے پرنسپل لوکس نے علامہ سے سوال کیا: آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبی پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا۔ جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کردیتے تھے۔ یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟۔ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

پر نازل ہوتی تھی۔ لیکن قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا۔ اور کہا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسا عالی پایہ کے فلسفی الہامی الفاظ پر کیونکر اعتقاد رکھ سکتا ہے۔ علامہ نے ارشاد فرمایا میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں صرف شاعر ہوں جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں۔ اور میں انہیں بعینہٖ نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ہوا ایسا کہ میں نے ان اشعار میں کچھ ترمیم کرنی چاہی لیکن میری ترمیم اصل اور نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی۔ اور میں نے شعر کو جوں کا توں رہنے دیا"

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا اقتباس میں اقبال نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ کیا انہوں نے اپنے کلام میں بار بار ترمیمات نہیں کی ہیں۔ اور کیا ترمیم شدہ شعر پہلے سے بہتر نہیں ہو گیا۔ یہاں مثال دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے جھٹلانا دن کو رات کہنے کے مترادف ہو گا۔

اس کے علاوہ بیرسٹر اقبال فوجداری کے مقدمات بھی لڑتے تھے۔ کیا ان مقدمات میں وکیل کے جھوٹ بولے بغیر یا اپنے موکل کو دروغ گوئی کا سبق سکھائے بغیر ایک دن بھی اس پیشہ کا کام چل سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں جھوٹ بولنے کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ سوانح عمری میں اپنے ممدوح کو ناممکن الحصول اوصاف سے متصف کر دینے سے۔ اس کی واقعی کمالات سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ اور بائیوگرافی کے ذریعہ اپنے ہیرو کو ہر دلعزیز بنانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک سوانح نگار کو ان سے گریز کرنا چاہئے۔

صفحہ ۳۶ پر اقبال کی دیگر سوانح عمریوں کے برعکس محمد اقبال میں لفظ محقق تر کی جگہ بڑا محقق لکھا ہوا ہے۔ محقق تر غلط ترکیب ہے۔ آزاد صاحب کی یہ اصلاح دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ لوگوں میں عجیب احساس کمتری ہے اقبال کی غلطی کو غلطی نہیں سمجھتے۔ مرقع میں اقبال کی معاشیات پر کتاب کا جو عکس دیا گیا ہے اس میں سر ورق پر چھپا ہے۔ "علم الاقتصاد جس کا معروف نام علم مدن ہے" میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ ناقدین نے اعتراض کیا ہو کہ ECONOMICS کا ترجمہ علم الاقتصاد یا معاشیات ہوتا ہے۔ اس کو علم مدن یعنی SIVICS کا مترادف بتانا انتہائی لغویات ہے۔

صفحہ ۴۶ پر لکھا ہے کچھ مدت کے بعد آپ نے وید بھگوان کے مشہور مانتر گائتری کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ اس میں آزاد صاحب نے اقبال کے حوالے سے لکھا ہے "اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سُوتر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ ملنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے" یہ وید بھگوان آزاد صاحب نے کہاں سے نکال دیا۔ آج تک تو ہم نے صرف چار ویدوں کے نام سنے تھے۔ رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید، پھر سورج کے سنسکرت لفظ سوریہ ہے نہ کہ سوتر۔

صفحہ ۶۲ پر لکھا ہے "اقبال کی لفظوں کا گوخیہ کیا کہا ان کے انگریزی خطوط بھی انشا پردازی کا ایک نادر نمونہ ہوتے تھے"
میرے نزدیک یہ خطوط اسلوب کی شگفتگی یا انفرادیت کے حامل نہیں ہیں۔ یہ عطیہ فیضی کے نام اقبال کے تو تحریر
ہیں۔ اس میں اُن کے قلب کا اضمحلال اور جسمانی ناآسودگی کی جھلک تو ملتی ہے۔ لیکن وہ کیف آور انداز بیان نہیں
ملتا۔ جس نے اس کے کلام کو جاوداں بنادیا ہے۔ عشقیہ خطوط ہوتے ہوئے بھی یہ روح تغزل سے عاری ہیں۔ ان میں
پنڈت نہرو کا وہ دلآویز پیرایہ اظہار نہیں ملتا جو تاریخ کو ادب پارے میں منتقل کردیتا ہے۔ ان کے مقابلے میں
اقبال کی STRAY REFLECTIONS شاعرانہ ندرت بیان کا بہتر نمونہ ہے۔

صفحہ ۸۵ پر لکھا ہے۔ اقبال کے ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط کے حوالے سے: "وہ مجھ پر کوئی سے بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے
ہیں۔ میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بالخصوص جبکہ میں نے اس
قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کردیا تھا" اقبال کے جھوٹ بولنے کی یہ ایک اور مثال ہے نکاح سے پہلے
اقبال نے کبھی ناراضامندی ظاہر نہیں کی۔ برات کے دن خوشی خوشی سہرا باندھا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے
ڈھول باجے کے ساتھ دلی کنجنی ناچتی گاتی ہوئی گئی۔ بعد میں بھی اقبال اپنی سسرال گجرات برابر جایا کرتے
تھے۔ ایک چھوڑ چار چار اولادیں ہوئیں۔ شادی سے کبیدہ خاطر ہوتے تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ البتہ یورپ
کی معاشرت بہ الثرا ماڈرن عورتوں سے اختلاط کے بعد، اقبال کے دل میں اپنی پہلی بیوی کے لئے سرد مہری پیدا
ہوئی۔ عطیہ بیگم بیبے شامل، اور خصوصاً ویگے ناسٹ جس کے بارے میں اس خط میں یہ جملہ ملتا ہے: "میں اس
لڑکی کو بے حد پسند کرتا ہوں"۔ ان حسین نازنینوں کے جھرمٹ میں جب ان کے ہوش و حواس مختل ہوگئے
تو اپنی پہلی منکوحہ بیوی سے ان کا اُچاٹ ہوگیا۔

صفحہ ۸۷ پر اقبال کی بیرسٹری اور کالج میں ان کی پروفیسرشپ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے چیف کورٹ اور کالج میں
اقبال کو جیتنے کے لئے مسابقت ہو رہی تھی۔ یہ نری مبالغہ آرائی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر اقبال کی مقبولیت
کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑی کساد بازاری کا زمانہ تھا۔ اقتصادی دشواریوں پر قابو پانے کے
لئے اقبال کو دونوں جگہ سر کھپانا پڑتا تھا۔

صفحہ ۸۸ پر اقبال کی سردار بیگم سے شادی کے بارے میں بڑی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں آزاد صاحب کا
کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل اقبال کی شادیوں کا معاملہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ صحیح صورت حال کا پتہ نہیں چلتا۔
دوسرے سوانح نگاروں کی طرح آزاد صاحب نے بھی لکھا ہے:

"جب نکاح ہوچکا تو اس لڑکی کے خلاف اقبال کے پاس طرح طرح کے خطوط آنے لگے۔ چنانچہ رخصتی کا معاملہ
کچھ دنوں کے لئے ملتوی کردیا گیا"۔۔۔ سوال یہ ہے کہ نکاح ہونے کے زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھنٹے بعد رخصتی
عمل میں آجاتی ہے کیا اس دوران لڑکی کے مشتبہ چال چلن کے خلاف اقبال کے پاس خطوط آنے لگے۔ یہ ناممکن ہے
ہوا یہ تھا کہ ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب سردار بیگم کا نکاح ہوا تو اس وقت اس لڑکی کی عمر صرف گیارہ یا بارہ
سال تھی۔ اور اقبال کی عمر ۳۳ سال تھی۔ لڑکی کے با اثر اقربا نے اس بے جوڑ شادی کی بنا پر رخصتی رکوا دی۔

بتا دیا گیا

اور ۱۹۱۳ء میں جب سردار بیگم پندرہ سال کی ہوگئی تو رخصتی عمل میں آئی۔ سردار بیگم اور مختار بیگم (لودھیانے والی) کی تاریخوں پر اقبال پرستوں نے ایسا پردہ ڈالا ہے کہ صحیح صورت حال متحقق کرنے میں قاری کا سر چکرانے لگتا ہے۔ اقبال نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ کشن پرساد کو جو خط لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار بیگم اقبال کے یہاں ۱۹۱۳ء میں رخصت ہو کر آئیں۔ اس خط میں یہ بھی افسوس کیا ہے کہ کاش یہ بیوی پہلے آ گئی ہوتی۔ تو انہیں لاشیانے والی نئی شادی نہیں کرنی پڑتی۔ (سرگذشت اقبال صفحہ ۸۰) پاکستان کے شاعر فلاسفر مرتبہ حنیف ملک میں بھی تجدید نکاح کا سن ۱۹۱۳ء لکھا ہے۔ جبکہ سید وحید الدین، خالد نظیر صوفی، پروفیسر عبدالسلام خورشید، پروفیسر ظ انصاری، عبداللطیف اعظمی اور رفیع الدین ہاشمی، نے اپنی کتابوں میں مختار بیگم (لودھیانے) کے نکاح کی تاریخ ۱۹۱۴ء درج کی ہے۔ اگر ان سب سوانح نگاروں کی اطلاعات غلط ہیں اور اقبال کا بیان صحیح ہے تو مختار بیگم سے اقبال کا نکاح ۱۹۱۳ء سے پہلے ہوا ہوگا۔ اور اگر اقبال کا بیان صحیح نہیں ہے تو مختار بیگم سے ان کا نکاح واقعی ۱۹۱۴ء میں ہوا تو سوال یہ ہے کہ سردار بیگم کے حصول کے بعد جس پر اقبال کی خاص نظر محبت تھی اقبال نے بیگم مختار سے کیوں شادی کی۔ کہیں یہ شادی مختار بیگم کے نولکھا خاندان کی فرد ہونے کی وجہ سے حصول زر کی خاطر تو نہیں کی گئی تھی۔

صفحہ ۸۵، ۸۶ پر لکھا ہے ابھی سردار بیگم کے ساتھ اقبال کا دوبارہ نکاح نہیں ہوا تھا کہ لودھیانے والی بیگم لاہور آ گئیں۔ اسی اثنا میں اقبال کی پہلی بیگم بھی آ گئیں۔ اور دونوں انارکلی والے مکان میں رہنے لگیں۔ یہ صحیح نہیں ہے ۹ اپریل ۱۹۰۹ء کو اقبال نے عطیہ کو جو خط لکھا ہے اس میں واضح طور پر لکھا ہے ——— میں اس کی کفالت کرنے پر بالکل رضامند ہوں۔ لیکن میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے تیار نہیں ہوں" اور واقعہ بھی یہی ہے کہ، ہر جولائی ۱۹۰۸ء میں لندن سے واپس آ جانے کے بعد صرف آٹھ مہینے تک اقبال نے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رکھا۔ (دانائے راز، صفحہ ۷۵، اعظمی) اور اس کے بعد جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کریم بی بی (پہلی بیوی) کو اس کے میکے بھیج دیا اور ہمیشہ کے لئے۔ اقبال نے بعد میں اس بیوی کو طلاق دے دی تھی جس کا ذکر اس کا تذکرہ نگار نہیں کرتے۔

صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے۔ اقبال اس زمانے میں (۱۹۱۴ء) مزاجاً بھی اور مصلحتاً بھی سیاست اور سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ رہے۔ وہ اپنی ادبی اور شعری مصروفیات میں اتنے مستغرق تھے کہ ان سماجی محفلوں میں بھی جو غیر سیاسی نوعیت کی ہوتی تھیں" نظر نہیں آتے تھے " یہ آزاد صاحب کی حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا پر آشوب دور تھا۔ علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں اور دوسرے بہت سے مسلم اور غیر مسلم کانگریسی لیڈر جیلوں میں بند تھے۔ ایسے خطرناک دور میں علامہ گوشہ گیری اختیار نہ کرتے تو کیا کرتے۔

صفحہ ۹۲ پر لکھا ہے سیاسیات میں علامہ اقبال اور مہاتما گاندھی کی ہی راہیں جدا جدا ہونے کے باوجود، دونوں میں ایک فکری اشتراک بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ دونوں برطانوی استعمار کے دشمن تھے " یہ صحیح نہیں ہے، اقبال برطانوی

گورنمنٹ کے خلاف نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت برطانیہ کے بعد مسلمانوں کو ہندوؤں کے غلام ہوکر رہنا پڑے گا۔ اور اس سے پہلے کہ مسلمانوں کے لئے باعزت زندگی گذارنے کی کوئی سبیل آئے۔ وہ انگریزوں کا ہندوستان سے اخراج مناسب نہیں سمجھتے تھے اس وقت کے مخصوص سیاسی حالات میں جب بہت سے ہندو بھائی وطن انگریزوں کی طرح مسلمانوں کو بھی بیرونی حملہ آوروں میں شمار کرتے تھے اور مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستان کے جمہوری نظام میں انہیں ہندوؤں کی غلامی برداشت کرنی پڑے گی۔ اقبال کا جداگانہ نیابت پر زور دینا ان کے خلوص اور پختہ سیاسی شعور کا نتیجہ تھا۔ یا وہ بھی انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پالیسی کا شکار ہوگئے تھے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے جو تفصیلی گفتگو کا محتاج ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اقبال کوئی سیاسی آدمی نہ تھے اور آزادی کے دیوانوں کی طرح قربانی دینا ان کے حوصلے سے باہر تھا۔ وہ اصلاً شاعر تھے صرف شاعر، موقع آیا تو مولانا محمد علی اور گاندھی جی کی شان میں قصیدہ کہدیا۔ اور ضرورت پڑی تو گورنمنٹ کی مدح سرائی کرنے اس کے کیمپ میں پہونچ گئے۔ جنگ کے آخری دنوں میں جب وائسرائے نے دہلی میں وار کانفرنس کی تو اقبال نے نوبند کا ایک مسدس لکھا۔ اس کا پہلا بند یہاں پیش کیا جا رہا ہے ؎

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند		روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند		تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند

ہنگامہ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو		(ذکر اقبال ص ۸۷)

اس طرح جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۵ار دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹیننٹ گورنر پنجاب نے جشن فتح منایا تو اقبال بھی اس میں شریک ہوئے۔ اور گورنر صاحب کی فرمائش پر دو تین نظمیں سنائیں۔ یہاں ایک مختصر نظم کے صرف تین شعر دئے جا رہے ہیں ؎

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی باز انس		فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد
روس را سرمایہ جمعیت ملت بود		قہر او کوہ گراں را لرزہ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستان سپرد		جرمنی را چشم بے خواب و دل بیتاب داد

صفحہ ۱۱۱ پر لکھا ہے:

"اقبال کی بیرسٹری کے متعلق یہ بالکل بے بنیاد قصے ہیں کہ ان کی وکالت چلتی نہیں تھی اور کوئی بہت بڑے وکیل نہیں تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سی آر داس نے حکومت کی اجازت سے اقبال کو لاہور میں اس غرض سے بلوایا کہ وہ ایک متنازعہ فیہ لفظ کے متعلق اپنی رائے عدالت کے سامنے پیش کریں۔ اس مقدمے کے لئے عدالت نے ایک ہزار روپیہ روزانہ اور سو روپیہ روزانہ ان کے کلرک منشی طاہرالدین کو دینا منظور کیا۔ . . . . سی آر داس نے کہا کہ یہ حکومت کا مقدمہ ہے اور اس میں اس قدر جلد آپ کو رائے دینے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اقبال کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے کاغذات اطمینان سے تیار کریں۔ اور اس سلسلے میں وہ یہاں دو ماہ تک قیام کر سکتے ہیں۔ جس کے لئے انہیں ایک ہزار روپیہ یومیہ ملتا رہے گا۔ لیکن اقبال مصر تھے کہ میرے کاغذات تیار ہیں اور میں جلد از جلد اپنا بیان عدالت کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اگلے دن انہوں نے اپنے بیان کو قطعی صورت دی اور عدالت کو سپرد کر دیا۔"

مجھے آزاد صاحب کا یہ سلسلہ سارا بیان مبالغہ آرائی سے خالی نظر نہیں آتا۔ وہ متنازعہ فیہ لفظ گویا تھا جس کی وضاحت خود بیرسٹر نے کی ہے۔ آزاد صاحب کو اس کی وضاحت کرنی چاہئے تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی مالی پوزیشن کبھی بھی تشفی بخش نہیں رہی۔ ان کے آخری زمانے میں بھی جب وکیلوں کی آمدنی عروج پر ہوتی ہے وکالت سے ان کی آمدنی تین سو پینسٹھ ۳۶۵ روپے ماہانہ سے آگے نہیں بڑھی۔ جناب ڈاکٹر مسعود محمود نے انکم ٹیکس کے کاغذات کی چھان بین کر کے بتایا ہے کہ علامہ کے زندگی کے آخری بائیس سالوں میں دو لاکھ سے کچھ کم رقم کمائی۔ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ آمدنی وکالت سے ہوئی۔ تریسٹھ ہزار کتابوں کی رائلٹی کے طور پر حاصل ہوئے۔ اور تقریباً ۳۵ ہزار روپے امتحان کے پرچوں کے دیکھنے کے معاوضے کے طور پر ملے (سرگذشت اقبال ۵۵۸) دو لاکھ میں سے ۹۸ ہزار روپیہ کتابوں کی رائلٹی اور امتحان کے پرچوں کے دیکھنے کی فیس کا نکال دیا جائے تو ایک لاکھ دو ہزار روپیہ وکالت سے آمدنی کا بچتا ہے۔ اسے ۲۲ سال یعنی ۲۶۴ مہینوں سے تقسیم کر دیا جائے تو اقبال کی اس وکالت سے آمدنی ۳۶۰ روپیہ آتا ہے۔ ایسی صورت میں اقبال کوئی ایسے قلندر تو تھے نہیں کہ وہ ۶ ہزار روپے کو یوں آسانی سے نکل جانے دیتے۔ ان کی مالی تنگی غالب سے کم نہیں تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو لکھتے ہیں۔

"بھائی گدھا یہی پیٹ دم بھر کے لئے مہلت نہیں دیتا۔ لاؤ چارا لاؤ، خدا اسے غارت کرے۔ ایک دوسرے خط میں لکھا ہے "قانونی مشاغل میں اشعار کے لئے کہاں سے وقت نکلے۔ دل اور دماغ دونوں کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پیٹ کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر بھی اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے" (سرگذشت اقبال ...)

یہ واقعہ ہے کہیں سے بھی پیسہ ملنے یا مالی آسودگی حاصل ہونے کی شکل نظر آتی تھی تو وہ ... لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو لاہور سے ریجی پی تھامسن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

مائی ڈیر تھامسن!

میں آپ کو یہ خط ایک ایسی ضرورت سے لکھ رہا ہوں جس کا فوری تعلق میری اپنی ذات سے ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ ایسے وقت میں میری مدد فرمائیں گے۔ جبکہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔

لاہور ہائی کورٹ میں جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس کے متعلق حکومت کے فیصلے کی خبر تو آپ کو مل چکی ہوگی۔ میری بدقسمتی ہے کہ لوگوں نے اس سلسلے میں مجھے ملوث کیا۔ مسلمانوں نے یہاں جتنا احتجاج کیا ہے یا آئندہ کرے گا اس سے مجھے بہت زیادہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ چیف جج (سر شادی لال) کا خیال کہ غیر اشخاص جن میں میرا نام بھی شامل ہے اس احتجاج کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جس قسم کی سازشوں میں مجھے ملوث کیا جا رہا ہے، میرا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال ان حالات میں میرے لئے وکیل کی حیثیت سے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ خاص کر جبکہ مجھے ابھی میں بھی کئی طریقوں سے نقصان پہونچ چکا ہے۔ اس کے چند دیگر ناقابل اظہار اسباب کی بنا پر جن کا اس خط میں تذکرہ مناسب نہیں ہے۔ میں اس ماحول سے قطعی بیزار ہو چکا ہوں۔ اور دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں۔ مجھے یقین ہے آپ کے قلم کی ایک جنبش مجھے ان تمام مشکلات

سے نجات دلا سکتے ہے۔ اس کی وجہ سے اور آپ کی فیاضی اور ہمدردی پر یقین کرکے آپ کی سرپرستی کا خواہاں ہوں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے کشمیر کی اسٹیٹ کاؤنسل میں کوئی جگہ دلا سکیں۔ شاید آپ کو علم ہو کہ کشمیر میرا آبائی وطن ہے۔ اور کشمیر کے لئے میرے دل میں ایک خاص لگن موجود ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کشمیر کا نیا مہاراجہ (ہری سنگھ) اپنی حکومت میں کچھ تبدیلیاں لانے کی سوچ رہا ہو، اگر ایسا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے میں سلسلہ جنبانی کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اگر آپ مجھے تھوڑا سا سہارا دے سکیں تو یہ میرے لئے روحانی اور دنیادی طور پر ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی۔ اور میں آپ کے اس لطف و کرم کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔"

(بیسویں صدی دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۸۔ بحوالہ افکار کراچی)

مسلمانوں پر ڈوگرا راج کے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے والی کشمیر کمیٹی کا صدر ہونے کا باوجود، وہاں ملازم ہونے کی خواہش کرنا اور اس سے پہلے الور جیسی مسلم کش ریاست میں نوکری کے لئے جانا، وکالت سے ناکافی آمدنی ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اقبال کے سیاسی کردار کا کھوکھلا پن بھی ظاہر ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۴۲ پر لکھا ہے: جاوید اقبال نے اقبال کی ڈائری STRAY REELECTION کے نام سے شائع کی۔ جس کا ترجمہ پاکستان میں اقبال احمد صدیقی نے شذرات اقبال کے نام سے کیا ہے۔ ہندوستان میں اس کا ترجمہ بکھرے خیالات کے نام سے چھپا ہے۔ پاکستان میں اقبال کی ڈائری کا ترجمہ شذرات فکر اقبال کیا گیا ہے نہ کہ شذرات اقبال، ڈائری کے نام کا ترجمہ اس سے بہتر ممکن تھا۔ شاطر مدارسی کے نام اقبال نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے "میں کیا، اور میرا کلام کیا، نہ مجھے ان اوراق پریشاں کے جمع کرنے کی فرصت ہے" اوراق پریشاں کی مناسبت سے STRAY REFLECTION کا ترجمہ افکار پریشاں زیادہ موزوں ہوتا۔

صفحہ ۱۱۶ پر لکھا ہے، پیرس سے اقبال اسپین گئے۔ یہاں آپ نے مسجد قرطبہ کی زیارت کی اور اس میں اذان دی، یہ صدیوں کے بعد مسجد قرطبہ میں گونجی تھی۔

اقبال کے صحیح حالات بیان کرنے کی بجائے ان کے بارے میں مختلف کتابوں میں جو داستان سرائی کے واقعات ملیں۔ ان میں سے ایک مسجد قرطبہ کی زیارت کا بھی واقعہ ہے۔ عبدالرحیم شاہین کی کتاب اوراق گذشتہ میں ۳۳۰ تا صفحہ ۳۳۴ پر اس سلسلے میں جو داستان بیان کی گئی ہے ذیل میں مختصراً اس کا خلاصہ دیا جا رہا ہے۔

جناب محمود الرحمٰن کی یہ تحریر روزنامہ جنگ راول پنڈی کے اقبال نمبر اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس قصہ کو پرنسپل امتیاز محمد خان نے خود علامہ اقبال کی زبانی ایک تقریب میں سنا تھا۔ جو علامہ کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ حسب بیان کہ ۱۹۳۳ء کی گول میز کانفرنس سے جب میں نے اسپین جاکر وہاں کی مسجد قرطبہ کی زیارت کا ارادہ کیا تو مجھے ان کے قانون:۔۔۔۔۔

مسجد قرطبہ میں نہ تو اذان دی جائے گی اور نہ نماز پڑھی جائے گی۔ کا خیال کرکے رونا آگیا۔ میں نے اپنے اشتیاق اور دشواری کا اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ سے ذکر کیا۔ انھوں نے حکومت ہند کے سکریٹری کو خط لکھا۔ جس نے حکومت ہسپانیہ کے سکریٹری سے مجھے اجازت دلوا دی۔ اجازت

میں یہ قید لگا دی گئی ہے کہ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر داخل ہو جاؤں۔ تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ مسجد کے اندر پہونچ کر میں نے اپنی آواز کی پوری بلندی سے اذان دی۔ اس کے بعد مصلے بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز اس قدر رقت طاری ہوئی، کہ میں گریہ وزاری برداشت نہ کر سکا۔ اور سجدے میں گرا تو بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران میں نے رویا، دیکھا کہ ایک بزرگ آئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ——— اقبال تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہونچاؤ۔

مسجد قرطبہ کی زیارت کے بارے میں جس طرح کی رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پوری حیات اقبال کو اس طرح کی داستان سرائی کے ڈھانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ میں پرنسپل امتیاز محمد خاں سے واقف نہیں کہ ان پر دروغ گوئی کا الزام لگاؤں، داستانیں گڑھنا اور انہیں مزے مزے لے کر سنانا علامہ اقبال کے مزاج میں داخل تھا۔ کہا جاتا ہے وہ بہت اچھے CONVERSATINALIST تھے۔ عبدالمجید سالک نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

"علامہ نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کی نفل ادا کریں۔ اس عمارت کے نگراں سے پوچھا اس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں ادھر وہ پوچھنے گیا۔ ادھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ادائے نماز سے فارغ ہو گئے"

واقعہ صرف اتنا ہی ہے۔ اس داستان میں پروفیسر آرنلڈ کے ذریعے جو اجازت حاصل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو پروفیسر آرنلڈ کا تو سنہ ۱۹۳۰ میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ پھر تحیۃ المسجد نماز پڑھنے کے لئے اذان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ فرض نماز کو چھوڑ کر بلکہ ہر طرح کی نماز سے پہلے اذان دینا مکروہ ہے۔ اسی طرح نماز پڑھنے میں اگر اقبال بے ہوش ہو گئے تو نماز ہی ساقط ہو گئی۔ سوال یہ ہے یہ واقعہ سناتے وقت کیا اقبال کو ان تمام مسائل کا علم نہیں تھا۔ یا انہوں نے سامعین کی لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر اپنی انا پرستی کے جذبے کو تسکین دی تھی۔ جہاں تک آزاد صاحب کے ہسپانیہ سے فوٹو لانے کا تعلق ہے تو جس طرح سالک صاحب نے عجلت سے اقبال کے نماز سے فارغ ہونے کا ذکر کیا ہے یا اقبال نے سنایا ہے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ اندر لگا دیا گیا۔ فوٹو کھنچوانے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ اصل میں پاکستان کے مزاج میں ضعیف الاعتقادی رچی ہوئی ہے۔ اور جب تک وہاں اپنے ممدوح سے روحانی کمالات نہ وابستہ کئے جائیں۔ اس کی عظمت لوگوں کی خاطر میں نہیں آتی۔ اقبال کی پیدائش پر ان کے والد کی گود میں ایک خوب صورت پرندہ آگرا تھا۔ مرنے کے بعد ان کے لبوں پر تبسم تھا۔ یہ سارے افسانے اسی ذہنیت کے تحت بنے گئے ہیں۔

ابھی تک میں نے آزاد صاحب کی کتاب محمد اقبال، اور ان کی دوسری تحریروں کا جو جائزہ لیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی سوانح نگاری سے آزاد صاحب کا مقصد، اقبال کی عظمت کے گن گانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تک بیشتر سوانح عمریاں مدلل مداحی کا پلندہ رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے آزاد صاحب کو اقبال کی شخصیت کا بے لاگ تجزیہ کرنے کی کبھی توفیق ہوتی ہے یا نہیں۔

پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج۔ پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ۔ گیا سے شائع کیا
(ادارہ)

خالد قمر

گھر میں لکھ کر کہانیاں رکھ جا
میں ہوں تنہا سہیلیاں رکھ جا
مدتوں سے ہے گھر میں سناٹا
بند کمرے میں آندھیاں رکھ جا
چاند سے اب سکوں نہیں ملتا
اپنے کانوں کی بالیاں رکھ جا
لوگ کہتے ہیں تو مسیحا ہے
میرے زخموں پہ انگلیاں رکھ جا
بھیگا بھیگا ہوا سا موسم ہے
یاد خالی پیالیاں رکھ جا
اے قمر آج میری آنکھوں میں
اپنی ساری اداسیاں رکھ جا

عمران عظیم

دوپہر کی دھوپ اوڑھے سر پھرا جلتا رہا
شہر کی آبادیوں میں گل بدن جلتا رہا
شاخشیں ہونے لگی تھیں دوستوں کے درمیان
وہ فلک کی سیڑھیوں پہ بے خطر چلتا رہا
کچھ قبیلے دشمنی آپس میں پھیلاتے رہے
زندگی کا ناتواں سورج مگر ڈھلتا رہا
سرخ آندھی کے طمانچوں سے کبھی خائف رہے
وہ ورندوں بے بسی سے پھولتا پھلتا رہا
وہ کتابیں پڑھ رہا تھا امتحاں کے خوف سے
نیند کی آغوش میں آنکھیں مگر ملتا رہا
اس کی تحریریں بھی گم ہو گئیں لیکن عظیم
یادِ ماضی کا برابر سلسلہ چلتا رہا

نشاد احمد نشاد

دل کے مندر میں جب کوئی مورت نہ
زندگی پھر کبھی خوبصورت نہ
جھیل غم کی ہے اتنی بھی گہری نہ
آنکھ میں ڈوبنے کی ضرورت نہ
دوستوں کے ہی برتاؤ سے قتل
دشمنوں سے بھی کوئی شکایت نہ

بھیڑیں جیسے محسوس مجھکو
آدمی آدمی کی ضرورت نہ

ایک حساس دل ایسا موتی
جس کی بازار میں کوئی قیمت نہ

ایم کے اشرف

عجب چراغ تو اسکی کا پتی ہے بہت
ہماری آنکھ بھی رہ رہ کے جاگتی ہے بہت
لبوں کو کھول کے باتیں کرو کبھی کس سے ہیں
ہر اک وقت تو پہلے سے ڈانٹتی ہے بہت
ہوا ہے حکم کہ خاموش سر کٹاتے رہو
نحیف جاں بھی کہاں بات مانتی ہے بہت
تلاشِ سمت سکوں میں ہے جیب کترا ہر ذہن
عجیب راہ ہے الام مانگتی ہے بہت
سنبھل کے رکھے اٹھا پاؤں بھی تو کس جانب
تغیرات کی مدت سے مانگتی ہے بہت
ہر اک مقام پہ کر کے تلاش مجھ کو اشرف
نگاہ جسم کی وادی میں جھانکتی ہے بہت

ساجن پردیسی

غزلوں کو درد، نظم کو اسلوب چاہیئے
روٹی کو چاند، پیار کو محبوب چاہیئے
نیزوں پہ سر بلند ہوئے عرصہ ہو گیا
پھر چاند کی صلیب کو مصلوب چاہیئے
ویران ہو نہ جائے وفاؤں کی خانقاہ
شہرِ وفا کو پھر کوئی مجذوب چاہیئے

ہم پھر بچے زمانہ ہوا چاندنی کی مانگ
پھولی ہتھیلیوں پہ ہری دوب چاہیئے

ساجن مجھے تو ربطِ ناہید تو نہ دے
میری غزل کو لہجہ مرغوب چاہیئے

حافظ راشد سروجی

کیوں وقت مرا ضائع کرتے ہو سوالوں
بیکار کی باتوں سے فرسودہ مثالوں
منہ پھیر کے جاتے ہو راہوں میں
برتاؤ نہیں اچھا یہ چاہنے والا
لاؤں میں کہاں سے وہ لمحات محبت
فرصت ہی نہیں مجھ کو کچھ گھر کے خیا

آیا ہوں گزر کر میں کن راہوں سے
پوچھے تو کوئی آکر ان پاؤں کے چھال

ڈس لے نہ کہیں تم کو اس دور میں
بچ کر ہی ذرا رہنا ان زہرہ جمالو

غزلیں

سحر کاظمی

بیقراری میں لئے صبر و قرار آئے ہیں
آئے ہیں ایسے بھی کچھ لیل و نہار آئے ہیں

ہم وہ جانباز ہیں جو پاسِ وفا کی خاطر
سر ہتھیلی پہ لئے جانبِ دار آئے ہیں

جانے کیا بات ہوئی لوگ نہ بیدار ہوئے
از زمیں تا بہ فلک ہم تو پکار آئے ہیں

اب سنور جائیگی رہتی تھی جو دیرینہ قسمت
زندگی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوار آئے ہیں

آئیے غم کو بھی اپنا ہی مسرت کی طرح
پھول آئے ہیں گلستاں میں تو خار آئے ہیں

لب پہ پھولوں کے سحر رقص پشیمانی ہے
کس کا پیغام لئے اب کی بہار آئے ہیں

عقیل گیاوی

چھٹے غبار تو معصوم دائرہ دیکھوں
ابھرتی صبح کا خوش رنگ سلسلہ دیکھوں

مجھے یہ فکر نہ سورج سے رابطہ ٹوٹے
اسے یہ ضد کہ گھنا دشتِ مرحلہ دیکھوں

ابھر رہی ہے بدن سے عذاب کی صورت
یہ آرزو کہ سیہ رت کا زاویہ دیکھوں

وہ دن نہ آئے کہ مجھ پہ یہ حادثہ گزرے
زمیں سے ٹوٹتا سورج کا رابطہ دیکھوں

کھنڈر کھنڈر سی نگاہوں میں آس کی کرنیں
دھوئیں کے شہر میں خوش رنگ فاختہ دیکھوں

حصارِ ذات سے نکلی ہوئی صداؤں کا
کہاں پہ جا کے ٹھہرتا ہے قافلہ دیکھوں

اظہر نیّر دربھنگوی

سورج کو کھا گئی ہو یہی شام ہی تو ہے
سب کو خبر ہے زیست کا انجام ہی تو ہے

تاریخ ہے گواہ ہیں شاہد بدی تمام
ہر شاہکار آج تہ گام ہی تو ہے

ایواں کی فکر کون کرے کیوں اٹھائے غم
سایہ میں ان خرابوں کے آرام ہی تو ہے

حالات سازگار جو ہوں تو جواب دوں
ان کی نگاہِ ناز میں پیغام ہی تو ہے

ہے زیست ایک عہدِ شکست و دوامِ ریخت
نیرؔ ہمارے سامنے بس شام ہی تو ہے

مصطفیٰ مومن

سبز شام پہ شجر رکھا
دھوپ کی گود میں قمر رکھا

میں فضا میں ہو گیا تحلیل
پاؤں جس دم زمین پر رکھا

جلتے موسم کا بوجھ دھرتی نے
آتے لمحوں کی پیٹھ پر رکھا

گزرا شعلوں کے ایک جنگل سے
اور دامن کو اپنے تر رکھا

مجھکو آنکھوں نے کر دیا اندھا
مجھ نے مجھ کو بے خبر رکھا

پھر نہ اپنا پتہ ملا مجھکو
کون سا در تھا جس پہ سر رکھا

نیاز سلطان پوری

سرمگیں آنکھوں کا پانی سرخ چادر لے گیا
کون عصمت زادیوں کو گھر سے باہر لے گیا

میں زمیں پر لکھ رہا تھا زندگی کا مرثیہ
کون مجھ کو آسمانِ شاعری پر لے گیا

کاغذوں پر بنا رکھے تھے عالیشان بند
موسمِ سیلاب محلوں کو بہا کر لے گیا

درج تھے اس میں ہماری زندگی کے واقعات
رات الماری سے کوئی سارا دفتر لے گیا

کوئی کھلا کب ہی نہ نکلا زندگی کی بھیڑ میں
جنس جان و دل سرِ بازار اکثر لے گیا

کوئی سادہ لوح تھا وہ آدمی بھی اے نیازؔ
پتھروں کے روبرو شیشے کا لشکر لے گیا

سراج اعظمی

ہر جگہ آنا جانا نہیں چاہیئے
شان اپنی گھٹانا نہیں چاہیئے

میری حالت پہ دنیا ہنسے تو ہنسے
آپ کو مسکرانا نہیں چاہیئے

جس جگہ جا کے انسان پچھتائے
اس بلندی پہ جانا نہیں چاہیئے

جس کے سائے میں راحت میسر نہ ہو
پیڑ ایسا لگانا نہیں چاہیئے

اپنے بھائی کا دشمن ہو بھائی جہاں
مجھ کو ایسا زمانہ نہیں چاہیئے

رازؔ دانشوروں کا یہی قول ہے
دل کسی کا دکھانا نہیں چاہیئے

بہار میں

ہریجن، آدی باسی اور پس ماندہ طبقے کے لوگوں کی فلاح کیلئے اٹھائے گئے قدم

صوبہ میں غریبی کی سطح سے نیچے گذر کر رہے خاندانوں کو سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت مدد دی گئی ہے تاکہ انکی آمدنی میں اضافہ ہو اور معیارِ زندگی بلند ہو۔

اس پروگرام کے تحت اپریل تا دسمبر ۸۵ء فائدہ حاصل کرنے والا خاندانوں کی تعداد

انوسوچت ذات	انوسوچت جن ذات	دوسرے پس ماندہ ذات	کل
۵۶،۰۲۶	۲۸،۶۱۷	۱۳۸،۹۵۸	۲،۲۳،۵۵۱

منظور شدہ شرم دلوں کی تعداد

راشٹریہ گرامین نیوجن پروگرام			گرامین بھومی ہین نیوجن گارنٹی پروگرام		
ٹارگیٹ	حصولیابی	فیصد	ٹارگیٹ	حصولیابی	فیصد
۱۸۹٫۶۰ لاکھ	۱۰۰٫۶۴ لاکھ	۹۰٫۰۵	۱۶۹٫۴۰ لاکھ	۱۱۵٫۴۶ لاکھ	۶۹٫۶۵

طالب علموں کو وظیفہ کی تعداد	طالب علموں کی تعداد	منظور شدہ رقم
انوسوچت جات	۳٫۷۴ لاکھ	۶۰۴٫۳۹۸ لاکھ
انوسوچت جن جاتی	۲٫۶۱ لاکھ	۶۶۱٫۶۸۴ لاکھ
دوسری پچھڑی [illegible]	۰٫۷ لاکھ	۱۵۴٫۸۲ لاکھ

محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ بہار

सू० जं० सं० 347-स(सू-377)/85-36

ظفر ہاشمی

نجات

نوٹ: کہانی کار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

"........ لہٰذا عدالیہ مسماۃ کرین کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر کریم سے ماہانہ دو سو روپے اپنے نان و نفقہ کے لئے وصول کرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ کریم کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو یہ رقم ہر ماہ پہلی تاریخ کو بلا ناغہ بھیجا کرے ——— عدالت برخواست ہوتی ہے۔"

جج کے فیصلہ سناتے ہی کورٹ روم جو تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دفعتاً نعروں سے گونج اٹھا ——— آزادیٔ نسواں زندہ باد۔ یونیفارم سول کوڈ نافذ کرو۔ کریمنل کوڈ زندہ باد۔ شریعت کے قانون بدل ڈالو۔

کرین فخر سے سر اٹھائے ہال سے باہر نکلی۔ تو مختلف انجمنوں نے اس کا خیر مقدم ہاروں اور نعروں سے کیا۔ عورتوں کے اداروں کی سربراہوں نے اسے گلے سے لگایا۔ پیٹھ ٹھونکی۔ اور جلوس میں لے جا کر اسے سجے سجائے پنڈال میں بٹھا دیا۔ وہاں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ عورتوں پر مظالم کے داستانیں سنائی گئیں۔ ان کے حقوق کی پامالی کے تذکرے سے دردناک پیرائے میں کئے گئے۔ ان کی مکمل آزادی کا شور مچا۔ اور بیڑیاں توڑنے کی باتیں ہوئیں۔ مردوں کو وارننگ دی گئی کہ وہ اپنی عورتوں کے اوپر سے لگے پابندیاں نہیں اٹھاتے تو ساری عورتیں طلاق لے کر نان و نفقہ کے لئے عدالت میں کھڑی ہو جائیں گی۔ ویسے اس وارننگ پر چند عورتوں کو چھوڑ کر جو پہلے ہی سے مطلقہ تھیں یا جو ہونے والی تھیں باقیوں نے ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن وہاں تو آزادی کا نعرہ لگ رہا تھا سب کو اسی میں بہنا تھا اور سب ہی بہہ رہی تھیں کچھ خود بخود اور کچھ تیز لہروں کی لپیٹ میں آ کر۔

کرین گھر لوٹی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی آزاد ہو گئی ہے۔ ویسے تو کریم نے اسے چھ ماہ قبل ہی طلاق دیا تھا اور وہ اپنے شوہر سے الگ رہ رہی تھی۔ لیکن کورٹ کے فیصلہ تک وہ کسی نہ کسی طرح اس کے حواس پہ چھایا ہی رہا۔ کورٹ میں دوران بحث اس سے نگاہیں چار بھی ہوتی رہیں۔ اور سامنا بھی ہوتا رہا۔ لیکن اب فیصلہ ہو جانے کے بعد تو وہ مکمل طور پر اسے اپنے خیالوں سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ اور نئے سرے سے ایک آزاد زندگی شروع کرنا چاہتی تھی۔ ایک ایسی زندگی جس میں کریم کا تصور بھی اسے پریشان نہ کر سکے۔

اس رات وہ بڑی گہری نیند سوئی۔ جیسے کہ وہ برسوں کی جاگی رہی ہو۔ کسی خواب و خیال سے پاک بے دھڑک نیند۔ صبح اٹھی تو اس نے خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کیا۔ غسل کے بعد تو وہ اور بھی چست اور تیز طرار ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ پیدا

ہو گئی ہو۔ اس کا کوئی ماضی نہ ہو۔ کوئی واقعہ یا حادثہ اس کے دامن کو کھینچ نہیں رہا ہو۔ دور دور تک ان آنکھوں کا پتہ نہ تھا، جو اس پر پہرہ دیا کرتی تھیں۔ اور وہ زبان جیسے کٹ گئی ہو جو اس پر تیروں کی بارش کیا کرتی تھی۔ اور وہ ہاتھ تراشیدہ ہو گئے ہوں جو اس پر اٹھا کرتے تھے۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور وہ پھر سے پیدا ہو گئی تھی۔

اسے اس احساس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے اپنا ناشتہ تیار کیا۔ اور اطمینان سے اکیلے کھانے لگی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بادل نخواستہ اٹھی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے کریم کا نوکر کھڑا تھا۔

"کیوں آئے"؟ اس نے ناگواری سے پوچھا

نوکر منہ سے کچھ نہ بولا۔ ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کیا ہے یہ؟" وہ غصہ سے بولی۔

"آج پہلی تاریخ ہے، صاحب نے دو سو روپے بھیجے ہیں۔ کورٹ کے حکم کے مطابق"

"اوہ" اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے لفافہ تھام لیا۔ اور بغیر کچھ اور بولے دروازہ بند کر دیا۔

اس نے لفافہ میں جھانک کر دیکھا۔ سو سو کے دو نوٹ نظر آئے۔

اسے یاد آیا کہ جس دن کریم کو تنخواہ ملتی تھی۔ وہ اس کی جیب سے لفافہ پہلے نکالتی تھی۔ اور ایک ایک نوٹ گن گن کر ہی دم لیتی تھی۔ اور اس دوران کریم اسے شرارت کی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔ اور جب وہ گن چکتی تھی تو کہتا تھا ـــــ "بیس روپے کم ہیں میں نے خرچ کر ڈالے" وہ سمجھ جاتی تھی کہ کریم اسے چڑھا رہا ہے۔ بناوٹی غصہ کا اظہار کرتی اور اس کے لئے چائے لینے چلی جاتی۔

باورچی خانہ میں چولہے پر چڑھا دودھ ابلا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ اور خود پر لعنت بھیجتی ہوئی باورچی خانہ میں دوڑی۔ لفافہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نفرت سے اسے ڈائننگ ٹیبل پر پھینک دیا۔ میں خود اپنی روزی کما سکتی ہوں۔ ان ٹکڑوں پر پلنے والی تو نہیں میں اس کمینے کو ایسا سبق دینا چاہتی تھی کہ وہ زندگی بھر یاد کرے۔

اس نے کریم کو جو اس کے خیالوں پر آ گیا تھا۔ اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اب میرا اس کا رشتہ ہی کیا۔ میں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر کیوں اپنا ذہنی توازن بگاڑوں۔ میں اب آزاد ہوں۔ اب میرے حواس پر کوئی نہیں چھا سکتا۔ کوئی نہیں۔

اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ اب کریم کے بارے میں، اپنے ماضی کے بارے میں، کچھ نہ سوچے گی۔ اور اپنی زندگی آپ بنائے گی۔ اس نے دن بھر کا پروگرام بنایا۔ ادارہ نجات نسواں میں جانا تھا۔ وہاں وہ اپنی خدمات مفت دینا چاہتی تھی۔ پھر پہلا اسائنمنٹ کے دفتر میں جا کر اپنی نوکری کے لئے کچھ کرنا تھا۔ دو سو روپے میں کیا ہونے والا تھا اور پھر اس دو سو روپے پر لعنت بھیجی تھی۔ اسے تو وہ ادارہ نجات نسواں کو ڈونیٹ کرنے والی تھی۔ اسے تو محض اس بدذات کو سبق دینا تھا۔

کریم پھر اس کے حواس پر چھانے لگا۔ لیکن اس بار اس نے جلد ہی اپنے اوپر قابو پا لیا اور تیار ہو کر باہر نکل گئی۔

پھر اس کی مشغولیت کے شب و روز شروع ہو گئے۔ ادارۂ نجات نسواں میں وہ آنریری جوائنٹ سکریٹری ہو گئی تھی۔ اور طلاق کا چارج اس کے پاس آ گیا تھا۔ وہ اپنے شعبہ کی بہترین کارگذاری کے لئے دل و جان سے محنت کرنے لگی۔ اور ایسے ایسے لوگوں کو طلاق دلوا ڈالی کہ جن کا معاملہ

سالوں سے لٹکا ہوا تھا۔ اور طلاق ہی نہیں کورٹ سے نان و نفقہ کا انتظام بھی کروا دیا۔ اس عرصے میں اسے اپنے سابقہ شوہر کی یاد نہیں آئی۔ اس نے اپنے ماضی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ سچ مچ وہ پھر سے پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا کوئی ماضی نہ تھا۔ اور وہ اپنی زندگی سے بے حد خوش اور مطمئن تھی۔

لیکن ایک صبح ناشتہ کے وقت پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو دھک سے رہ گئی۔

کریم کا نوکر لفافہ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

"آج پہلی تاریخ ہے ——"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کریمن نے اس کے ہاتھ سے لفافہ چھین لیا۔ اور غصہ سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا۔ چند منٹوں تک لفافہ اس کے ہاتھ میں لرزتا رہا۔ اس نے غور سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اس نے غصہ میں آ کر اپنے ہاتھ کو میز پر دے مارا۔ اور تلملاتی ہوئی بڑبڑائی "—— کریم میں تجھے جلا جلا کر ماروں گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی حرکتوں پر پچھتا رہی ہوں۔ میں تیرے روپیوں پر تھوکتی ہوں۔ میں خود اس سے کہیں زیادہ کمانے لگی ہوں۔ لیکن تجھ پر ٹیکس اس وقت تک لگا رہے گا جب تک میں زندہ ہوں"

اسے یاد آیا کہ ایک بار مارچ کی تنخواہ کا لفافہ اسے ہلکا لگا۔ اس نے روپے گنے تو تقریباً ۸ سو روپے کم نکلے۔ اس نے غصے سے پوچھا کہ اتنی کم تنخواہ کیوں ملی۔ تو کریم اسے مسکراہٹ سے دیکھتا تھا۔ لیکن اس دن اس کی نگاہوں میں اصلی خفگی تھی۔ اس لئے اس نے کوئی مذاق نہیں کیا تھا

[illegible]

پھر کریم —— وہ تلملا کر رہ گئی۔ آخر یہ بار بار میرے حواس پر کیوں چھا جاتا ہے۔ اس نے اپنی انگلیاں مروڑ ڈالیں۔ اور سر تھام کر بستر پر بیٹھ گئی۔ تھوڑا دیر بعد اٹھی تو اس کی نگاہوں میں ایک نئے عزم کی جھلک تھی۔ اب کبھی کریم کو اپنے خیالوں میں نہ آنے دوں گی۔ آخر اس کا مجھ سے رشتہ ہی کیا ہے۔ میں اب آزاد ہوں۔ خود پرست ہوں مجھے کس کا ڈر —— وہ معمول کے مطابق کام میں لگ گئی۔

اس نے ادارہ نجات نسواں میں نئی روح دوڑا دی۔ اس کی کوششوں سے طلاق کے کیس زیادہ آنے لگے۔ معمولی معمولی باتوں پر عورتیں ادارہ پر دھاوا بولنے لگیں اور چھوٹے موٹے روزمرہ کے واقعات جھگڑے کر آنے لگیں۔ معاملوں کو نپٹانے میں وہ اس قدر مشغول رہنے لگی کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ رات میں گھر واپس آتی۔ تو تھکان سے برا حال ہوتا۔ اور بستر پر پڑتے ہی سو جاتی۔ اس نے کریم کو اس طرح بھلا دیا تھا۔ جیسے اس نام کا کوئی شخص کبھی اس کی زندگی میں آیا ہی نہ تھا۔

لیکن ایک صبح پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ وجہ نہ سمجھ سکی لیکن جب دروازہ کھولا۔ اور سامنے کریم کا نوکر نظر آیا تو اسے دیکھتے ہی وہ برس پڑی۔

"کیوں آیا۔ مردود"

"آج پہلی تاریخ ——"

لیکن اس کی بات پوری ہونے کے پہلے ہی وہ چیخ اٹھی۔

"میں جانتی ہوں کمینے۔"

"دیکھئے بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ کورٹ کا حکم

"بس کیا میں تمہارے روپے کی بھوکی ہوں"
"وہ تو تمہیں معلوم نہیں، لیکن ہم کورٹ کا حکم
نے پر مجبور ہیں۔"
"گیٹ آؤٹ"
اس نے ایک جھٹکے سے لفافہ لڑکے کے ہاتھ سے
چھینا اور اس کے منہ پر دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ
چوکھٹ تک ہل گئی۔
وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئی۔
کریم، کریم، کریم ——— اس نے دانت
پیستے ہوئے کہا ——— میں تجھے سکھ سے نہ رہنے دوں گی
جب تک زندہ ہوں تجھے پہلی تاریخ یاد دلاتی رہوں گی
اسے یاد آیا کہ ایک بار کریم نے کیا بے وقوف
بنایا تھا۔ کسی وجہ سے تنخواہ مہینے کی آخری تاریخ کو مل گئی تھی
اور اسے پتہ نہ تھا اس لئے لفافہ کریم کے پاس ہی رہا اور
پہلی تاریخ کو جب اس نے کریم کے جیب کی تلاشی لی۔ تو لفافہ
نہ پا کر پوچھا۔
"تنخواہ نہیں ملی کیا؟"
کریم نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔ ملی تھی لیکن بس
میں کسی جیب کترے نے لفافہ مار دیا۔ وہ اس دن روئی
تھی۔ اور جب کریم نے روپیوں کا لفافہ اس کی گود میں لا کر
ڈالا تھا تو وہ کتنا خفا ہوئی تھی۔ اس دن اس نے کھانا
تک نہیں کھایا تھا۔ کریم نے منانے کی بہت کوشش کی تھی
لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ میں تمہارے روپے کی بھوکی نہیں
ہوں۔
اس نے اپنے بالوں کو نوچ ڈالا۔ آخر وہ میرا
پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔ لیکن میں ہمت نہیں ہاروں گی
اور جب تک زندہ رہوں گی کریم کو اس کی شکست یاد
دلاتی رہوں گی جب جب وہ مجھے روپیہ بھیجے گا وہ
طمانچہ یاد آئے گا جو کورٹ کے ذریعہ میں نے اس کے منہ پر لگایا
وہ ہمیشہ اپنے چہرے سے وہ بلغم صاف کرتا رہے گا جو میں
نے تھوکا ہے۔
اس نے اپنا سر زور زور سے دبایا اور جب
خون کی حرکت معمول پر آئی۔ اور تشنج کم ہوا تو وہ اٹھی اور
تیار ہو کر باہر چلی گئی۔ دن بھر اس نے خود کو مختلف کاموں
میں بہلائے رکھا۔ اور جب معمول تھکی ہوئی گھر واپس لوٹی۔
اس وقت تک کریم اس کی یادوں سے محو ہو گیا تھا۔ اور
اس کی خود اعتمادی واپس لوٹ آئی تھی۔
ادارہ نجات النسواں کو نیشنل اخبارات نے خوب
اچھالنا شروع کر دیا تھا اور اس کے کارناموں پر ضمیمے شائع
کرنے لگے تھے۔ وزیروں کو ایک نیا پلیٹ فارم مل گیا تھا۔
اور سیاست والوں کو دلچسپ عنوان بھی۔ بڑھ چڑھ کر اس
ادارہ میں حصے لے رہے تھے۔ نجات دہندوں کی تھیوری
کے کیمپ عالم وجود میں آنے لگی تھی۔ کوئی نہ کوئی پروگرام
روز ہوتا۔ تقریریں ہوتیں، ڈرامے ہوتے، فیچر فلمیں بنتیں اور
دکھائی جاتیں۔ مطلقہ عورتیں کہاں کہاں سے آنے لگی تھیں
اور ان کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ان کی تعداد کے
بڑھنے کی تین وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ ادارہ نجات النسواں
طلاق کا مسئلہ آسانی سے حل کر دیتا تھا اور دوسرے یہ کہ
مطلقہ کا نان و نفقہ کا انتظام ان کے سابق شوہر کو کرنا پڑتا
تھا۔ اور تیسرے یہ کہ جو غالباً سب سے ٹھوس وجہ تھی۔ کہ
گمنامی میں پڑی یہ عورتیں راتوں رات مشہور ہو جاتی تھیں
اور نیشنل پریس میں ان کے فوٹو دھڑا دھڑ چھپنے لگتے تھے۔
حکومت نے ایک بہت بڑی عمارت ادارہ کو دیدی تھی
اور سالانہ کئی لاکھ روپے کی گرانٹ بھی دینے والی تھی۔
ایک سالویشن آرمی وجود میں آگئی تھی۔ اور کریمن اس کی
چیف ڈائرکٹر بن گئی تھی۔

لیکن کہیں کوئی انتقامی جذبہ سب بچھا ہوا کہ کے دل میں موجزن تھا۔ مہینہ بھر تو وہ آرام سے رہتی۔ لیکن ہر پہلی تاریخ کو کریم کا نوکر لفافہ لئے حاضر ہوجاتا۔ اور کریم اس کے اعصاب پہ سوار ہوجاتا۔ وہ نوکر کو دیکھتے ہی ابال کھانے لگتی۔ اور الٹی سیدھی بکنے لگتی۔ وہ لفافہ تو تھامتی، لیکن اس طرح جیسے اس میں اپنی سعوف ہوں۔ اور کھلتے ہی وہ سپٹ پڑتی گے وہ ماضی میں کھونے لگتی۔ اور اسے وہ نرم گرم لمحات یاد آنے لگتے۔ جو اس نے کریم کے ساتھ گزارے تھے۔ کبھی مہربانیاں لاشعور سے ابھرتی، کبھی زیادتیاں حملہ آور ہوتیں۔ اور وہ گھنٹوں اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتی آخر میں اسے نفرت کا سہارا لینا پڑتا۔ اور کریم کو ایک درندہ بنا کر اپنے کندھوں سے جھٹکنا پڑتا۔ وہ دانت پیس کر کہتی۔

کریم میں نے تمہیں ایسا سبق دیا ہے کہ تو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ہر ماہ پہلی تاریخ کو جب تو آگ کا سمندر پار کرتا ہے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی بے عزتی کا گن گن کر بدلہ لیا ہے۔ اور اس وقت تک لیتی رہونگی جب تک میرا دم باقی ہے۔ اور محض تجھے ستانے کے لئے میں دوسری شادی بھی نہیں کروں گی۔ کہ ایسی صورت میں تجھے مجھ سے نجات مل جائے گی لیکن میں تجھے نجات دینا نہیں چاہتی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

خود کو یوں سمجھاتی تو اسے سکون مل جاتا۔

اور وہ دوبارہ ہنگاموں میں کھو جاتی۔ لیکن پہلی تاریخ کے آتے ہی وہ اعصابی تناؤ کا حسب معمول شکار ہوجاتی اور کریم مختلف شکلوں میں اس کے لاشعور سے ابھرنے لگتا۔ اور وہ اپنا بال نوچنے لگتی بیچنے لگتی۔ اور اول فول بکنے لگتی۔

اور ایک مرتبہ پہلی تاریخ کو کریم کا نوکر جب لفافہ لے کر حاضر ہوا۔ تو اس نے لفافہ اس کے ہاتھ سے چھین کر باہر پھینک دیا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بولی۔

"لے جاؤ مجھے نہیں چاہئے یہ رحم کے ٹکڑے۔"

"لیکن کورٹ کا حکم ہے ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے ـــــ" نوکر نے کہا

"گیٹ آؤٹ، مجھے کریم سے ہمیشہ کے لئے نجات چاہئے۔"

"وہ تو مل چکی ہے" نوکر نے سمجھانا چاہا۔

لیکن اس پر بھوت سوار تھا۔ وہ گلا پھاڑ کر چلائی ـــــ "نہیں ملی"

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ زور سے بند کر لیا۔

دوسرے دن اس نے کورٹ کو درخواست بھیجی ـــــ

"میں خوشی کے ساتھ اپنے حق سے دست بردار ہوتی ہوں، کریم کو حکم دیا جائے کہ وہ اب روپیہ بھیجنا بند کردے۔ میں اس سے مکمل نجات چاہتی ہوں۔" ●

نئی کتابوں کا تعارف

زائچہ، جس کے ذریعے فیض کی زندگی اور ان کے عہد کی اہم ترین واردات سے ہم باخبر ہوجاتے ہیں۔ کھلو صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا ہے۔ بالآخر ان ہستیوں کی نشاندہی بھی کی جا رہی ہے جنھوں نے کسی نہ کسی طور پر فیض کے فکر و فن کو نئی آب و تاب عطا کی ہے۔

کھلو صاحب کی یہ کتاب فیض پر کام کرنے والوں کو یقیناً بر انگیخت کرے گی۔ کتاب کی قیمت ۵۰ روپے ہے۔ لیکن لائبریریوں کے شائقوں پر آسانی۔ جلد [illegible] کتابت و طباعت نفیس۔ ادارۂ فکرِ جدید کو اس بہترین اشاعت پر مبارکباد۔ ڈاکٹر عتیق اللہ

[illegible]

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام کی خاص حصولیابی

ٹارگیٹ: درخت لگانے کے لئے: ۱۵ کروڑ
حصولیابی: درخت لگائے گئے: ۱۴،۹ کروڑ
حصولیابی: ۹۹،۳۰ فیصد

ٹارگیٹ: بے زمین لوگوں کو بسنے کیلئے زمین ۱۳,۶۸۰
حصولیابی: زمین کا الاٹمنٹ ۱۴,۳۲۰
حصولیابی: ۱۰۴،۶۸ فیصد

ٹارگیٹ: کمزور طبقہ کے لوگوں کیلئے مکان کی تعمیر ۶,۰۰۰
حصولیابی: مکان کی تعمیر ۶,۲۳۱
حصولیابی: ۱۰۳،۸۵ فیصد

ٹارگیٹ: بجلی کرن کیلئے چنے گئے گاؤں کی تعداد ۱۰۲۰
حصولیابی: گاؤں کی تعداد جنہیں بجلی دی گئی ۱۱۸۵
حصولیابی: ۱۱۶،۱۸ فیصد

ٹارگیٹ: بے زمین لوگوں کے بیچ زمین کا بٹوارہ ۱۲،۶۰۰ ایکڑ
حصولیابی: زمین بانٹی گئی ۱۰،۷۶۸ ایکڑ
حصولیابی: ۸۵،۴۶ فیصد

ٹارگیٹ: ان گاؤں کی تعداد جہاں پانی کی قلت ہے ۶۴۴
حصولیابی: ان گاؤں کی تعداد جہاں پانی کی قلت دور کی گئی ۵۸۲
حصولیابی: ۹۰،۳۷ فیصد

ٹارگیٹ: بندھوا مزدوروں کی نجات کا مسئلہ ۲۸۵
حصولیابی: نجات یافتہ مزدوروں کی تعداد ۲۵۶
حصولیابی: ۹۰ فیصد

सू० जन० सं०/पि०_357-अ(4-276)/86-86

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

کتاب: فیض احمد فیض

مصنف: کے۔ کے۔ کھلر
کتابت: شاعرِ انقلاب علامہ جمال گیاوی
طابع و ناشر: ادارۂ فکرِ جدید۔
۹۲۲ - بہرام ترابا۔ کوچہ دو بیلا۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲
قیمت: ۵۰، ۷ روپے

"فیض احمد فیض" کے۔ کے کھلر کی نئی تنقیدی تصنیف ہے۔ فیض بڑے خوش بخت واقع ہوئے ہیں کہ اُدھر انکی آنکھ بند ہوئی اور ادھر ایک مکمل کتاب کا باب ان پر وا ہو گیا۔ اُردو معاشرے میں یہ اقبال مندی کم ہی کے نصیب میں آئی ہے۔ ہماری دلچسپیوں کے طور اتنے مختلف اور متضاد ہوتے جارہے کہ انھیں پر نگاہ ٹھہرتی ہے جن سے راحت رابطہ ہوتا ہے' ورنہ چہ آپ اور چہ آپ کی خاطر فراموشی۔

ایسا نہیں ہے کہ فیض پر کتاب نہیں لکھی جاتی یا نہیں لکھی جائے گی۔ فیض کی شخصیت' زندگی' جدوجہد اور ان سب سے بلند انکی شاعری ہمارے عہد کا کبھی فنا ہونے والا سبق ہے۔ ان پر لکھا جا رہا ہے' لکھا جائے گا اور خوب لکھا جائے گا۔ لیکن اُردو تنقید کے معاملات اتنے مخصوص ہو چکے ہیں اور لکھنے لکھانے کی تعداد اس قدر سست ہے کہ خوش فہمی کا سہارا لینے کی ہمت بھی نہیں رہی۔

فیض کے آرٹ پر نکتہ چینی کرنا ایک بات ہے اور محض غالب کی طرفداری میں مدح سرائی کرنا دوسری بات۔ ڈر یہی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے بین ہمارا اصل فیض گم ہو کر نہ رہ جائے۔ فیض ہمارے عہد کے شاعر ہیں۔ ان کی قربت کی گرمی ابھی تک تازہ ہے۔ اور یہی رفاقت جس کا عرصہ کئی عشروں کو محیط ہے، ہمارے میزان کی راہ میں مانع آسکتی ہے۔ جناب کھلر نے مروت سے پرے ہو کر فیض کے سلسلے میں متعدد سوالات اٹھائے ہیں۔ جن میں بعض لوگوں کو عصبیت کی جھلک بھی نظر آسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کھلر صاحب کے ذہن میں اگر اس نوع کے سوالات پیدا ہوتے ہیں' تو کیوں؟ ان سے صرفِ نظر کرنے سے مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں ان سوالات پر غور کرنا چاہیے۔ انھیں بحث کا موضوع بنانا چاہیئے۔

کے۔ کے۔ کھلر نے فیض احمد فیض کے پہلو بہ پہلو اس شاعر کا بھی محاسبہ کیا ہے جسے اُردو قاری نے اپنی یادداشت میں ایک اہم جگہ عطا کی ہے کہ فیض کی شاعرانہ حیثیت ان کی سوانح بھی ابھی ایک ڈیڑھ برس اُدھر ہی کا قصہ ہے۔ کے۔ کے کھلر نے بڑے کمالِ ہنرمندی کے ساتھ فیض کی زندگی اور حیات کے پس منظر میں ان کی شاعری کے رموز سے یکے بعد دیگرے کئی حجاب اٹھائے ہیں۔ کھلر صاحب کا اپنا ایک طنز آمیز' بے تکلف اور تیکھا اسلوب ہے۔ فیض کے مقطع اسلوبِ حیات کے اندر کی شکن اور تضادات کو انھوں نے ایک محقق کے طور پر دریافت کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ اس تلاش میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ وہ تاریخ کے آدمی ہیں

نارسا کیا

بلند آواز تھے کہ ہر اس دعوے سے وہ ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق فیض سے ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے جا بجا حوالوں کی بھرمار کی ہے۔ کہیں کہیں یہ شک گزرتا ہے کہ فیض اور محض فیض ہی نہیں بلکہ فیض کے اُن ہزاروں ہزار عقیدت مندوں سے محض چھیڑ خانی ان کا مقصود ہے۔ فیض جن کی کمزوری ہیں۔ کہیں فیض کے کردار کو کچھ اس طرح پر نمایاں کیا ہے کہ وہ ایک بچہ سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ مخالف تاثرات کچھ غلط فہمیوں کو راہ دے سکتے ہیں۔ لیکن اس قاری کے لئے ان میں کسی نوع کی تغلیط کا پہلو مضمر نہیں جس نے اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور نئی سچائیوں سے آنکھ ملانے کی تاب جسمیں بیش از بیش ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ کھلر صاحب کا ایک موضوع تاریخ اور سوانح ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے اسلوب کی اپنی ایک وضع ہے، اور جو حد درجہ بے تکلف ہے۔ سوانح کے بغیر ان کے قلم میں روانی نہیں آتی اور اپنے اسلوب میں طنز کی کاٹ پیدا کئے بغیر انھیں کوئی لفظ راس نہیں آتا۔ کھلر صاحب نے فیض کے سوانح سے چند مثالیں اخذ کر کے ان عقدوں کو نمایاں کیا ہے جن سے قول و فعل کے مابین حیرت انگیز دوئی کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ تنقید میں سوانح بڑی حد تک گمراہ کرتی ہے۔ لیکن سوانح کے بعض پہلو یقیناً بڑے دلچسپ نتائج تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ کھلر صاحب نے بڑی محنت، وقت، اور توجہ کے ساتھ قول و فعلِ فیض کا تجزیہ اور محاسبہ کیا ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور توجہ طلب بھی۔

یہ کتاب فیض کی دکھتی رگوں ہی کو نہیں چھیڑتی فیض کے اندر سے اس فیض کو بھی باہر نکال لانے کی سعی کرتی ہے۔ جو بڑا ہے تو اس کی بڑائی میں ترقی پسند جیسی ولولہ انگیز تحریک کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ میں کھلر صاحب کے اس خیال کے حق میں ہوں کہ نقشِ فریادی کا شاعر اگر اس تحریک سے اپنی فکر کو جلا نہیں بخشتا تو وہ زیادہ سے زیادہ دورِ جدید کا اختر شیرانی بن جاتا۔ فیض کو لیکن ہمارے یہاں ترقی پسند تحریک کا سب سے اہم حصہ رہا ہے۔ بلاشبہ اسی تحریک کے ذریعے فیض کی پروازوں کو نئی طرحیں میسر آئیں۔ اُن کی اصل صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں۔ اُن میں خود فہمی اور خود احتسابی کا حوصلہ پیدا ہوا۔ گویا اُن کی شاعری نے بہت جلد اپنے ضمیر کو پا لیا۔ اور آن کی آن میں اُن کے فرمائے ہوئے لفظ ہمارے لئے مستند اور مستند ہوتے چلے گئے۔

کھلر صاحب نے اس فیض کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ جو رومان پرست ہے۔ جس کے اظہار میں والہانہ پن ہے۔ اور جس کے موضوعات کا دائرہ محدود تر۔ انقلاب جس کا نعرہ ہے مگر شاعری میں جو صرف لیلاؤں کے خیر کی دعا اُٹھاتا ہے۔ متاعِ لوح و قلم چھن جانے یا خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے یا زبان پہ مہر لگنے یا زنجیر کے ہر حلقے میں زبان رکھنے کی بات صرف شاعری ہے۔ بقول کھلر "انقلاب" فیض کے عہد کا ایک سکۂ رائج الوقت ہے۔ جس نے جتنی زور سے انقلاب کا نعرہ بلند کیا (چند روز کے لئے ہی سہی) ادب میں اس کا مقام بھی اتنا ہی بلند ہو گیا۔ فیض نے اپنی شاعری کو اس نعرے سے دور رکھا لیکن اپنی نثر کے حوالوں میں وہ کسی بلیغ دھاری سے کم دکھائی نہیں دیتے۔ اس اعتبار سے جناب کھلر کو فیض اور اُن کے شعر کے مابین بھی دوئی کا احساس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے فیصلوں میں کہیں کہیں شدید بھی ہو گئے ہیں۔

فیض اور انقلاب، فیض اور رومان، فیض اور کلچر، اور راولپنڈی سازش کیس، فیض اور پنجابی وغیرہ پر بھی جناب کھلر نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہر فن میں انھوں نے ایسے بہت سے مجاورات necdotes پر سے نقاب اُٹھایا ہے۔ جو فیض کے سوانح نگاروں کے خام مواد کا کام دیں گے۔ اس پر مستزاد فیض نا رسا
(باقی صفحہ ...)

شہرِ خیال

سہیل بابت ۱۵ اگست ۲۰۰۵ء دیکھنے کو ملا۔ اداریے پر ہلکی نظر ڈالی۔ شمارہ نظر کو بھا گیا۔ اداریہ اپنا خیال آپ ہے۔ وہ حکومت یا حکمراں عوام کے لئے کیا سوچیں گے جنھیں صرف اپنے مقصد سے غرض ہے اور ایک الجھاؤ (مقصد) پیدا ہوا نہیں کہ دوسرا الجھاؤ (تحریک) شروع کر دیا۔ اور کچھ غریبی ہٹاؤ الجھاؤ تو پورا ہو ہی چکا ہے تبھی تو وزیر اعظم نے ۲۱ ویں صدی الجھاؤ شروع کر دیا ہے۔ ویسے کچھ ہو نہ ہو اتنا ضرور ہوگا جیسا آپ خود کہتے ہیں:

"ویسے تو کوئی کچھ کرے یا نہیں ملک ۱۵ برسوں کے بعد ۲۱ ویں صدی میں تو پہنچ ہی جائے گا۔ پھر بھی غور تو کرنا ہی ہوگا کہ اس نعرے کا کیا مطلب ہے؟ ——"

ناچیز: ضیا چکد یزوی۔ گھوگھر ڈیہا۔
(مدھوبنی)

جنابِ من! سُہیل لگاتار نکل رہا ہے، یہ اُردو دُنیا پر آپکا احسانِ عظیم ہے۔ سرکاری رسالے بھی بہت باقاعدگی سے نہیں نکل پا رہے ہیں۔ اور آپ لوگوں کی یہ کرامت ہی ہے۔

سعید الاسلم قادری (بتیا)

[illegible] مشہدی نمبر [illegible] معیار آپ نے بہت بہتر بنایا ہے۔ عظیم [illegible] صاحب کے جواب سے اندھی اقبال پرستی پر کاری ضرب لگی ہے۔ قارئین ذہنیت ترتیب پا رہی ہے۔ جیسی نا قدر ازادی اُن کے مضمون کا انتظار رہے گا۔ اُن کا پتہ آپ لکھ سکیں تو میں انھیں ذاتی طور پر مبارک باد دوں۔

اسی شمارے میں بھائی مشتاق احمدی نوری کا طویل مقالہ بھی دیکھا۔ ظاہر ہے کہ نوری صاحب میرے لئے اور سہیل کے لئے یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ادب کا مطالعہ جس سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی انھیں واقفیت ہے۔

میں جب افسانے کی بات کرتا ہوں تو میرے پیش نظر وہ کہانیاں ہوتی ہیں جن کے نقوش ذہن پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ افسانے کی عمر کم و بیش سو سال کی ہے۔ اس لمبے عرصے میں لاکھوں لاکھ کہانیاں لکھی گئی ہوں گی اور شائع بھی ہوئی ہوں گی۔ بھائی نوری صاحب کو کتنی کہانیاں یاد ہیں؟ میرا مطلب ہے کتنی کہانیوں کے نقوش ذہن پر ثبت ہیں۔ سو، دو سو یا بہت زیادہ تو پانچ سو۔ ظاہر ہے کہ باقی کہانیاں کا [illegible] نے جھک نہیں ماری تھی، کہانی ہی لکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ کہانیاں آج زندہ نہیں ہیں۔ وہ ہمیں متاثر نہیں کرتیں۔ قاری دگر گونا تعلقات کا اسیر نہیں ہوتا تو ایمانداری سے اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ اس کے یہ تاثرات تلخ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر مشہدی صاحب سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن اگر میں مصلحت پسندی سے کام نہ لوں تو مجھے کہنا چاہیے کہ آج کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ کامیاب افسانہ نگار میرا فرض بنتا کہ یوں کہ سہیل نے ان پر نمبر نکالا تھا۔ اور میں اسکی ادارتی [illegible]

معتقد ہوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں ادب کو
ذاتی پسند یا ناپسند کے معیاروں پر نہیں پرکھتا۔ میں ادب
میں زندگی اور واقعیت کی رمق تلاش کرتا ہوں جیسے زندگی
کا سیال مادہ کہہ سکتے ہیں۔ مطالعۂ ادب کا یہ طریقۂ کار
مجھے ترقی پسند تحریک سے اور اپنے ادب کے مسلسل مطالعہ سے
ملا ہے۔ سہیل بھی چونکہ انہیں خیالات کا ترجمان رہا
ہے اس لئے مصلحت پسندی اس کے آڑے نہیں آئی۔
اور اس کاروباری دور میں بھی وہ خطرے مول لیتا رہتا
ہے۔ میرے پاس مشہدی کی جو پانچ کہانیاں آئی تھیں
میں نے انھیں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے میں اس جرم
کا مرتکب نہیں ہوں کہ میں نے وہی کہانیاں چنی ہیں جن
میں کچھ نہ کچھ خامیاں رہی ہیں۔ ویسے نوری صاحب نے
اس مضمون میں مشہدی کی تخلیق 'ہدایت نامہ' پر میری
رائے شاید غور سے نہیں پڑھی۔ اور انھوں نے ان
کہانیوں کے عنوانات بھی نہیں دیکھے۔ جن کے مقابلے میں
میں نے نوری دہائی کے ان سالوں کو محروم لکھا ہے۔
میں نوری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے
میرے مضمون کو اتنے غور سے پڑھا اور میری کوتاہیوں پر
نظر کی۔ مجھے بیسویں صدی کے قارئین پر اتنا اعتماد تو
ہے ہی کہ میں مختصر سے مختصر جملوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش
کروں۔ بجائے کہانی کے حلق میں انگلی ڈال کر معنی اگلوانے
کے (معذرت علوی سے معذرت کے ساتھ) لیکن نہیں
معلوم تھا کہ ہمارے قاری کو اپنی پسند کے نتائج منوانے پر
یقین رکھتا ہو۔ میں مزید یہ چاہتا ہوں کہ نوری تک یہ خبر
اور احساس پہنچا دوں جو کہانی کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے کہ
سبز پرندوں کا سفر میں خانۂ کعبہ ذہن کی قوتوں کی
علامت ہے اور ابابیلوں کا غول شر کی قوتوں کے حملہ کو
پسپا کرنے کے لئے سبز پرندے مشیت ایزدی کی شکل میں
شر کی قوتوں کو فنا کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہاں بھی
انسان نے سپر ڈال دیئے تھے۔ اور خدا کے گھر کی حفاظت
خدا کے ذمہ چھوڑ دی تھی۔ اس کے متولی کو اپنے اونٹوں
کی زیادہ فکر تھی خانۂ کعبہ کی کم۔ وہاں بھی عوام کا کام معبد
میں جا کر حمد و ثنا کرنا تھا اور وہاں سے جاری ہونے والے
احکامات کی بے چون و چرا پیروی کرنی تھی یہاں بھی بے شمار
ہاتھی اپنی سونڈ اٹھائے پتھر کی اس متبرک (؟) عمارت
کو پامال کرنے کے لئے خوفناک انداز سے بڑھتے جا رہے تھے۔
خوف سے اس کا دل کانپ اٹھا، وہ چیخ اٹھا ——— ابابیلو!
کہاں ہو تم!! سبز پرندو! کہاں ہو تم دوڑو، بچاؤ، دیکھو
سیاہ ہیبت ناک جانوروں نے پھر حملہ کیا ہے۔ مگر سبز پرندہ
تو ظاہر حسین کے سر پر ظل ہما، تاج کی طرح بیٹھا تھا۔ اور اس کی
چونچ میں سفید کنکریوں کی جگہ موتی تھے۔ اور پنجوں میں سرخ
خون چمک رہا تھا ——— مشہدی نے سبز پرندہ کو اگر
مشیت ایزدی کی شکل میں دیکھا نہیں ہے تو بات الگ ہے۔
لیکن سبز پرندہ چودہ سو سال سے انھیں معنوں میں استعمال
ہوتا آیا ہے۔ اور اس کی معنویت بھی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔
لہٰذا نوری بھائی غور کریں کہ کہانی نے کون سا موڑ اپنا
لیا ہے۔ میں نے اختصار سے اسی لئے کام لیا ہے کہ بات
دوسری طرف نہ نکل جائے۔
میں افسانہ نگار کے لئے اصول اور ضابطے مقرر نہیں
کرتا اور نہ ہی اسے مشورے دیتا ہوں کہ وہ اپنی کہانی کے لئے
کونسا موضوع یا کون سے کردار چنے۔ ہاں میں اس سے یہ امید ضرور
رکھتا ہوں کہ وہ جس کردار کو اپنا موضوع بنائے اس کے
اندر جھانک کر ضرور دیکھے۔ اگر زندگی یہ دنیا کی تو مشہدی
ان کہانیوں پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے زندگی کا سیال مادہ ان میں

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
HAJI A. RAHIMKHAN & SONS
HOWRAH
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے۔آر۔چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجئے
حاجی اے رحیم خان اینڈ سنس

Regd. R. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 1573

MARCH-1986

Rs. 2

ہمیشہ ہی
مودی
دھلائی کا
صابن
MODI
WASHING SOAP
مودی
پنجاب سوپ فیکٹری
۱۰/۷ بی ۵ کینال ویسٹ روڈ کلکتہ ۹

سہیل گیا

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ

مارچ ۱۹۸۲ء

فون نمبر ــ ۱۵۷۳

جلد نمبر ۳۸ ؛ شمارہ نمبر ۳

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے

زر سالانہ ۲۴ روپے ؛ لائف ممبری: ۲۵۱ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

۱ آہ! غیاث احمد گدی (نثر) جمیل منظر شہبازوی ۹

۲ قرآن میں عورت کا مرتبہ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۱۱

۳ آنندی: ایک تجزیاتی مطالعہ جمیل اختر نیماوی ۲۱

۴ درد اور شعلہ (نظم) شمیم اعظمی ۲۵

۵ غزلیں ڈاکٹر خورشید سمیع ۔ جوہر صدیقی ۲۶

۶ غزلیں مشتاق جاوید ۔ یوسف جمال ۲۷

۷ غزلیں ڈاکٹر اسلم حنیف ۔ گوہر امروہوی ۔ ڈاکٹر ساقی ماچپلی شہری ۲۸

۸ غزلیں عالم خورشید ۔ تاج پیامی ۔ نعمان شوق ۔ انصار الحق مشتاق ۔ اسلم رمزی سیوانی ۔ الیاس قمر مرادآبادی ۲۹

۹ غزلیں جبار شمسی رانچوی ۔ منظر اعجاز ۔ اعجاز طالب ۔ غلام ناشی ۔ اعجاز احمد اعجاز ۔ سرور ساجد ۳۰

۱۰ الجھے سوال (کہانی) تسکین زیدی ۳۱

۱۱ زید آباد (کہانی) شمیم صادقہ ۳۳

۱۲ نئی کتابوں کا تعارف ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۴۱

۱۳ شہر خیال قارئین سہیل کے خطوط ۴۳

۱۴ انجمن ترقی پسند مصنفین گیا کی سرگرمیاں (ادارہ) ۴۶

آہ! غیاث احمد گدی

موت برحق ہے!
ایک نہ ایک دن سبھوں کو مرنا ہے!
یہ دنیا فانی ہے، یہاں کسی شئے کو بقا نہیں!!!

یہ اور اس طرح کے دوسرے جملوں اور فقروں کے ذریعے عام طور پر لوگ کسی کی موت کا غم بھولنے اور بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی یہ جملے بھی اپنی معنویت اور تاثیر کھو دیتے ہیں۔ آج جب مجھے یہ خبر ملی کہ غیاث احمد گدی اب اس دنیا میں نہیں رہے تو لگتا ہے ساری چیزیں بے معنی سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان جملوں میں بھی اب کوئی معنی نہیں رہے۔

غیاث احمد گدی اردو ادب کے لئے ایک بڑا نام تھا۔ اس نام نے اردو کو قدر اول کے متعدد افسانے دیئے ہیں، خاموشی کے ساتھ اپنے فن کی تخلیق میں لگا رہنے والا یہ فنکار غالباً اس راز سے بھی ناواقف تھا کہ اردو کے افسانوی ادب میں اس کا کتنا عظیم مرتبہ تھا۔ لیکن یہ سب تو ادب کے توسط سے یاد کرنے والی باتیں ہیں۔ ہم تو اس غم کو سہلانے کی کوشش میں ہیں جو ذاتی اور شخصی طور پر ہم محسوس کرتے ہیں۔ والد مرحوم (جناب ادریس شنہاروی) اور غیاث احمد گدی سے جو دیرینہ اور غیر رسمی نیز گھریلو تعلقات تھے اور پھر والد کے انتقال کے بعد گدی صاحب نے جس طرح آج تک ان تعلقات کو نبھایا ہے یہ سب سوچ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے سانحۂ ارتحال پر ان کے بھائی جناب الیاس احمد گدی کو تعزیت دوں یا مرحوم کے صاحبزادگان کو یا پھر خود اپنے آپ کو تسلی دوں! انسان کتنا مجبور و بے چارہ ہے۔ اس کا صحیح اندازہ و احساس ایسے ہی کرب ناک اور جان گداز لمحوں میں ہوتا ہے۔ آج ہم ایک عظیم فن کار، ایک مخلص انسان، ایک بزرگ دوست اور گھر کے ایک محبوب فرد سے محروم ہو چکے ہیں، خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہمیں صبر! آمین

جمیل منظر شنہاروی

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

"قرآن میں عورت کا درجہ"

اور

میرے تاثرات

جناب اصغر علی انجینیر کی ایک کتاب "قرآن میں عورت کا درجہ" کے نام
سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے ـــــ اس کتاب میں قرآن اور اسلام کا عالمانہ
مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے اس کتاب پر جو تاثرات مندرجہ
ذیل مضمون میں بیان کئے ہیں وہ ہم قارئین سہیل تک پہونچا رہے ہیں اور
جناب اصغر علی انجینیر سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ان کی روشنی میں
اپنے خیالات کی وضاحت فرمائیں۔ ـــــ ادارہ

شاہ بانو کیس کے بعد عام طور پر لوگ اسلام اور عورت دونوں میں خاص طور پر دلچسپی لینے لگے ہیں۔ علمائے کرام
کے سلسلے وار تحریر خصوصی مضامین میں [illegible] کی بات یہ ہے کہ مجھ جیسا عام آدمی بھی کہیں نہ کہیں سے ان مباحث میں گرفتار ہو
جاتا ہے جیسا کہ جناب اصغر علی انجینیر کی کتاب "قرآن میں عورت کا درجہ" نے مجھے بھی خامہ فرسائی پر مجبور کر دیا ہے۔ میں
اس موضوع سے بچنا چاہتا تھا اس لئے کہ ایک طرف مسئلہ عورتوں کا ہے اور مجھے ان کی چھینا جھپٹی سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے [illegible]
[illegible] کانپ جاتا ہوں۔ ـــــ دوسری طرف اسلام کے توسط سے علماء کی خشونت کا خوف
[illegible] مسلمات میں کہ مصنف کتاب خدا کا حکم ہے کہ جہاں اس پر رائے زنی کر دینا جہالت کا [illegible] ہو سکتی لہٰذا
[illegible] جہاں ضرورت ہے کے سوا احتیاط کا دامن [illegible] گیا ہے

[illegible] گیا۔

جناب اصغر علی انجینیر جری، بےباک، صاحب علم اور روشن دماغ اہل قلم ہیں۔ ان کے دل میں یہ جذبہ موجزن ہے کہ مذہبی نظام میں اصلاحات پیدا کی جائیں۔ وہ مذہب پر مولویوں اور پنڈتوں کی زبردست اجارہ داری اور اس میدان میں ان کی ESTABLISHED LEADERSHIPS کا حال جانتے ہیں۔ اس کے بعد بھی لڑنے بھڑنے اور سمجھنے سمجھانے کے لیے تیار ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ میں دامن بچا کر ہی نکل جانے میں عافیت محسوس کرتا آیا ہوں۔ مگر جب دوست ہی عاقبت دشمن ہو جائے تو پھر ہم اہل دل کے لیے عافیت طلبی سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہو سکتا ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ جناب اصغر علی انجینیر کا تعلق بوہرہ فرقہ سے ہے۔ مگر وہ وہاں بھی ناپسندیدہ اور نامقبول ہیں۔ اس لئے کہ وہ اصلاح پسند ہیں۔ اور زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہہ سکتے۔ ایک جامد اور رکے ٹھٹھرے ہوئے ماحول اور نظام میں تحرک اور تفاعل پیدا کرنے کی ایک مبارک اور مسعود کوشش کو جناب اصغر علی نے اپنا شعار بنایا ہے۔ معاملہ ایسے طبقہ سے آن پڑا ہے کہ ان کوششوں کے لئے انہیں داد تو کیا ملتی، بیداد ہی ملتی ہے۔ لیکن اصلاحی اور تعمیری کام کرنیوالے لوگ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کے لئے تو ایک بہترین انعام ایک صحت مند، اور ترقی یافتہ نیز خوشحال معاشرہ ہوتا ہے جس کی تعمیر کے لئے وہ بہت کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ پورے اسلامی معاشرہ کو برتر و بالا بنانے کا یہی اعلیٰ نصب العین ہے جس نے مصنف کو کسی ایک فرقہ تک محدود نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنے اصلاحی خیالات سے ایک بڑے طبقہ کو مستفید کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مخصوص فرقہ سے نکل کر تمام مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے دلچسپی کا اظہار اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اندرون اسلام چھوٹے چھوٹے اختلافات اور مغائرتوں کو ناقابل اعتنا تصور کرتے ہیں اور ISLAM AS A WHOLE دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک خاموش اور پراثر درس ہے ان علماء کے لئے جو بوہرہ، اثنا عشری، اہل سنت اور دوسرے فرقوں کو الگ الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔ میں سب سے پہلے جناب اصغر علی انجینیر کو ان کے اس جذبہ کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

شاہ بانو کیس کا ایک مثبت پہلو سامنے یہ آیا ہے کہ مسلمان مفکرین میں اضطراب اور تلاش کا جذبہ پیدا ہو چلا ہے اس طوفان سے آشنا ہونے کے بعد ممکن ہے اجتماعی طور پر مسلمان اپنے معاشرہ کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے موثر اقدام کر سکیں۔

مصنف کتاب نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کا نام "اسلام میں عورت کا درجہ" کیوں نہیں رکھا۔ "قرآن میں عورت کا درجہ" کیوں رکھا ہے۔ میں ان کے خیال سے بالکل متفق ہوں۔ جیسے اسلام آخر ہے قرآن کی صحیح تعبیر و تفہیم کا، اور تعبیر و تشریح۔ اور تشریح میں اکثر و بیشتر شخصی اور انفرادی اذہان کا [illegible] نظر آجاتا ہے۔ دار [illegible] احادیث نبوی کا تو یہاں تک [illegible] خود پریشاں خواب ما از کثرت تعبیرہا والی بات ہے۔ پہلو [illegible] کیا جال ہے کہ احادیث و روایات کے ہجوم بیکراں سے صحیح و غلط کی نشاندہی کر سکے۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن عباس جیسی شخصیت (جو بلاشبہ انتخاب احادیث کر کے معتبر روایات جمع کر سکتے تھے) مجبور ہو کر یہ کہنا پڑا کہ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ [illegible]

علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں بولا جاتا تھا۔ تو ہم آپ سے حدیثوں کی روایت کرتے تھے۔ لیکن جب ہر سرکش اور نافرمان سواری پر اونٹ پر چڑھنے لگے تو ہم نے آپ سے روایت حدیث کرنا چھوڑ دیا۔ ہم جنہیں صحاح ستہ کہتے ہیں (یعنی احادیث بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی) اس کی بھی ترتیب و تدوین بہت بعد میں ہوئی۔ یعنی تیسری صدی ہجری میں۔ روایات و احادیث عصری اعتبار سے اپنے منبع سے جتنی قریب ہوتی ہیں اسی قدر ان میں تحریف کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن ابن ماجہ اور موسیٰ تو اعلیٰ چوتھی صدی اور اوائل پانچویں صدی کی ترتیب کردہ ہیں۔ اس صورت حال میں حضرت عبداللہ بن عباس کے طریقہ فکر کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں نکل سکتی۔ اس انتشاری حالت میں بھی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج چودہ سو صدی ہجری کے بعد بھی اسلام کے دائرہ میں رہ کر جو اختلافات مختلف جماعتوں میں نظر آتے ہیں وہ فروعی زیادہ ہیں اور اصلی و بنیادی کم تو یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس دین مبین کی حفاظت اللہ پاک نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے ———— یہی وجہ ہے کہ اس کو مسخ کرنے اور کمزور کرنے کی ہر کوشش کے جواب میں ایک ایسی طاقت نمودار ہو جاتی ہے جس سے یہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

جناب اصغر علی انجینیر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہمیں معروضی اور سائنٹفک طریقہ کار کو اپناتے ہوئے احادیث کی ترتیب نو کرنی چاہئے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ اگر مختلف مکتبہ فکر کے علما عصر حاضر کے سماجی و اقتصادی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے متفقہ طور پر احادیث و روایات کی ترتیب اور فقہی مسائل میں ہم آہنگی کے لیے خلوص دل سے محنت کریں تو یہ کام اسلام اور عالم انسانیت پر ایک بڑا احسان ہوگا۔

جناب اصغر علی انجینیر نے قرآن اور اس کے احکامات کی روشنی میں عورتوں کا درجہ متعین کیا ہے۔ انہوں نے مختلف ذیلی عنوانات مثلاً اسلام سے قبل عورت کا سماجی مقام، قرآن اور عورت کا درجہ، قرآن اور طلاق، مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے حقوق، عورت اور قانون وراثت، عورت اور قانون شہادت، اور "قرآن اور جنسی مساوات" متعین کر کے اپنے مطالعات اور خیالات کی وضاحت کی ہے۔ ان میں سے بیشتر باتیں تو وہی ہیں جن پر عام علما کا اتفاق ہے اور تمام دنیائے اسلام انہیں برتنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ اصلاحیں تو وقت اور حالات خود منوا لیتے ہیں مثلاً اب عورت کی طرف سے عقد نکاح کے وقت ولی کی ضرورت پر کوئی اصرار نہیں کرتا۔ از روئے قرآن قانون وراثت کی تشریح بھی جناب انجینیر نے خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دی ہے۔ قرآن میں طلاق کو جس طرح مکروہ بتایا گیا ہے وہ بھی بالتفصیل بیان کر دیا گیا ہے۔ طلاق کے لیے "تین مرتبہ تین مجلسوں میں اور تین مہینوں میں" والی بات تو کچھ مفسرین اور فقہا کے یہاں پہلے سے موجود ہے ہاں اس اصول کو GERERALISE کرنے کی ضرورت ہے۔ حیرت ہے کہ علما نے اب تک اس پر زور کیوں نہیں دیا ہے۔ جہاں تک قانون شہادت کا معاملہ ہے تو آپ نے دیکھ لیا کہ پاکستان میں صرف مالی امور کے قضیوں میں گواہی کے لئے دو عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد کو رکھا گیا ہے۔ باقی جگہوں میں دونوں ایک کے مقابلہ میں ایک آتے ہیں۔ اور دو کے مقابلہ میں دو۔ اتنا تو ہم سب مان کے چلتے ہیں کہ ازل سے یہ دنیا MAN DOMINATI-NG SOCIETY کی تشکیل کرتی رہی ہے۔ مردوں کی بالادستی تو کہیں کہیں سے آشکارا ہو ہی جاتی ہے۔ مگر جب ہم اسلامی اصول و دستور کو دوسرے مذاہب کے اصولوں کے موازنہ و مقابلہ میں دیکھتے ہیں تو اس بات کا بین ثبوت ملتا

کہ اسلام میں عورت کی بالادستی کی بہت نفی کی گئی ہے۔ اور انسانی مظلومیت کو سہارا دے کر ایک متوازن اور منصفانہ معاشرہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان خطوں میں جہاں مذہبی نظام کی بجائے انسان کے بنائے ہوئے اصول کام کرتے ہیں (انسان MAN MADE NORMS کے مرتبین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فرسودہ مذہبی اصولوں کے مقابلہ میں ایسا اصول مرتب کر لیا ہے۔ جہاں عورت اور مرد مساوات کے حامل ہو گئے ہیں۔ وہاں دراصل اور بد تر حالت ہے مغرب کے مہذب (نام نہاد) ملکوں کو دیکھئے کیا وہاں عورت اب بھی مظلوم نہیں ہے۔؟ کیا وہاں طرح طرح سے طبقہ نسواں کا استحصال نہیں ہوتا۔ کیا وہاں عورتیں مردوں کا آلہ کار بن کر معاشرہ میں بڑے جرائم کا باعث نہیں بن رہی ہیں۔ اسلامی اور قرآنی مساوات کو چیلنج کرکے کوئی معاشرہ اس سے بہتر تو کیا اس کے برابر دستور بھی بنالے تو کچھ کہا جائے قرآن کریم میں دور نزول قرآن سے لے کر اب تک پیدا ہونے والے سماجی مسائل خصوصاً عورت و مرد کے حقوق و فرائض سے متعلق تمام احکامات موجود ہیں۔ اب ہم ان کا نفاذ نہ کریں یا غلط انداز سے نفاذ کریں تو اس میں قصور کس کا ہے۔ دوا موجود ہے، ہم کھاتے ہی نہیں تو علاج کیا خاک ہوگا۔ قرآن کریم میں مساوات مرد و زن کا فطری اور قابل عمل اصول بتا دیا گیا ہے جہاں مرد و زن کے قویٰ، ان کی طبائع، مزاج و رجحان اور خلقی خصوصیات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ان امور کا خیال رکھے بغیر مرد و زن کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ اور جب انصاف ہی نہ ہو تو مساوات کا مفہوم ہی نہیں بن سکتا۔

جناب اصغر علی انجینیئر نے قرآنی احکامات کی کچھ تو وہی تاویلیں پیش کی ہیں جو رائج ہیں اور بعض امور میں ہمیں متغیر حالات میں منصفانہ تاویلوں کی تاکید کی ہے۔ اس کتاب میں عام مسلمہ اصول و عقائد سے آگے بڑھ کر معاشرہ میں جن خفیف تبدیلیوں کے اشارے ملتے ہیں انہیں ہم سلسلہ وار طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) پردہ، پردہ کی صحیح نوعیت۔
(۲) اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ والی بحث
(۳) جنسی مساوات
(۴) آزادی نسواں (تمام شعبہ ہائے زندگی میں عورتوں کا مردوں کے مساوی ہونا)
(۵) طلاق اور اس کے مراحل و منازل
(۶) تعدد ازدواج
(۷) مسئلہ نان و نفقہ
(۸) مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا عقد ثانی۔
(۹) عورت اور وراثت
(۱۰) عورت اور شہادت

اب آیئے یہ دیکھیں کہ مذکورہ بالا مسائل کو بیان کرتے ہوئے جناب اصغر علی انجینیئر نے وہ کون سے قرآنی

احکامات ہمارے سامنے پیش کئے ہیں جنہیں ہم بھولے ہوئے ہیں۔

(۱) پردہ کے سلسلے میں آج مسلمانوں میں خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں میں جو پردہ کا تصور پایا جاتا ہے اس کا جواز قرآن سے بھی نہیں ملتا۔ اور بہت سے علماء و فقہا کے یہاں بھی نہیں ہے ——— ان حضرات نے وہ سختیاں عائد کر دی ہیں جو قرآنی حدود سے آگے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ غیر فطری لادے ہوئے اور بے تکے اصول خود بخود معاشرہ کے ارتقا کے ساتھ ٹوٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ پردہ کی سختی کے بارے میں علما اور فقہا نے جو اصول بتائے ہیں وہ کتابوں میں بند ہو چکے ہیں۔ ان پر اب عمل درآمد کون کرے ہاں کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا معاشرہ خود اپنے لئے ایک ڈھانچہ اختیار کر لیتا ہے۔

(۲) اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ والی بحث میں بھی زیادہ وقت صرف کرنا بیکار ہے۔ قرآن مجید کی آیت وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ صاف طور پر بتا رہی ہے کہ مرد اور عورت میں سے کسی ایک کا حق دوسرے پر زیادہ نہیں ہے یعنی دونوں برابر ہیں۔ اول الذکر آیت سے اس کی تطبیق بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ جناب اصغر علی انجینیر نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جسمانی اعتبار سے مرد کو قوی تر بنایا ہے۔ ہر ملک اور ہر خطہ کی عورتیں ان علاقوں کے مردوں کے مقابلہ میں کمزور اور نازک ہیں ہر مرد عورت کے مقابلہ میں زیادہ وزن اٹھا سکتا ہے، زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے۔ قوت میں زیادہ ہوتا ہے۔ مردوں کا مزاج خلقی طور پر بھی جارحیت کی عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ تیز اور زیادہ رعب داب کا حامل ہوتا ہے ——— یہ باتیں قدرت کی طرف سے متعین ہو کر آئی ہیں جس میں ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اس میں قدرت کی بہت ساری مصلحتیں ہیں۔ خانگی زندگی کو استوار اور خوشگوار بنانے کے لئے قدرت نے عورتوں میں نزاکت، دلآویزی، حسن و جمال، نرم دلی اور خوش خوئی محبت و موانست، صبر و تحمل کی جو خصوصیات بدرجہ اتم بخشی ہیں۔ ان سے مرد بالعموم محروم ہیں۔ اس کے بدلے مرد میں دوسری خصوصیات پیدا کر دی گئی ہیں۔ رجولی اور نسائی طبائع کے فرق کی وضاحت ضرورت نہیں ہے۔ یہ سبھی لوگ دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ اب اس کو کیا کیجئے کہ چھوٹا بچہ اپنے باپ سے خوف کھاتا ہے، اس سے ڈرتا ہے۔ ماں سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ ماں کے سامنے نڈر ہو جاتا ہے یہ تو ایک تقسیم ہے جو قدرت نے کی ہے۔ جسمانی طور پر مضبوط فرد کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کمزور کی حفاظت کا کام کرے، اس میں اہمیت و فوقیت کی کوئی بات نہیں ہے۔ دوسری طرف دیکھئے کہ یہی کمزور اور نازک عورت جب بیوی ہوتی ہے تو گھریلو امور میں اچھے اچھے صاحب ثروت اب شوہر بھی اس سے ڈرتے ہیں ؎

اکبر ڈرے نہیں کبھی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیوی کی نوج سے

کوئی ایسا بہادر لیکن شریف مرد ہے جو کہے کہ وہ بیوی سے نہیں ڈرتا ہے یہاں تو عملی زندگی میں اور خانگی زندگی میں عورتیں ہی مضبوط تر ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جنسوں کی خلقی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر [illegible] مساوات کا نعرہ لگانا دینے کا کام نہیں ہے ... اسلام نے عورت و مرد کے حقوق و ...

میں انصاف اور مصلحت کو پیش نظر رکھا ہے۔ MAN DOMINATION کو اسلام نے متوازن شکل سے کر عورتوں کے حقوق کو مردوں کے برابر کر دیا ہے۔ آج جو قومیں یا جو تہذیبیں عورت و مرد کو مساوی کر دینے کا دعویٰ کرتی ہیں اور اسلام پر اس لحاظ سے معترض ہوتی ہیں کہ یہاں یہ مساوات نہیں ہے تو ان سے پوچھئے کہ اب بھی ان کے یہاں شادی شدہ عورتوں کے ناموں کے ساتھ ان کے شوہروں کے نام کیوں لگائے جاتے ہیں۔ بیٹے، بیٹیوں کے ساتھ SON OF یا DAUGHTER OF کی جگہ پر باپ کا نام کیوں آتا ہے

(۳) جنسی مساوات کا جو صحت مند اصول قرآن مجید میں موجود ہے اس کے منصفانہ ہونے کا اقرار تو جناب اصغر علی انجینیر کو بھی ہے۔ اب رہا یہ کہ فقہاء اور علماء نے وضعی احادیث اور روایات کے ذریعہ ضرورتوں، مصلحتوں اور اپنے ذوقِ انتخاب یا رجحانِ طبع کے لحاظ سے ان میں تبدیلی کر دی ہے۔ تو ایسے کتنے امور ہیں، انہوں نے اس موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد کی آراء پیش کی ہیں۔ اور ان کی ستائش کی ہے۔ معقول حضرات میں سے اب کوئی بھی ضعیف اور مردہ احادیث پر یقین نہیں رکھتا۔ ایسی احادیث تو خود ہی مر چکی ہیں۔ جناب اصغر علی انجینیر نے بلاوجہ انہیں اتنی اہمیت دے دی ہے۔ مثلاً اب کوئی احمق ہی ہوگا جو یہ کہے گا کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی ناعاقبت اندیش اور عانیت دشمن ہی ہوگا جو یہ کہے گا کہ عورتیں بڑا فتنہ ہیں۔ اب کون مسلمان ہے جو عورتوں کے حق خصوصیت کو چھین رہا ہے۔ اس لئے ان امور کا حوالہ دے کر اسلام کو سرنگوں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ جو باتیں موجود ہی نہیں اور جنہیں امرائے علماء وقت اور معاشرت نے رد کر دیا ہے ان کی دہائی ہم کیوں دیں۔

(۴) آج کیا ماضی میں بھی مسلمان عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی رہی ہیں۔ اب تعلیم اور تہذیب کے فروغ نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ مسلمان عورتیں تمام شعبہ ہائے زندگی میں شریک کار ہیں۔ اس پر مسلمان علماء کا احتجاج بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک فطری ارتقاء ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور پھر ایسی صورت میں جب قرآن نے اس پر کہیں روک نہیں لگائی ہے چند غیر معتبر روایات کو چھوڑ کر فقہاء اور علماء نے بھی کہیں اس کے خلاف اپنا احتجاج نہیں کیا ہے۔

(۵) طلاق کی نوعیت اور اس کے مراحل کے سلسلہ میں جناب اصغر علی انجینیر نے قرآن کریم سے جن باتوں کا استنباط کیا ہے وہ صحیح ہیں۔ انہوں نے دورِ حاضر کے مفکرِ اسلام امام الہند حضرت ابوالکلام آزاد کے خیالات و نتائج سے بھی اتفاق کیا ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی مسلکوں میں اس امر پر مکمل اتفاق نہیں ملتا۔ علمائے عصرِ حاضر کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اس مسلک کو متفقہ طور پر قبول کرنا چاہئے جس پر خود مولانا ابوالکلام آزاد نے اصرار کیا ہے کہ یہی طریقہ سب سے زیادہ مستحسن، متعادل، انسانی اور اخلاقی معلوم ہوتا ہے۔

(۶) مرد شہوانی حیثیت سے زیادہ فعال ہوتا ہے۔ عورت جگانے پر جاگتی ہے۔ اور جگانے کا کام مرد کرتا ہے پھر سال کا ایک چوتھائی حصہ ایسا ہوتا ہے جب عورت جنسی اور شہوانی عمل کے لئے ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ استقرارِ حمل کی صورت میں آخری چند ماہ نیز ولادت کے بعد بھی کچھ عرصہ تک وہ جنسی عمل کے لئے بیکار رہتی ہے۔ یہ

لت ہو جب تک بچے چھوٹے ہیں بچے پیدا کرنے اور حفاظت صعقہ بنتے کے ہیں۔ لیکن مرد کے لیے ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مرد اور عورت کے ان خصائص کو مد نظر رکھے بغیر کوئی ایسا اصول وضع کرنا خلاف فطرت اور خلاف انصاف ہوگا جہاں تک مساوات کے نام پر دونوں کو برابر کر دیا جائے۔ مرد چونکہ فطری لحاظ سے فعال اور متحرک ہوتا ہے اس لیے اسلام نے مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے کر گویا دونوں کو برابر کر دیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس امر میں کم ذہن لوگ اجازت کو حکم سمجھ لیتے ہیں۔ اجازت ہمیشہ مشروط ہوتی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ مخصوص حالات اور شرائط کی موجودگی میں عورتوں کو بھی یہ اجازت ملنی چاہیے تھی۔ لیکن اس کا جواب یہ ہوگا کہ اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کی روشنی میں عورتوں کے ساتھ یہ مخصوص حالات شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ 'الشاذ کالمعدوم' یہ مسئلہ حضرت ابو حنیفہ کے سامنے بھی آیا تھا جس کا جواب ان کی صاحبزادی حضرت حنیفہ نے بڑے ایمائی انداز میں یوں دیا تھا کہ اگر دو مختلف رنگوں کے پانیوں کو ملا دیا جائے تو پھر انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب اس رمزیت کی تفصیل میں جانا بیکار ہے۔

(۷) جناب اصغر علی انجنیر اس بات سے متفق ہوں گے کہ طلاق علی الخصوص نان و نفقہ کا مسئلہ اقتصادیات سے جڑا ہوا ہے۔ اقتصادی طور پر پسماندہ طبقہ میں یہ بیماریاں زیادہ ہیں۔ عورت بھی بعد طلاق نفقہ کے لیے اس لیے طلب ہوتی ہے کہ وہ معاشی اعتبار سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ اگر معاشرہ خوشحال ہو اور معمولی خورد و نوش کے لیے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے تو نان و نفقہ کا جھگڑا ہی نہ ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسے ٹوٹے ہوئے اور معاشی طور پر بدحال معاشرہ میں مطلقہ عورتوں کے مسائل کیسے حل ہوں۔ جناب انجنیر کا موقف یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اس وقت تک نفقہ ملنا چاہیے جب تک وہ دوسری شادی نہ کرلے، یا اس کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو جائے۔ بات منصفانہ معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے مطلقہ پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ پہلے مشترکہ خاندان کا سلسلہ تھا اور جس لڑکی کو طلاق ہو جاتی تھی وہ لوٹ کر اپنے مشترکہ خاندان میں واپس آجاتی تھی۔ اور افرادِ خاندان اس کی کفالت کرتے تھے۔ اب قبیلائی خاندان میں وہ چیز ختم ہو گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عرب میں بیوہ اور مطلقہ کی دوسری شادی خراب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ رسول اکرم نے تو اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ یہاں ہندوستان میں اسے برا سمجھا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر جناب اصغر علی انجنیر کا موقف یہ ہے کہ مطلقہ کو بھی نفقہ ملنا چاہیے اس سلسلے میں میری گزارشات یہ ہیں، انجنیر صاحب ان امور پر غور فرمائیں۔

(۱) اگر کھینچ تان کر قرآن مجید سے یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ بعد عدت مطلقہ کو نفقہ دینا لازمی ہے (اور جناب اصغر علی انجنیر نے یہی کیا ہے) تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ معاشی اعتبار سے خوشحال طبقہ کے افراد کے لیے تو یہ مسئلہ ہی اہم نہیں ہے۔ اقتصادی بدحالی کے شکار لوگ جنہیں اپنے کھانے پینے کے لالے پڑتے رہتے ہیں۔ وہ اس قرض سے کہاں تک سبکدوش ہو سکیں گے، رکشہ کھینچنے والے، مزدوری کرنے والے، نادار اور کمزور لوگ، بیڑی بنانے والے افراد ان جیسے لوگوں کا کیا حال ہے جو روز و شام اپنے بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور گھر میں دو وقت چولہا بھی نہیں جل سکتا، وہ کیسے کما کر اور کس طرح پیٹ بھر گزر بسر کرتے ہیں ایسے افراد کے لیے اگر نفقہ کو قانوناً لازمی بھی کر دیا

میں بھر دینگے۔ تو ان کے لئے اتنا اطمینان تو ہوگا کہ دو وقت کا کھانا مل جائے گا۔ بچوں کی تعداد کو کم کرنے کا ــــ
اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ طلاق خاص طور پر نفقہ کا مسئلہ جیسا ہے۔ بچوں کی تعداد کے ساتھ منسلک ہے۔ ہمیں سب سے پہلے
یہ دیکھنا چاہئے کہ مسائل کا حل کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآنی اور اسلامی قوانین کا منہ چڑانے سے تو ہم اپنے
مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے؟

(ii) دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے ان چند مطلقہ عورتوں کے بارے میں تو سوچ لیا۔ مگر ان غریب اور نادار
عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو بدحال معاشی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے شوہر مر گئے ہیں۔ بیوہ عورتوں
کی ذمہ داری کس پر ہے؟ کیا یہ نادار اور مجبور اور زیادہ قابل رحم نہیں ہیں؟۔

(iii) آپ ان لڑکیوں کے لئے کیا قانون بنا رہے ہیں جن کے والدین نہایت نادار ہیں اور اسی غریبی کی وجہ
سے ان کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔

بھائی اصغر علی انجینیر صاحب! آپ اگر مخلصانہ طور پر غریبوں اور ناداروں کے بارے میں سوچتے ہیں تو
ایک ہی SECTIEN پر اظہار خیال کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں دیانت داری کے ساتھ یہ غور کرنا چاہئے کہ
ہم غریبوں کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ مخواہ اسلام و قرآن کو ہدف ملامت بنانا چاہتے ہیں۔ آپ تو قرآن کی
روشنی میں اسلام کو درست کرنا چاہتے ہیں (اور واقعی بعض نکات میں اس کی ضرورت ہے) کچھ لوگ تو سیدھے
قرآن کو بھی سدھارنے کے چکر میں ہیں۔ یقین جانئے قرآنی قوانین آج بھی IN TOTO قابل قبول اور قابل عمل
ہیں۔ اب ہم عمل ہی نہ کریں تو اور بات ہے۔ پھر تو کوئی قانون بنا دیجئے اس کا وہی حال ہوگا۔

(iv) اب ہم بیت المال کا انتظام نہ کریں تو اس میں قرآن و اسلام کا کیا قصور ہے بیت المال سے نہ صرف
غریب مطلقہ عورتوں کی کفالت ہو سکتی ہے بلکہ بیوگان اور ان کے بچوں کی پرورش بھی ہو سکتی ہے۔ شادی کے
لئے بیٹھی ہوئی نادار لڑکیوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ اس کے لئے جدوجہد کیوں نہیں
کرتے کہ تمام مسلمانوں کا ہندوستان میں ایک مرکزی بیت المال قائم ہو۔ اور مختلف ریاستوں میں اس کی شاخیں
ہوں۔

(v) اب ہمارا ذہن ہندوستان کی قدیم معاشرت کا شکار ہو گیا ہے۔ اور ہم بیوگان اور مطلقہ عورتوں
کی شادیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ تو اس میں قصور کس کا ہے نہ قرآن کا نہ اسلام کا۔ قرآن کے احکام، رسول اکرم کے
فرامین، خلفائے راشدین کے اطوار، ائمہ و فقہا کے اقوال ــــــ ان سبھوں میں آپ کو بیوہ اور مطلقہ کی
شادی پر اصرار ملے گا۔ ہم ایسا نہیں کرتے تو اس کا غصہ اسلام پر تو نہیں اتاریں گے۔ اس کے لئے تحریک چلائیے
بہت سے لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔

(vi) پہلے حصول زر کا واحد ذریعہ مرد تھا۔ اب عورتیں بھی شریک کار ہیں۔ ان کو آمدنی کا کوئی ذریعہ
نفقہ کے لئے چیخ و پکار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ہمیں مطلقہ کو زیادہ سے زیادہ ... فراہم کرنے
چاہئیں۔ اس کے لئے تعمیری اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) فَاَشْهِدُوا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

(۲) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُوْنُوا قَوَّامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵ : ۸)

(۳) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُوْنُوا قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ

(۴) اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰی اَنْ تَعْدِلُوا ..... (سورہ نساء ۱۳۵)

ان میں بھی ہر جگہ "اللہ کے لئے گواہی" دینے پر اصرار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حلف میں جسم و ذہن کی پاکیزگی، طہارت، اور تقدس لازمی ہے۔ جناب اصغر علی انجینیر اس نکتہ پر غور فرمائیں۔ اور بتائیں کہ قرآن مجید کی آیات سے فقہا و علما کا استنتاج غلط ہے یا صحیح

خدا کا شکر ہے کہ جناب اصغر علی انجینیر دینی مسائل میں غور و فکر کرتے ہیں۔ ان کا ذہن فعال ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر آدمی تشریح و تاویل میں بہت سے امور پر غور کرنا بھول جاتا ہے۔ اور پھر غلط نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ نیتوں کا حال تو خدا کو معلوم ہے۔ مگر دینی مسائل پر غور و خوض اور موجودہ مسائل سے انہیں ہم آہنگ کرنے کی جو سعی جناب انجینیر فرما رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ ہمارے علما شاید اس غور و فکر کے عادی نہیں ہیں۔ انہیں تو مسیلاد پڑھنے، منبر پر تقریر کرنے اور ذاکری کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی ہے۔ ان کے لئے تو قرعہ فال جناب اصغر علی انجینیر جیسے لوگوں کے نام نکلتا ہے ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

چلتے چلاتے یہ بھی عرض کر دوں کہ جناب اصغر علی انجینیر نے موجودہ اسلامی عقائد و اصول کو قرآنی احکامات سے منحرف قرار دیا ہے۔ لیکن صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں نکلتا۔ قرآن تو ایک دستوری کتاب ہے۔ اس کے نظام کی عملی شکل اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ وہ مانتے ہوں گے کہ قرن اولیٰ میں اسلام قرآن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب بھی اس میں چند جزوی اور فروعی تو بہ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ قرآن اگر روح ہے تو اسلام جسم ہے۔ جسم اگر گندا ہو گیا ہے تو اسے صاف کرنا چاہئے۔ نہ کہ سرے سے اسے دریا برد کر دیا جائے۔ آخر یہ بھی تو سوچئے کہ قرآن کریم کے جس آئین و اصول کے آپ مداح ہیں ان کا مظہر اسلام ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ FAITH HAS ALWAYS BEEN EXPRESSED IN ACTION قرآن مجید کو ایک FAITH مان لیں تو اسلام کے لئے ACTION کا کام کرتا ہے۔ اسے یہ کام کرنا چاہئے لہٰذا میری گزارش ہے کہ جناب انجینیر اسلام سے برات، نجات، گریز یا بیزاری کی باتیں کرنے کی بجائے یہ بتائیں کہ اس میں ان اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں کریں گے تو اس میدان کو ہی کھو دیں گے۔ جہاں انہیں کام کرنا ہے۔

میرے مندرجہ بالا تاثرات جناب اصغر علی انجینیر کی کتاب "قرآن میں عورت کا درجہ" کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ میری سادہ باتیں اسی تناظر میں اپنا مفہوم مکمل کر سکتی ہیں۔ لہٰذا ان تاثرات کے ساتھ اس کتاب کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کتاب مجھے جہاں سے بھیجی گئی ہے وہیں سے آپ بھی منگوا سکتے ہیں۔ یعنی پتہ یہ ہے:

CENTRAL BOARD OF DAWOODI BOHRA COMMUNITY
BUSHERI BUILDING, 3 JAIL ROAD
NORTH CROSS LANE, UMER KHODI
BOMBAY 400009

آنندی — ایک تجزیاتی مطالعہ

جمیل اختر نیباوی

(کیر آف منٹو پان دکان۔ تیواری ٹینک روڈ۔ ہندپیڑھی۔ رانچی)

غلام عبّاس کا افسانہ "آنندی" کا شمار اردو کے چند گنے چنے افسانوں میں ہوتا ہے۔ فنی اور تکنیکی لحاظ سے یہ کہانی اس قابل ہے کہ بار بار پڑھی جائے، لیکن صورتِ واقعہ قدرے مختلف ہے۔ نقادانِ فن نے اس سے بیجا طور پر اغماض برتا ہے۔ اس کی ہم رتبہ کہانیوں کے جہاں کئی تجزیے منظرِ عام پر آئے، وہاں اس کہانی کے سلسلے میں ایک مضمون بھی راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون اس افسانے کی تفہیم کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ قبل اس کے کہ میں "آنندی" کی فنی و تکنیکی خصوصیات کی وضاحت کروں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اختصار پیش کر دیا جائے۔

بلدیہ میں ایک ریزولیشن پیش ہوتا ہے کہ زنانِ بازاری کا عین وسط شہر میں رہنا بُرے اثرات پیدا کرتا ہے، اس لئے انہیں شہر بدر کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے لئے جو علاقہ تجویز ہوتا ہے وہ شہر سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ بلدیہ کے اس فیصلے کے خلاف بیسوائیں احتجاج کرتی ہیں لیکن بے سود۔ ان کے مملوکہ مکانوں کو نیلام کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ چار و ناچار کچھ بیسوائیں مجوزہ علاقے میں بسنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ زمین صاف کروائی جاتی ہے۔ [illegible] پاس کروائے جاتے ہیں اور مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس کام کے لئے کاریگر، مزدور اور [illegible] کے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی وہاں [illegible]۔ ایک پرانی مسجد کی مرمت کی جاتی ہے۔ ایک قدیمی [illegible] ہو جاتی ہے اور وہاں ایک [illegible]

ہے۔ چھ مہینے کے بعد مکانات بن کر تیار ہو جاتے ہیں تو بیسوائیں وہاں منتقل ہو جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی کنجڑے، کبابی، قصائی، بنیے، پنساری، حلوائی، نانبائی، شیر فروش، بساطی، حجام، درزی، دھوبی، حکیم، ڈاکٹر، فوٹو گرافر، گھڑی ساز، سازندے وغیرہ بھی آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک تھیٹریکل کمپنی بھی آ جاتی ہے۔ ڈاکخانہ، تھانہ، بینک، اسپتال، اسکول، کالج، سینما ہال اور کارخانے وغیرہ کھل جاتے ہیں۔ روشنی، پانی اور صفائی وغیرہ کا محکمہ قائم ہو جاتا ہے۔ گویا اس دور افتادہ اور بنجر علاقے میں ایک شہر آباد ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار لکھتا ہے:

"اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی ایک بھرا پُرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری اور جیل خانہ بھی ہے۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے، ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بینک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بینکوں کی شاخیں ہیں۔"

شہر سے دو روزنامے، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسالے [illegible] نکلتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی

ایک منتقی، ایک ملی، ایک زنانہ، اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں دو مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری اسپتال ہیں، جن میں ایک صرف عورتوں کے مخصوص ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"سارا شہر بھرا پُرا، صاف ستھرا، اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق، اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنان بازاری رہتی ہیں۔"

چنانچہ ایک بار پھر بلدیہ کا اجلاس ہوتا ہے اور یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ زنانِ بازاری کا عین وسط شہر میں رہنا برے اثرات پیدا کرتا ہے اس لئے انھیں شہر بدر کر دینا چاہئے اور اس بار جو قطع زمین ان کے لئے تجویز کیا جاتا ہے وہ بارہ کوس کے فاصلے پر ہے۔

یہاں افسانہ نگار نے آخری جملے میں یہ نکتہ پوشیدہ رکھا ہے کہ خواہ فاصلے دس گنا بڑھا دیئے جائیں، یہی داستان بار بار دہرائی جاتی رہے گی۔ وہ قطع زنانِ بازاری کے اڈے کو عین وسط میں لئے ہوئے بارونق شہر بنتا رہے گا۔ تجارتی مراکز اس کے گرد کھلتے رہیں گے۔ بلدیہ کا اجلاس ہوتا رہے گا۔ بیسیوں شہر بدر ہوتی رہیں گی۔ گویا یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

چونکہ افسانہ نگار نے "آنندی" میں زنانِ بازاری کے ایک اجتماعی مسئلہ کو چھیڑا ہے، اس لئے اسے اس بات کا موقع نہ تھا کہ وہ کسی فرد کی زندگی میں جھانک کر دیکھتا یا اس کے [illegible] کیفیت و احوال بیان کرتا، لہٰذا اس نے اس افسانے میں کسی فردِ واحد کی داستانِ حیات پیش نہیں کی ہے۔ اور نہ ہی اس کی زندگی سے متعلق کسی ایک واقعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ اس میں پورے شہر کو بستا بستا دکھایا ہے۔ اور اس طرح قاری کو ایک اجتماعی احساس سے دوچار کیا ہے۔ یہاں ایک یا دو کردار نہیں بلکہ پورا شہر "آنندی" کا کردار ہے۔ اس شہر میں مزدور بھی ہیں اور کارندے بھی، معمار بھی ہیں اور تجار بھی، دکان دار بھی ہیں اور خریدار بھی۔ یہاں اوباشوں اور بدمعاشوں کی بھیڑ بھی ہے اور فقیروں اور بھکاریوں کی گہما گہمی بھی۔ اس شور اور گہما گہمی میں ایک طبقہ مرکزی حیثیت سے نمایاں طور پر ابھرتا ہے یعنی طوائفوں کا طبقہ۔

اس افسانے کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو کردار نگاری کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ پلاٹ کی بیساکھی استعمال کی گئی ہے اور نہ ہی مکالموں کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بنایا گیا ہے۔ بلکہ اس میں داستان خود مصنف کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ "آنندی" کی ساری عمارت بیانیہ ہی پر کھڑی کی گئی ہے۔ افسانے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بذاتِ خود شہر بسنے کے منظر کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور قاری کو اس منظر کی تفصیل بتاتا جا رہا ہے۔ یہ تفصیل اتنی بھرپور اور مکمل ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ کوئی بھی چیز نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ مثال کے لئے ایک اقتباس دیکھئے:

"ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے کھٹیا، ریوڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا کر پیسے کے دو دو شکر کے شربت کا گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی تو وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لایا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا کہ گھر سے سری پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے، اور مٹی کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور

اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں بھیڑیا کا مزہ چکھانے لگا۔"

مذکورہ اقتباس کے پیش نظر یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ بیانیہ نثر کی عمدہ ترین مثال ہے، کتنا فطری اندازِ بیان ہے۔ اور کتنی خوبصورت جزئیات نگاری ہے، ایک ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے دیہاتی بڑھیا کا ذکر کیا تو اسی پر بس نہیں کیا کہ وہ پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اور کچھ بیچنے کے لئے اس بستی میں چلی آئی تھی بلکہ اس کی پوری تفصیل بھی پیش کردی۔ یعنی یہ کہ اس کے ساتھ اور کون تھا اور کتنا بڑا تھا۔ اس کے خوانچہ میں کون کون سی چیزیں تھیں اور کیسی تھیں، بکری تھا تو کیسا تھا۔ مٹھائیاں تھیں تو کن کن چیزوں سے تیار ہوئی تھیں۔ اس نے بیٹھنے کے لئے کس جگہ کا انتخاب کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح جب کنجڑے کا ذکر کیا تو اس کے متعلق تمام تفصیلات بھی بیان کردیں۔ یعنی وہ کون کون سی چیزیں کہاں سے لایا۔ کن چیزوں میں لایا۔ کہاں بیٹھا اور کیا صدا لگائی۔ پھر اختصار دیکھئے کہ اتنے کم الفاظ میں اتنی ساری تفصیلات کیسی خوبصورتی اور کتنی عمدگی سے سمودی گئی ہیں۔ زبان بھی انتہائی صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ کہیں بھی جھول اور ابہام کا احساس تک نہیں ہوگا۔ روانی اور سلاست علیحدہ ہے۔ یہی کیفیت کم و بیش پورے افسانے میں موجود ہے۔

افسانے کے آغاز کے سلسلے میں یہ تکنیک اپنائی جاتی رہی ہے کہ افسانہ نگار ابتدا ہی میں اپنے موضوع سے براہ راست جڑ جاتا ہے اور اس طرح کہانی کے آغاز ہی میں آئندہ کے واقعات اور عمل کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ آندھی کا آغاز بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ یہ اتنا مکمل جامع ہے کہ پورے افسانے کا نچوڑ اس میں سمٹ کر آگیا ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے:

"بلدیہ کا اجلاس نو بجے شروع ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کا ایجنڈا [illegible] یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کردیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔"

ان چند جملوں کے پڑھنے کے بعد ہم ایک عجیب تجسس سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ بلدیہ کا یہ اجلاس ایک غیر معمولی اجلاس ہے۔ خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ یہ جملہ ہمیں مسائل کی شدت کا احساس دلاتا ہے۔ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ زنانِ بازاری کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے تو کیونکر؟ پھر یہ سوال بھی ذہن میں سر اٹھاتا ہے کہ اگر انہیں شہر بدر کر دیا گیا تو ان کا انجام کیا ہوگا؟ کیا انہیں کوئی ٹھکانہ نصیب ہوگا یا وہ یونہی خانماں برباد کی طرح بھٹکتی رہیں گی؟ یہ سوالات کچھ اس طرح ذہن و دماغ کو اکساتے ہیں کہ ہم پورے افسانے کو پڑھنے اور اس کا انجام جاننے کے لئے مضطرب ہو جاتے ہیں۔

آندھی کا آغاز جتنا جاذبِ نظر ہے، اتنا ہی اس کا انجام بھی دلکش ہے۔ اس کا اختتام، اختتام بھی ہے اور نقطۂ آغاز بھی۔ کہانی اپنے انجام پر پہنچ کر ایک نئے آغاز کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

یہ کہانی ایک ایسے قطعۂ زمین پر وقوع پذیر ہوتی ہے جو شہر سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے اور جہاں ایک نیا شہر آباد ہو رہا ہے۔ لیکن یہ چھ کوس کا فاصلہ ہی [illegible] نہیں ہے بلکہ یہ فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ [illegible] بار جب بلدیہ کا اجلاس ہوتا ہے اور اب کی [illegible] زمین میواتیوں کے لئے تجویز ہوتا ہے وہ شہر سے [illegible] کوس کی دوری پر ہے۔ لیکن شہر [illegible] آخر نہیں۔ بلکہ یہ بڑھتی جاتی [illegible] معنوی [illegible] تمام حد بندیوں کو توڑ کر آگے بڑھتی [illegible] ایک شہر کا بستا [illegible] [illegible] وقت [illegible] وہ تک [illegible] ہوتی ہیں۔ یہ شہر [illegible]

ے ایک بارونق شہر بنے تھا تقریباً تین برس تک
تے ہیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ کہانی پھر بھی اختتام
نہیں ہوتی ہے اور گھوم پھر کر اپنے نقطۂ آغاز پر آجاتی
میں احساس ہوتا ہے کہ ایک اور نئے شہر کو بسنے
تین برس لگ رہے ہیں۔ یہاں ماضی حال میں اور حال
میں سفر کرتا نظر آتا ہے۔ تینوں زمانے کی سرحدیں
سے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ زنانِ بازاری کے
بسنے کا عمل ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ہر
میں دہرایا جاتا رہا ہے۔ یہ مسئلہ ماضی کا بھی ہے اور
کا بھی اور مستقبل کا بھی۔

کی کہانیوں میں طوائفوں کی پیش کش کوئی نئی
نہیں ہے، بلکہ یہ ایک روایتی اور گھسا پٹا موضوع
جس کی نشاندہی داستان سے لیکر افسانے تک
کی جا سکتی ہے۔ البتہ طوائفوں کے سلسلے میں فن کاروں
اپنی نقطۂ نظر کا اختلاف ضرور رہا ہے۔ داستانوں
عام طور پر انھیں شر، گمراہی، فتنہ پردازی، عیاشی
اور معصیت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔
ہے اس نکتۂ نظر کے پس پشت مذہبی، اخلاقی اور
میلانات کی کارفرمائی تھی۔ آنندی میں افسانہ
نگار نے جس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بیسوائیں
تہذیب و تمدن کا ایک لازمی جز ہیں/ وہ انسانی معاشرے
ایک ضرورت ہے۔ انہیں عضوِ ناکارہ سمجھ کر علیحدہ نہیں
کیا جا سکتا۔ ہمارے سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو
جنسی آسودگی کے لئے بیسواؤں ہی کا سہارا لیتا ہے۔
ایسی صورت میں زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دینا بھی
کر کے رکھ دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب
آنندی کی بیسوائیں ایک اجڑے ہوئے ویران مقام
آباد ہوتی ہیں تو کچھ ہی دنوں میں وہ جگہ جنت نشان
ہے۔ اس سنسان بستی میں ایک بہار آجاتی ہے۔
بسنے لگتی ہے اور وہاں ایک بارونق شہر آباد
ہے۔ گویا وہ ایک ایسا محور ہے جس پر شہر کا
گردش کرتا ہے۔ شاید اسی لئے طوائفوں کے اکھڑنے

شہر کے عین وسط میں ہیں، اور بلدیہ کا ایک رکن پہچان
ہے کہ:

"معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر
اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور
تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت
دیدی گئی۔"

غلام عباس کا رویہ طوائفوں کے ساتھ ہمدردانہ ہے۔ اسے
ہم انسان دوستی کی نئی تفسیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو لازمی
طور پر ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس
سلطان گنج۔ پٹنہ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائیڈ
روڈ۔ گیا سے شائع کیا۔

درد اور شعلہ

شمیم اعظمی (لکھنؤ یونیورسٹی)

کتنی خاموش ہوائیں ہیں کوئی بات ہے کیا
کتنی سنسان فضائیں ہیں کوئی بات ہے کیا

نیلگوں چہرہ وہ آکاش کا اداس ہے کیوں
اور گلشن میں ہر اک پھول پریشاں کیوں ہے
آج کوئل کی بھی آواز ہے کچھ خوف زدہ
آج امید کا ہر کھیت بیاباں کیوں ہے
آج جھرنوں کی صداؤں میں بھی سنگیت نہیں
آج دریا کی ہر اک موج ہراساں کیوں ہے
آج ماحول کے ماتھے پہ شکن ہے کیسی
آج احساس کے سینے میں چبھن ہے کیسی

کیا یہ بھارت ہے جہاں پیدا ہوئے تھے گوتم
جو کہ دیتے رہے دنیا کو محبت کا پیام
کیا یہ نانک کی یہ چشتی کی ہے دھرتی اپنی
جن کے اخلاص کے دیوانے تھے سب خاص و عام
کیا یہ رشیوں کی امیدوں کا چمن ہے اپنا
جن کا آئین کی تعمیر میں تھا اونچا مقام
کیا لگتا ہے یہاں آج وہ جذبات نہیں
وہ خلوص اور محبت کی کوئی بات نہیں

آج کیا بات ہے اس ملک کا ذرہ ذرہ
دن بدن جیسے کہ شمشان ہوا جاتا ہے
آگ نفرت کی ہر اک سمت لگی ہے جیسے
آج ہر آدمی حیوان ہوا جاتا ہے
دھرم کے نام پہ بکتا ہے سر عام لہو
دھرم جب ظلم کا عنوان ہوا جاتا ہے
قتل کا گرم ہے بازار یہ حالت کیا ہے
کوئی بتلاؤ یہ آج کا بھارت کیا ہے

جشن محلوں میں مناتے ہیں ملوں کے مالک
اور مزدور ہے ہر طرح سے برباد یہاں
جن کے خون اور پسینے سے اگا کرتی ہے فصل
ان کسانوں کی تمنائیں ہیں ناشاد یہاں
رات دن کرتے ہیں جو لوگ دماغی محنت
زندگی ان کی بھی ہے پیکر فریاد یہاں
زر پرستی میں پسینے کی حقیقت کیا ہے
آج محنت کی مرے دیش میں قیمت کیا ہے

کون ہے جس سے ہم انصاف کی امید کریں
اب عدالت میں بھی رشوت ہے سر عام یہاں
چھوٹ جاتے ہیں کبھی قتل کے مجرم بھی یہاں
کتنا آسان ہے دولت سے ہر اک کام یہاں
کیسا انصاف ہے چھپتا ہے غریبوں کا لہو
بے گناہوں کے لئے ہے فقط الزام یہاں
یہاں انصاف نہیں لوٹ ہے مکاری ہے
ملک کے ساتھ سر عام یہ غداری ہے

کیا اسی دن کے لئے ملک یہ آزاد ہوا
کہ ہر اک سمت یہاں ظلم کا بازار لگے
کیا اسی دن کے لئے خون شہیدوں کا بہا
کہ امیروں کے یہاں پیسوں کا انبار لگے
کیا اسی دن کے لئے ملک سے انگریز گئے
کہ یہاں دنگا فسادات کی بھرمار لگے
آج برباد شہیدوں کا وہ ارمان ہے کیوں
ہے فضا میں یہ گھٹن ذہن پریشان ہے کیوں

نوجوانو! تمہیں اس ملک کی عظمت کی قسم
تم کو حالات کی تصویر بدلنی ہوگی
[illegible] تمہیں دھرتی کی الفت کی قسم
تم کو بگڑی ہوئی تقدیر بدلنی ہوگی
[illegible]
اے عزیزو! تمہیں [illegible]
آؤ سب مل کے کہیں آج بغاوت کر دیں
ختم اس ملک سے دولت کی سیاست کر دیں ●●

غزلیں

ڈاکٹر خورشید ...

جو مستِ پندار ہوا وہ راہ پہ لانا کیا جانے
خود راہ نہ پائی ہو جس نے وہ راہ پہ لانا کیا جانے

جو اپنی ہستی گم نہ کرے، اللہ کو پانا کیا جانے
قطرہ نہ فنا ہوئے جب تک، دریا بن جانا کیا جانے

جو جھک کے سامنے آیا "میں"، وہ آنکھ لڑانا کیا جانے
دل آپ نشانہ بنتا ہے، وہ تیر چلانا کیا جانے

ہو جس کو لگی کچھ وہ جانے یا جس پہ گزری وہ سمجھے
جس پر نہ پڑی افتاد کبھی گرتوں کو اٹھانا کیا جانے

اقوال ہیں کچھ، اعمال ہیں کچھ، کب دل نے زباں کا ساتھ دیا
جس سے نہ چکا گھر کا جھگڑا، اوروں کو ملانا کیا جانے

چوری کا جو کھٹکا نہ رہا آرام سے سوئے راتوں کو
پابندۂ زر کو نیند کہاں، وہ نیند کا آنا کیا جانے

کہیے میاں کی باتیں کچھ، تو کہیے ایماں والوں سے
جو سر تا پا شر سے ہو ابھرا، وہ شرمانا کیا جانے

تو اپنی خبر لے اے زاہد، غیروں کا رونا رہنے دے
جب راہ اپنی تجھ سے نہ بنی، تو میری بنانا کیا جانے

تم گرم ہوا، تم لال ہوئے، وہ آگ ہوا، تم بھاگ چلے
جو منہ کی خاطر بھٹک دیکھے، وہ منہ کی کھانا کیا جانے

جیتے جی جس نے بھولے سے دیدار سے روشن دل نہ کیا
وہ میری تربت پر آ کر اب شمع جلانا کیا جانے

ظالم کے مظالم اس جگ میں جو ٹھنڈے دل سے سہتے ہیں
کل قہرِ غضب بن کر اٹھے وہ جوش میں لانا کیا جانے

ہو جس کو سنانا بھی مشکل فریاد خورشیدِ محزوں کی
بیدادِ محبت کا اپنے، وہ دل بہلانا کیا جانے

جوہر صدیقی (بنارس)

راہِ شوق اتنی بھی ہموار نہ ہونے پائے
سرخرو حوصلۂ دار نہ ہونے پائے

سوچتے رہ گئے ہم آپ سے کہنے کے لئے
ایک بات ایسی کہ انکار نہ ہونے پائے

اس طرح پاکیٔ داماں کی حکایت کہیے
اشک آمادۂ گفتار نہ ہونے پائے

مجھ کو اک شمع حقیقت کی جلانے دیجے
کم اگر رونقِ دربار نہ ہونے پائے

زیرِ دیوار جو گزری ہے کسی پہ ہمدم
وہ قیامت پسِ دیوار نہ ہونے پائے

غزلیں

[illegible] دانشوری

پھر بھی اسکا بیاں دردناک ہے
منافقت ہی سب سے بڑا انہماک ہے
جا بجا ہیں اسکے دھندلکے ہی عکس ریز
غلط بھی ہے غم کا بڑا خوفناک ہے
یہ شخص ادھر ہوں تو وہ کہیں ہی بیقرار
دلوں کے درد و غم میں بڑا اشتراک ہے
ہے دل مرا خلا میں تجسس سے ہم کنار
بالیدگی شعور کی اب تابناک ہے
پہنچے ہیں دشت دشت کچھ ایسے بھی ہوشمند
دامن کا چاک کیا، گریباں ہی چاک ہے
میں کیوں کسی سے بغض رکھوں دل میں اے غنی
میرا ضمیر ایسی خباثت سے پاک ہے

منظر اعجاز

نظر میں اپنی ترے خواب کون پالے گا
یہ شہرِ سنگ ہے کوئی نہ آئینہ لے گا

چھو لے سکا نہ ترے سوزِ آگہی کی خبر
ترا نتیجۂ فکر اور فلسفہ لے گا

ہے گرد گرد ہر اک لمحۂ شعور یہاں
جنوں ہی تیرا ترے آئینے اجالے گا

خیال و خواب کی پرچھائیاں سلگتی ہیں
نگار خانۂ حیرت ہے بول کیا لے گا

اعجاز طالب

سامنے سب کے تم ندامت رکھو
خود کو اتنا کھلا ہوا مت رکھو
تجھ کو چہرہ اگر ڈراتا ہے
سامنے اپنے آئینہ مت رکھو
جن سے کوئی واسطہ نہیں کچھ بھی
[illegible] سے واسطہ مت رکھو
ہاتھ دھونا پڑے گا گھر سے بھی
اپنی دولت پہ ذہانت رکھو
دل کی باتیں زباں کو کہنے دے
اپنے اگر بھی نا صداقت رکھو
خشک ہو جائے گی زباں طالب
اپنے ہونٹوں کو بے [illegible] رکھو

غلام ہاشمی

تخیل کے شانوں پہ احساس کا پر رکھو
آکاش پہ اڑ کر بھی دھرتی پہ نظر رکھو
دل کو تجھے ٹھوکر کیوں اس پہ نظر رکھو
گر اپنے میں کیوں ہو تم غیروں کی خبر رکھو
کچھ خوف نہیں شب ہو تم کو گر [illegible] پائی کا
یہ چاہتے ہیں خود [illegible] جاری جو سفر رکھو
خود باب گلشن کا ہر غنچہ و گل لیکن
معذور ہی خاطر کانٹوں کا شجر رکھو
فنکار کبھی خود فنکار نہیں دنیا
دامن بھی اگر اپنے کچھ علم و ہنر رکھو
[illegible] ہوا ہر لمحہ جہاں [illegible]
اس شہر میں [illegible] شیشے کا ذکر رکھو

اعجاز احمد اعجاز

ہے نہیں کوئی یہاں انسان کا
دوست ہے ہر ایک دسترخوان کا

دل کا سرمایہ چرانا ہے وہ شوخ
بس یہی ہے کام بے ایمان کا

ہے جلائے بیٹھا وہ شمعِ امید
کیا بھروسہ کر دلِ نادان کا
چھپ کے آئے کیوں نہ مجھ کو دیکھنے
پاس رکھتا ہے وہ اپنی آن کا
قتل پہ آمادہ ہے اعجاز کے
ناز و عشوہ رکھتا ہے اس شان کا

[illegible] ساجد

ٹھان لی ہے اب کریں گے وحشی موجوں کا سفر
عمر بھر ہم سے نہیں ہوگا کناروں کا سفر
سر برہنہ پھیلی ہیں ہر طرف پرچھائیاں
پایۂ تکمیل کو پہنچا اجالوں کا سفر
کون کس کے جسم کے ٹکڑے چنے گا اور کیوں
راستے پیروں کے ہیں سب ان پہ شیشوں کا سفر
دھوپ میں دن گزر جاتا ہے پانی ڈھونڈتے
شام آتی ہے تو کرتا ہوں میں شعلوں کا سفر
سب لبادے کاغذی ہیں [illegible]
پھر سمندر کی طرف ہے آندھیوں کا سفر
آبرو جو بچا [illegible] سب
ختم ہونے سے رہا ساجد سرابوں کا سفر

اس کی آواز سن کر ادھر آگئی ـــــ یہ کچھ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی اور پریشان سی لگی۔ رینو کو دروازے کے پاس کھڑی دیکھ کر بولی۔

"ارے تم یہاں ہو؟ میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ باہر چل کر دیکھو کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے پاپا دولہا اور تمہاری ممی دلہن بنی ہیں۔"

"جھوٹ بکتی ہو ـــــ میری ممی اور پاپا کیوں دولہا دلہن بنیں گے۔ تیرے خود بنیں۔"

"ارے واہ! میں جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہی ہوں۔ تم خود چل کر دیکھ لو نا ـــــ ارے دروازہ تو بند ہے۔"

"اچھا میں کسی سے کھلواتی ہوں۔" یہ کہکر وہ آگے بڑھ گئی اور پھر رینو باہر دیکھنے لگی۔

سامنے چبوترے پر بنے چھوٹے سے مندر میں منڈپ سجا تھا اور دولہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے سہرا ہٹا تو اس نے دیکھا کہ یہ اس کے پاپا ہیں۔ اس کا ننھا سا ذہن الجھنے لگا۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھی کہ دلہن کو جے مالا ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا اور دولہا نے بھی اس کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ اس کے بعد پھیرے پڑنے لگے۔ تبھی اسے دلہن کا چہرہ نظر آگیا جو اس کی ممی سے مشابہ تھا اور دلہن کے روپ میں وہ لگ رہی تھیں بہت اچھی لگیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ لیکن اب اسے کامنی کی بات سچ لگنے لگی تھی۔

پھر اسے چاچا، چاچی، بابا اور محلہ و خاندان کے بہت سے لوگوں کے چہرے نظر آئے جو منڈپ کے اردگرد جمع تھے۔ تھوڑی دیر بعد بابا پھر اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ رہے۔ تبھی کامنی اپنی ممی کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہاں آگئی اور کہنے لگی۔ "ممی دروازہ کھول دو۔ رینو دیدی اندر بند ہیں۔"

اس سے پہلے کہ دروازہ کھلتا اس کی چاچی بھی ادھر ہی آگئیں۔ اور وہ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ چاچی کامنی کی ماں سے کہنے لگیں "کتنے شرم کی بات ہے کہ دس سال پہلے گھر سے بھاگے ہوئے جوڑوں کی آج برادری و سماج کے سامنے شادی ہو رہی ہے۔ جبکہ ان کے تین بچے بھی ہو گئے ہیں۔ ہائے رام کیسا زمانہ آگیا؟"

"کلجگ ہے کلجگ! ـــــ کہیں ایسی بھی شادی ہوتی ہے۔ پہلے گھر سے بھاگ گئے، برادری سے نکالے گئے۔ بچے پیدا ہوئے ـــ معافی مانگ کر پھر برادری میں شامل ہو گئے۔"

ابھی یہ دونوں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ بڑی چاچی بھی آگئیں۔ اور کامنی کی ماں کی باتیں سن کر بولیں۔ "سماج سے بغاوت کر کے کوئی عزت کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ بچہ ہے کہ جوانی کی بھول کا پرائشچت اب ہوا ہے۔ انھوں نے برادری والوں سے معافی مانگ کر بھگوان کو خوش کر لیا ہے۔ برادری اور سماج جسے معاف کر دیتا ہے بھگوان بھی معاف کر دیتا ہے۔ اور آدمی اگر سچے دل سے اپنے پاپ کی معافی مانگ لے تو پاپ دھل جاتا ہے۔ اور آدمی پوتر ہو جاتا ہے۔"

اس کا ننھا سا ذہن ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ان الجھے سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ اس کی ممی اور پاپا کی شادی ہو رہی تھی۔

اس کی چاچی بھی ان کے ساتھ پنڈال میں چلی گئیں جہاں باراتی کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے جاتے ہی کامنی کی ممی نے دروازہ کھول دیا۔ ـــــ اور کامنی اس سے دوڑ کر لپٹ گئی۔ پتہ نہیں کیا سوچ کے ذہن میں آیا کہ وہ کامنی سے لپٹ کر سسک پڑی۔ اور اسے روتا دیکھ کر معصوم نینو اور ننھا راجو بھی رونے لگے۔

تسنیم صادقہ
[illegible]

زیرو آور

آج نیلی کی باتوں نے مجھے اس قدر جھنجھوڑ ڈالا کہ میں بالکل ہکا بکا سی ہو کے رہ گئی تھی۔ آخر نیلی نے اتنا بڑا اور اتنا اہم فیصلہ آپ کیسے کر لیا۔

ایک عجیب سی دہشت میرے اندر در آئی تھی —— ایسا لگ رہا تھا جیسے انجانے میں کوئی تیز دھار والا ہتھیار مجھے میری آتما تک کو زخمی کر گیا ہو ——

آج ایسی دہشت میں، میں گھنٹوں باہر بیٹھی، سڑک سے گزرنے والے ہجوم کو دیکھتی رہی —— شاید اسلئے کہ اس بات نے میرے اندر نیلی سے متعلق جو خوف بھر دیا تھا —— اس خوف کو ہی ہجوم کے احساس میں ڈبو کر ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

مگر یہ صرف میری خود فریبی تھی —— اندر کا احساس اتنا شدید تھا کہ کائنات کو سمیٹ کر بھی خود کو ہلکا نہ کر سکا۔

یہ جو لوگوں کا ہجوم ہے۔ یہ کتنے سارے لوگ بالکل ایک طرح سے جیتے اور مرتے ہیں —— میں بہت دیر تک انسانوں کے اس سمندر کو دیکھتی رہی —— بالکل ایک سے [illegible] ہوئے انسان —— اور دیکھتے دیکھتے میں خود کو [illegible] کی طرح محسوس کرنے لگی جس کی قوت فیصلہ سلب کر لی گئی ہو —— اور جس کا قلم نے جس کی سیاہی ڈوب ڈوب کر صرف سزائے موت بنام سزائے حیات لکھنے پہ مجبور کر دیا گیا ہو —— سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی [illegible] نہیں سکی، کچھ کر نہیں سکتی —— کچھ بھی میرے اختیار [illegible]

[illegible]

ہر وقت یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور نہ جانے کب تک یہ [illegible] رہے گا —— زندگی کا کلوز اپ اسقدر بھیانک ہوتا [illegible] اس کا احساس مجھے دھیرے دھیرے ہوا تھا —— اور [illegible] احساس آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا ہے اس کی جڑیں بہت [illegible] ہوتی ہیں ——

نیلی زندگی واقعی کیسی سراب نما سچائی ہے —— [illegible] کبھی اسے قوس قزح کے رنگوں میں ڈھونڈ کر سیپ کے موتیوں کی طرح اپنے اندر محفوظ کرتی تھی —— کبھی مجھے [illegible] کے قطروں کی طرح شفاف اور مجھل محسوس ہوتی تھی —— [illegible] کبھی برستی برسات کی خواب آفریں راتوں کی طرح [illegible] تک ان دیکھی فضاؤں کی خوشبو سمیٹ لاتی جھا [illegible] یک اتنی بے رنگ، اتنی فضول اور اسقدر بے معنی اور غیر ضروری ہو جائے گی۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا —— جیسے کبھی پرس کو الٹ کر صاف کرتے ہوئے بہت سے [illegible] مڑے تڑے کاغذات بے دلی سے پھینک دیتی ہوں جیسے کبھی بڑی حفاظت سے رکھتا تھا —— ٹھیک اسی طرح تھوڑے تھوڑے سے ٹائم گیپ کے بعد بہت سارے تازہ احساسات میلے اور بے معنی ہو کر بہت [illegible] دیتے ہیں یہ تو میں جانتی ہوں لیکن چہروں اور [illegible] ہجوم اس طرح ہر ایک پہچان اور ہر ایک آرزو کو [illegible] مجھے اس کا پتہ نہ تھا۔

آج میرے اندر عجیب سی تاریکیاں [illegible]

[illegible]

ہوتا۔ اس کا علم ساری ہوتی تب آتی۔ انٹرویو ز ہوتے۔ بعد آرٹ اور کلچر سے متعلق انٹلیکچوئل تقریبات میں مدعو کی جاتی۔ میں خود بھی آرٹسٹ نیلی کے فن کی معترف تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ، میرے لئے وہ صرف نیلی تھی، میری دوست جسے شاید مجھ سے زیادہ کوئی نہ جانتا ہو۔ وہ میری سادہ مزاج دوست، شروع شروع میں وہ فیشن کے لوازمات سے اس لئے بھی دور تھی کہ اسکا، یعنی اس کے پاپا، یہ سب افورڈ بھی نہیں کر سکتے تھے وہ ایک عام اسکول ٹیچر تھے۔ لیکن انکے ریٹائر ہو جانے کے بعد جب خود نیلی نے ایک آرٹ اسکول میں نوکری کر لی تھی تو بھی اس کا انداز، وہی تھا۔ اسلئے کہ اسکے اندر وسیع النظری اور انفرادیت تھی۔ وہ کہا کرتی ہر شخصیت کی اپنی پہچان ہونی چاہئے۔ کردار کے اندر اگر تعلیم کی شکتی نہ ہو تو پھر آدمی ڈمی بن جاتا ہے :۔

شاید اسی انفرادیت کی بنا پر مجھے وہ اسقدر عزیز تھی۔ لیکن میں نے آج جسے دیکھا، کیا وہ، وہی نیلی تھی۔؟ آج اسکو دیکھکر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا ہی اپنا آپ مر گیا ہو۔ میرے اندر جیسے زلزلہ سا آیا اور وہ مینار ٹوٹ کے گر گیا، جس کی بلندیوں کو میں نے منکا کی طرح سنبھال کے رکھا تھا۔

کٹے ہوئے باب ہیئر۔ چہرے پہ فیشل کے بعد کئے گئے میک آپ کی ولاٹیں تہہ۔ بہت ہی گہرے جامنی رنگ کی پشک۔ کھلے گلے کا سلیولیس جامنی بلاؤز۔ اور شیفان کی کالی ساری جس پر جامنی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ سلور ٹیپ کی پنسل ہیل چپل اور چھوٹا سا فوم کا پرس۔

بات یہ تھی کہ میں نے آرٹ ایگزیبیشن کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ لہذا ایک نامحسوس طاقت مجھے کھینچ لے گئی تھی۔ جیسے میری اندر آتما میں بسی ہوئی نیلی کی تلاش، شعور پہ حاوی ہو۔ شاید اسلئے بھی کہ ہنگامی طور پہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ اور جانے سے پہلے میں نیلی سے مل نہیں پائی تھی۔ اور پھر

جب میں واپس آئی تو مجھے نیلی کا پتہ ملا۔ اور نہ اس کی خبر میرے گھر کے لوگوں کو بھی اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ واقعی اگر وقت کا پھیلا ہوا دریائی صحرا نہ ہوتا، اسے ہی وہ کہیں مل جاتی تو وہ خوشی سے چیخ پڑتی۔ پھر پیار کو جتاتی ہوئی دوڑ کے اس سے لپٹ جاتی۔ مگر جب وہ ملی بھی تو عجیب سی صورت حال تھی۔ اور کشمکش کی کیفیت زنجیر بن گئی تھی۔ میں اسے کیسے مخاطب کروں کیا پتہ اس نے پہچان کے سارے دروازوں کو مقفل کر دیا ہو۔ کہیں اتنی بھیڑ میں مجھے خفت نہ اٹھانی پڑے دیر تک میں اسی پس و پیش میں کھڑی رہی۔ اور متحیر سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر مجھے محسوس ہوا جیسے گزراں کی برفیلی حقیقت ایک سرد لہر کی طرح میرے اندر اترتی جا رہی ہے۔ اسی لئے میں نے فوری طور پہ خود کو سنبھالا اور اس کے قریب جا کر اسے ہیلو، کہا۔ وہ ایک ادا سے چونکی۔ اور اسی آن اسکے چہرے پہ بیتے دنوں کے سائے کو رینگتے ہوئے میں نے محسوس کیا، مگر وہ دوسرے ہی پل سنبھل گئی۔ اور بڑی ہی مصنوعی، آرٹسٹک مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"اوہ صبا! ہاؤ آر یو۔ میٹ مائی ہسبینڈ"

اور تب میں نے اسکے شوہر کو دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک مغرور رئیس ہی محسوس ہوا۔ دولت کا غرور اس کے سراپے سے بھی عیاں تھا اور بشرے سے بھی۔

"تو کیا؟ آرٹسٹ نیلی کی موت اسی شخص کے ہاتھوں ہوئی۔" میں نے کراہیت سے سوچا۔ اور بشاشت سے مسکرا کے بولی۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ کبھی میرے یہاں آپ لوگ آئیے۔ پتہ۔۔۔۔؟" تب ہی نیلی بات کاٹ کر بولی۔

"کل تم ہی میرے یہاں آ جانا۔ یہ لو میرا کارڈ۔ فی الحال بالکل فری ہوں۔ پلیز۔"

اُس کے لہجے کی بے ساختگی بڑی فطری تھی ـــــ اسی لئے میں نے پوچھا

"نیلی یہاں تمہاری ایک بھی پینٹنگ نہیں ـــــ اور بہت دنوں سے کہیں تمہارا کوئی ذکر بھی نہیں آیا ـــــ کیا تم نے ـــــ" لیکن ابھی میری بات ادھوری ہی تھی ـــــ کہ ایک تیز و طرار سا "ہائے نیلی!" کے ساتھ وہ ہجوم میں کھو چکی تھی ـــــ

میں تھوڑی دیر تک تصویروں کو دیکھتی رہی مگر در اصل میرا موڈ بُری طرح آف ہو چکا تھا، اسلئے میں جلدی ہی بُجھے دل کے ساتھ لوٹ آئی ـــــ

راستے بھر میرا دماغ مجھے انتقاماً مشورے دیتا رہا کہ میں نیلی کی دعوت کو ٹھکرا دوں، جسنے صرف دوستی ہی نہیں، بلکہ سارے ماضی کو روند ڈالا تھا ـ جس نے زندگی کے آئینے کو اپنی تیز آری سے چکنا چور کر ڈالا تھا لیکن رات جب میں بستر پہ لیٹی تو میرے دل نے مجھے سمجھانا شروع کیا ـ

"نہیں مجھے جانا چاہیئے ـــــ نیلی سے ملنا بہت ضروری ہے ـــــ وہ نہ جانے کن حالات کی شکار ہوئی ہو....!" اور یوں میرے دل نے خود کو منوا ہی لیا ـــــ ویسے بھی شخصیتوں سے متعلق میرا رویہ ہمیشہ Positive ہی رہتا ہے ـــــ جب تک کہ امکانات کے سارے دروازے بند نہ ہوں، میں کبھی بھی (Negative) نہیں ہوتی ـــــ ان لوگوں کے لئے بھی نہیں، جنکی برائیاں دن کی طرح سچ ہوتی ہیں ـــــ شاید اسی لئے دوسرے دن میں نیلی سے ملنے، ان کے دیئے ہوئے پتے پر اسکے گھر چلی گئی ـــــ

اُسے شاید میرا ہی انتظار تھا ـــــ وہ بڑے ہی پر تکلف خلوص سے ملی ـــــ اور مجھے لئے ہوئے اپنے ڈرائنگ روم میں چلی آئی ـــــ میں نے ایک نظر اس کے ڈرائنگ روم کو دیکھا جو واقعی کسی رشوت خور کلاس ون آفیسر کا ہی بامراد کمرہ لگ رہا تھا ـــــ سجاوٹ اور استعمال کی ایک ایک چیز پکار کے کہہ رہی تھی کہ انہیں قیمت کے معیار پر خریدا گیا ہے ـــــ

کمرے سے ہوتے ہوئے میری نظریں نیلی کے چہرے پہ ٹک گئیں ـــــ اور میری متلاشی نظروں کی سچائی سے گھبرا کے وہ نیچے دیکھنے لگی ـــــ پھر سنبھل کر بولی ـ

"صبا ـــــ تمہارے یہاں سے جانے کے بعد ہی یہ میرے گھر کے چکر لگانے لگے ـــــ اسی سال انہوں نے کمپیٹ کیا تھا ـ پتہ نہیں کیوں، ایک جیت نے انہیں دوسری جیت کا یقین دلا دیا تھا ـــــ گھر سے اسکول تک پہنچنے لگے ـــــ اور تم جانو اس عمر میں گاڑی اور بالوں کا شوق تو ہوتا ہی ہے ـــــ سو میری توجہ بھی کھینچنے لگی ـــــ پھر انہوں نے بابا سے بھی تعارف حاصل کر لیا خود کو آرٹ کا پجاری کہہ کے انہوں نے اپنی دیوانگی کو فن کا جامہ پہنا دیا ـــــ ان حالات کا تقاضا تھا کہ میں 'ہاں' کہہ دوں ـــــ

"مبارک ہو ـــــ شادی تو بڑی خوشی کی بات ہے پھر؟" ـــــ

تب ہی نیلی نے میری طرف کولڈ ڈرنک کی بوتل بڑھائی جسے غالباً اس کا نوکر فرج سے نکال کر رکھ گیا تھا ـــــ

مجھے ہنسی آگئی ـــــ

"نیلی کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ مجھے صرف کافی پسند ہے ـــــ اور کولڈ ڈرنک میں صرف لسّی!"

اس نے واپس بوتل ٹرے میں رکھ دی ـــــ اور نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی پہ ہاتھ رکھ کر بولی ـــــ

"سچ کہتی ہو ـــــ شاید میں بہت کچھ بھول چکی ہوں"

"یس میم صاحب!"

"دو کافی!" ـــــ

"ہاں ـــــ یہ بتاؤ، شادی ہو گئی ـــــ مگر یہ تم میم صاحب کیسے بن گئیں؟" ـــــ

. بس یہ سمجھو! ___ وقت نے بنا دیا ___ یہ مجھے ہر جگہ
پنے ساتھ لے جاتے ہیں ___ اور اس طرح انہوں نے
، مرضی کے مطابق مجھے ڈھال لیا ___ بال بھی کٹوا دیئے
پھر ملبوسات کے انبار لگا دیئے انہوں نے ___ ہر شام
ب، یا دعوت یا کوئی بھی پروگرام ___ صبح سے ملنے والوں
سلسلہ ___ کہتے ہیں، کل اس دن آفیسر کی بیوی ایسے ہی
ا سے ___

. تم خوش تو ہو؟" ___ میں نے سوال کیا ___ یہ
نتے ہوئے بھی کہ میرا سوال قصاب کی چھری سے کم نہیں
تب آرٹسٹ نیلی کے مرد وجود سے ایک اور ہی شخصیت
ـ بے وقوف سی عورت بول اٹھی ___

. اوہ ___ یس ___ ایم آئی ویری ہیپی ___
لی کی ساری رعنائیاں میری تابع ہو گئی ہیں ___ یہ مجھے
ت پیار کرتے ہیں" ___

. اچھا نیلی یہ بتاؤ ___ تمہارے شوہر کو تم سے
رہا تھا ___ یعنی نیلی سے یا کہ ارٹسٹ نیلی سے؟" ___

. ارٹسٹ نیلی سے" ___ ان کا کہنا ہے کہ جب انہوں
، میرے متعلق جانا تو انہیں خواہش ہوئی کہ وہ مجھے حاصل
یں ___

. تب واقعی تم خوش نصیب ہو کہ تمہارا آرٹ شادی
بعد بھی مرا نہیں بلکہ زندہ ہے ___ اور
رے شوہر نے تمہارا اعتراف بطور ارٹسٹ کیا ہے
___ نہیں صرف شو پیس کہیں بنایا ہے" ___

بیکر کافی لے آیا ___ اور میں کافی پینے لگی ___
یکبارگی جیسے نیلی کی بشاشت پھیکی پڑ گئی تھی ___
خاموشی سے کافی سیپ کرتے ہوئے ادھر ادھر کے
لات کرنے لگی ___

اور اس کے اس بدلے ہوئے لہجے سے گھبرا کے
نے موضوع بدلتے ہوئے کہا تھا ___

. نیلی تمہاری ساڑھی تو بہت اچھی ہے ___ نہیں
ہے؟ ___

تو وہ یوں چونکی جیسے اونگھتے ہوئے کسی نے پانی کے
چھینٹے ڈال دیئے ہوں ___

. یہ ___ نہیں ___ یہ انہوں نے جاپان سے منگوائی
ہے ___ اینڈ یو نو ___ یہاں کی ہائی سرکل کو میری
ساڑیوں کا کریز ہے ___ واقعی ڈھونڈ ڈھونڈ کر
ایسے یونیک پیس منگواتے ہیں کہ سبھوں کی نظریں ٹھہر جاتی
ہیں ___

میں مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سنتی رہی
اور پھر کچھ دیر بعد واپس آ گئی ___ دل گرفتہ اور اداس
سی ___ تو گویا بہت ساری انٹلیکچوئیل اور آرٹسٹ
لڑکیوں کی طرح نیلی کا انجام بھی وہی ہوا ___ یہ بھی
ساڑیوں اور زیوروں میں الجھ کے رہ گئی ___ ایک
شخص نے ایک آرٹسٹ کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور
یہ لڑکی خود اپنی موت پہ کتنی نازاں ہے" ___

اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خود اپنی ہی لاش
دفن کر کے آئی ہوں ___ میرے اندر گھٹن اور اداسی
کا ایسا ایکسٹرا اپوائنٹمنٹ تھا کہ میرا جی چاہ رہا تھا گھر پہنچ
کر گھنٹوں روتی رہوں ___ اتنے سارے آنسو بہا دوں
کہ یہ نیا زخم اپنا وجود کھو دے ___

مگر گھر اپنی تمام تر ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ منہ
کھولے میرا ہی منتظر تھا ___ اور میں نے اندر قدم
رکھتے ہی خود کو پوری طرح اس اژدہے کے منہ میں
ڈال دیا ___ ایسا ہر دن ہوتا ہے ___ خواہ میری
ذہنی کیفیت جیسی بھی ہو ___ دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ
ہو یا کہ تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح بشاش ___ میں
اپنی ذمہ داریوں سے کبھی منہ نہیں موڑتی ___ بلکہ صرف
یہ کرتی ہوں کہ اس ہنگامے اور مصروفیت کے باوجود
تھوڑا سا اپنا آپ بچا کے رکھ لیتی ہوں ___ تاکہ
خود اپنی عدالت میں اپنا محاسبہ کر سکوں ___ جینے
اور مرنے کے فاصلے سمیٹ سکوں ___ اور یہ لمحے
میرے لئے ماحصل حیات ہوتے ہیں ___ ان کے علاوہ

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

کتاب: **محبت وطن اقبال**
مصنف: سید مظفر حسین برنی
ضخامت: ۱۶۸ صفحات
قیمت: ۲۵ روپے
پتہ: ہریانہ ساہتیہ اکاڈمی۔ چنڈی گڑھ

"محبِ وطن اقبال" جناب سید مظفر حسین برنی صاحب کی وہ کتاب ہے جو پہلے "اقبال اور قومی یک جہتی" کے نام سے شائع ہو کر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ لیکن پیش نظر کتاب میں محض نام کی تبدیلی نہیں ہے اور نہ یہ محض سابقہ پیشکش کی طبع ثانی ہے بلکہ مصنف نے اپنے موضوع پر زیادہ گہرائی و وسعت سے نظر ڈالتے ہوئے اس میں چند اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ کچھ گراں قدر اضافے بھی کئے ہیں۔ اس طرح اسے خوب سے خوب تر بنا دیا گیا ہے۔

میں نے "اقبال اور قومی یک جہتی" پر بھی تفصیلی رائے دی تھی۔ اب اس کی بدلی ہوئی اور ترقی یافتہ شکل دیکھ کر مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ فاضل مصنف نے ان پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی ہے جن پر میں نے اپنی معروضات میں اصرار کیا تھا۔

یہ کتاب ذہن اقبال کی تفہیم جدید کے لئے وافر مواد فراہم کرتی ہے۔ اقبال کے سلسلے میں ہمارے دانشوروں کا ایک طبقہ زبردست طور پر گمراہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری اکثر و بیشتر راہوں کی افراط و تفریط کی دو چکیوں کے بیچ پیسی جاتی رہی ہے۔ اقبال کے سلسلے میں اس عدم تفہیم یا غلط تفہیم کے اثرات ہمارے اجتماعی فکر پر بھی پڑے تھے اور ہم اکثر و بیشتر تہذیب و تمدن، ثقافت

پیشِ نظر خصوصی شمارہ کو براج ورما نے مرتب کیا ہے۔ موضوع سے متعلق معیاری تحریروں، اطلاعات، تفصیلات نیز معیارِ طباعت کی بلندی کی وجہ سے یہ نمبر تاثر اور جناب رضا دونوں کے شایانِ شان ہے۔

جناب رضا کا شعر و ادب سے انہماک انھیں شہرت و ناموری سے ہمیشہ بے نیاز کئے رہا۔ انھوں نے اپنے اطمینان اور ادب کی خدمت کی خاطر لکھا ہے، مشہور ہونے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ آج کے دور میں حصولِ شہرت کے لئے کسی بھاری بھرکم اور وقیع کارنامہ کی بھی ضرورت نہیں۔ آج تو لوگ خوب چھپ چھپ کر، تنظیمیں بنا بنا کر، اپنے اوپر کوئی آئیڈیالوجی سوار کر، کوئی چونکانے والی بات کہہ کے اور اپنے سے بڑے قد کے لوگوں پر کیچڑ اُچھال کر دیکھتے دیکھتے شہرت حاصل کر لیتے ہیں ______ مگر جناب رضا نے ان میں سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود ایک باوقار شہرت حاصل کر لینا یقیناً اس بات کی علامت ہے کہ جناب رضا نے تحقیق و تخلیق کے میدانوں میں اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کی بیگم محترمہ ساوتری گپتا نے میرے جی کے عنوان سے جو تاثراتی خاکہ لکھا ہے اس میں بھی جناب رضا کی طبع بے نیاز کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھیں اس بات کی بھی شکایت ہے کہ اردو دنیا نے جناب رضا کو بہت دیر سے پہچانا۔ وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

"اگر وہ اپنی شہرت کا ذرا بھی خیال کرتے تو اردو دنیا میں انگلیوں پر گنے جانے والوں میں شمار کئے جاتے۔ ہاں اتنا ضرور کہتی ہوں کہ اگر انھوں نے اپنی شہرت خود نہیں چاہی تو لوگوں نے انھیں پہچاننے میں دیر کیوں کی؟"

یہ بات صرف ایک [illegible] کے ساتھ نہیں تمام [illegible] کے مقصد پر لاگو ہے کہ ہم اپنے جوہرِ اصلی کو دیر سے پہچانتے ہیں۔ لیکن [illegible] کے حالات [illegible] میں ہے کہ ایک بار جب کسی کی خدمات ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں اور پھر مسلسل آتی رہتی ہیں تو ہم اسے یاد کرتے رہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ قریب محسوس کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ آج جب براج ورما صاحب نے خصوصی شمارہ شائع کیا ہے تو وہ انگلیوں پر گنے جانے والے جناب رضا کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے تحقیقی و شعری مرتبہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اس خصوصی نمبر میں مرتب نے اپنی ہنرمندی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے جس کیلئے براج ورما صاحب مشہور ہو گئے ہیں۔ ساٹھ سے زیادہ صفحات کے اس مجلہ کو جناب رضا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے پیشِ نظر الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "پہلا منظر" کے عنوان حیات ملسیانی اور خود مرتب کے منظوم و منثور جذبات ہیں۔ اس کے بعد کے ابواب منظر کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ دوسرے منظر میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں جناب رضا کے ادبی کارناموں کا تعارف اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ تیسرے منظر میں انھیں بحیثیت رباعی گو پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف مناظر میں کہیں ان کی تحقیق و تنقید، کہیں غزل گوئی، کہیں انشائیہ نگاری کے بارے میں مقتدر مضامین ہیں۔ ادبی انٹرویو، ٹیلی کاسٹ رپورٹ، تصاویر وغیرہ نے اس شمارہ میں مزید خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ جناب کالیداس گپتا رضا خوش نصیب ہیں کہ انھیں زندگی کے اس دور میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ورنہ بہت سے لوگ تو ایسے ہیں جنھیں مرنے کے بعد بھی ایسا نمبر تو کیا اس سے کمتر درجہ کا ہدیہ بھی نہیں ملتا لیکن یہ مقام و مرتبہ تو خود جناب رضا نے اپنی محنت شاقہ اور عشقِ شعر و ادب سے حاصل کیا ہے۔

"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"

(ڈاکٹر سلیم اختر خاں)

لہرِ خیال

قارئین کے خطوط

اس بار سہیل کی طباعت پر شاید آپ نے خاص توجہ نہیں دی۔ مضامین نظم و نثر کے سارے جیتے مطالعہ میں کشش کے مصداق ہیں۔ شروع کیجئے تو رسالہ ختم کئے بغیر جی نہیں چاہتا۔

ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸۵ء کے شمارے مل چکے ہیں۔ اسی طرح یاد رکھا کریں ممنونِ کرم ہونگا۔

بیکل اُتساہی (بلرامپور)

ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸۵ء کے شمارے ایک ساتھ ملے۔ عنایت کے لئے بیحد شکر گزار ہوں۔

ستمبر و اکتوبر کے شمارے میں آپکا اداریہ (طلاق) میری نظر میں حق بجانب ہے۔ واقعی آج کل طلاق سے متعلق بہت سی سنسنی خیز خبریں پڑھنے اور سننے کو مل رہی ہیں جنھیں پڑھکر یا سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میں آپ کے خیال سے قطعی متفق ہوں کہ ہمیں خود اس بحران کو روکنے کے لئے اپنے قانون (مسلم پرسنل لاء) میں ایسی تبدیلی کرنا چاہیئے یا کوئی ایسا سخت قدم اُٹھانا چاہیئے جس سے ہماری خواتین کی زندگی دوبھر ہونے سے محفوظ رہ سکے۔
"رضیہ سجاد ظہیر سوانحی خاکہ" معلومات افزا اور قابلِ قدر مضمون ہے۔ جناب قیصر زماں قیس کو مبارکباد! [illegible] نشتر خانقاہی اور اختر شاہجہاں پوری کی غزلیں اچھی ہیں۔

نومبر کے شمارے میں "ریگِ نم پہ قدموں کے نشان شاعر" کا ذکر کرکے سیدہ شانِ معراج نے دکھتی رگ دبا دی۔ اس میں شک نہیں کہ شاذ تمکنت مرحوم زندہ اردو زبان کے قابلِ قدر اور ہر دل عزیز شاعر تھے۔ وہ مخلص اور شاعر نواز انسان بھی تھے۔ مجھے کئی بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں آج بھی انکے خلوص کی خوشبو اپنے قریب محسوس کر رہا ہوں۔ خورشید حیات کی "ایک [illegible]" قابلِ داد ہے۔

مخلص، [illegible] تی فیصلی شہری (جمشید پور)

قیصر زماں قیس کا مقالہ "اردو کی خواتین افسانہ نگار" کسی بھی طرح اپنے موضوع سے میل نہیں کھاتا ہے۔ موصوف اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر نہ جانے تفصیلوں کے کس میں بھٹک گئے ہیں۔ انھیں نے جگہ بہ جگہ شبنم اختر کی "شناخت" کا حوالہ دیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں شاید ایک کتاب کو سامنے رکھکر انھوں نے مقالے کو جنم دیا۔ قیصر صاحب نے شاید اس کتاب کا مطالعہ بھی سنجیدگی سے نہیں کیا ہے ورنہ انھیں اس بات کا علم ہوتا کہ فصیح الدین بلخی (تذکرہ نسوانِ ہند)، محترمہ رشیدہ خاتون کا ناول "اصلاح النساء" ۱۸۹۴ء مطبع جعفری میں چھپ چکا تھا۔ یہ ناول مصنفہ نے ۱۸۸۱ء میں تحریر کیا تھا۔ صغریٰ ہمایوں کے سلسلے میں قیصر صاحب نے تذکرہ تو کیا مگر یہ بتانے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ پہلا افسانوی مجموعہ "[illegible]" ۱۹۰۴ء میں چھپا

بھی عام ہو چکا تھا۔ جب کہ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" ۱۹۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس طرح اردو کی خواتین افسانہ نگار کی تاریخ میں اولیت کا سہرا بھی خواتین کے سر ہے۔

رسالے کی قیمت مناسب ہے۔ طباعت اور کتابت مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

مخلص شمیم عالم مصطفیٰ۔ بھاگل پور

انجمن ترقی پسند مصنفین کی ۵۰ویں سالگرہ

اپریل ۱۹۸۶ء کے آخری ہفتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) بہار نے رانچی میں انجمن کی ۵۰ ویں سالگرہ دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جشن سالگرہ کے لئے ایک بڑی Celebration کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ مختلف نوجوان تنظیموں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس موقع پر ایک سوونیر بھی نکالا جائیگا۔ جس کا موضوع "بہار میں ترقی پسند تحریک کے پچاس سال" ہوگا۔

اس موقع پر تین انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ پہلا انعام "سجاد ظہیر ایوارڈ" ہوگا۔ اور غیر معمولی کارناموں کے عوض ہر تین سال پر دیا جائے گا۔ یہ تین ہزار روپے اور ایک اعتراف نامے پر مشتمل ہوگا۔ دوسرا انعام "سہیل عظیم آبادی ایوارڈ" ہوگا جو دو ہزار روپے اور ایک اعتراف نامے کی شکل میں بہار کے کسی ادیب یا شاعر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ہر دوسرے سال دیا جائے گا۔ تیسرا انعام بھی ہر جشن سالگرہ کے موقع پر کسی ایسے ادیب کی مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جائیگا۔ جس نے چھوٹا ناگپور میں ترقی پسند رجحانات کے فروغ میں علمی اور ادبی دونوں ہی سطحوں پر کارِ نمایاں انجام دیا ہو۔

سوونیر کے لئے مختلف ادیبوں سے مقالے اور مضامین لکھوائے جارہے ہیں اگر کسی ادیب یا شاعر کے پاس کوئی ایسی تحریر، خط یا دوسری دستاویزات ہوں تو براہِ کرم مجھے روانہ کردیں۔ اشاعت کے فوراً بعد یہ چیزیں لوٹا دی جائیں گی۔ پرانے پرچوں، کتابوں، کتابچوں، مکمل دستوں اور سوونیر کی وہ کاپیاں جن میں سے انجمن کی تاریخ مرتب کرنے میں آسانی ہو اگر دستیاب ہوسکیں تو انھیں جشنِ سالگرہ کے موقع پر منعقد کئے جانے والی نمائش میں شامل کیا جاسکے گا۔ مزید تفصیلات کے لئے اس پتے پر خط و کتابت کی جاسکتی ہے۔

عبدالقیوم ابدالی
جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین
(اردو) بہار
چرچ لائن۔ ہتھل کدوا۔ رانچی ۹۳۴۰۰۱

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے-آر-چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجیے

Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 1573

AMETHIST ROSARY

My increasing Sanskrit Glossary
Reminds an amethist rosary :
Parvati is - fish eyed,
Consorted by Shiva by side,
Mother and daughter,
Swimming in water,
Carrying chakra and sword,
Incomparable in this world.
Conquerer of giant horned,
Riding a lion, adorned,
Decorated with words - indeed,
For jewellary there is no need

ELENA A SERDIOUK
Moscow, USSR
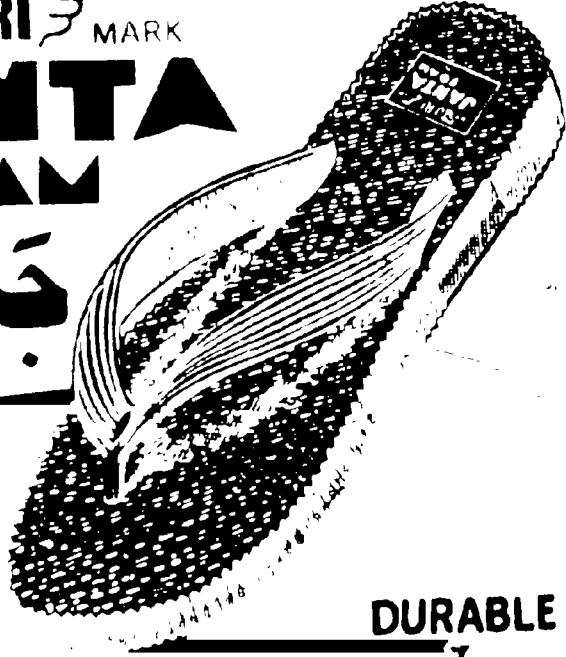
APRIL '86 **Rs. 2/-**

TRADE JRI MARK
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبُوط
DURABLE
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
66 H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL-700 046

دھلائی کا
صابن
WASHING SOAP
پنجاب سوپ فیکٹری

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

اپریل سنہ ۱۹۸۶ء

فون نمبر ۱۵۷۳

مدیر موسس : ادریس سنہاروی — مجلس مشاورت — جلد ۴۸ — شمارہ ۴

مدیر اعلیٰ : مسعود منظر • ڈاکٹر تارا چرن رستوگی — بدل اشتراک فی شمارہ دو روپے

مدیر : جمیل منظر • ڈاکٹر قمر رئیس — زر سالانہ ۲۲ روپے ، لائف ممبری ۲۵۱ روپے

معاونین : شکیل احمد جمالی • اصغر علی انجنیئر — خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

عبد القیوم ابدالی • ڈاکٹر بروج پریمی — ماہنامہ سہیل ریلوے سائڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

فہرست

۱ فرقہ واریت (طنز) ——— جمیل منظر سنہاروی ——— ۹

۲ اردو کی خواتین افسانہ نگار ——— محمد قیصر الزماں قیس ——— ۱۱

۳ لو (نظم) ——— سازینہ ——— ۲۵

۴ سوال (نظم) ——— عالم خورشید ——— ۲۵

۵ غزلیں ——— بلراج حیات ——— ۲۶

۶ غزلیں ——— خالد زاہد مظفر نگری، اختر پرتاب گڈھی ، صفدر امام قادری ——— ۲۸

۷ بڑے بے آبرو ہو کر (کہانی) ——— خواجہ عبد الرزاق ——— ۲۹

۸ خشک پودا تازہ گلاب (کہانی) ——— شکیل علائی ——— ۳۳

۹ نئی کتابوں کا تعارف ——— ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ، ڈاکٹر مشی رضوی ، رؤف جاوید ——— ۳۵

۱۰ شہر خیال ——— حسن نجمی ، شبیہ عباس جارچوی ، آفتاب عالم ، عبد الحق حقانی ، جلال قریشی ، اعجاز طالب ، مشرف عالم ذوقی ، اصغر علی انصاری ، سرفراز نواز ، بروج پریمی ، کاشانہ رشید ۔ ۴۱

امراض سے تحفظ
اپنے بچے کو بچائیے
صحیح وقت پر اور صحیح عمر میں تحفظاتی ٹیکے وغیرہ لگوا کر آپ اپنے بچے کو ڈپتھیریا، کالی کھانسی، ٹیٹنس
پولیو، تپ دق اور خسرے جیسے خطرناک امراض سے محفوظ بنا سکتے ہیں۔ تحفظاتی سہولیات آپ کے قریبی
ابتدائی صحت مرکز، ڈسپنسری یا اسپتال سے بلا معاوضہ دستیاب ہیں۔
ٹیکہ کب لگوایا جائے؟
ویکسین
مرض
حاملہ عورتیں
16-36 ہفتے
ٹی ٹی (ماں اور بچے دونوں کو تحفظ دیتا ہے)
2
ٹیٹنس
شیرخوار بچے
3-9 ماہ
ڈی پی ٹی
3
ڈپتھیریا، کالی کھانسی، ٹیٹنس
پولیو
3
پولیو
بی سی جی
1
تپ دق
9-12 ماہ
خسرہ
1
18-24 ماہ
ڈی پی ٹی
1
پولیو
1
بوسٹر ڈوز
* ایک ڈوز اگر پیشتر ازاں ایک ڈوز دیا گیا ہو۔
دو ڈوزوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا وقفہ ہونا چاہئے۔ معمولی زکام، کھانسی اور
اسہال کے دوران بھی ٹیکہ دیا جاتا ہے۔
بچوں کو امراض سے تحفظ دینے کا ہمہ گیر پروگرام شریمتی اندرا گاندھی کے یوم پیدائش
19 دسمبر 1985ء کو شروع کیا گیا تھا۔ اس پروگرام پر کامیاب عمل درآمد
ان کی سب سے مناسب یادگار ہوگا۔

(نمود)
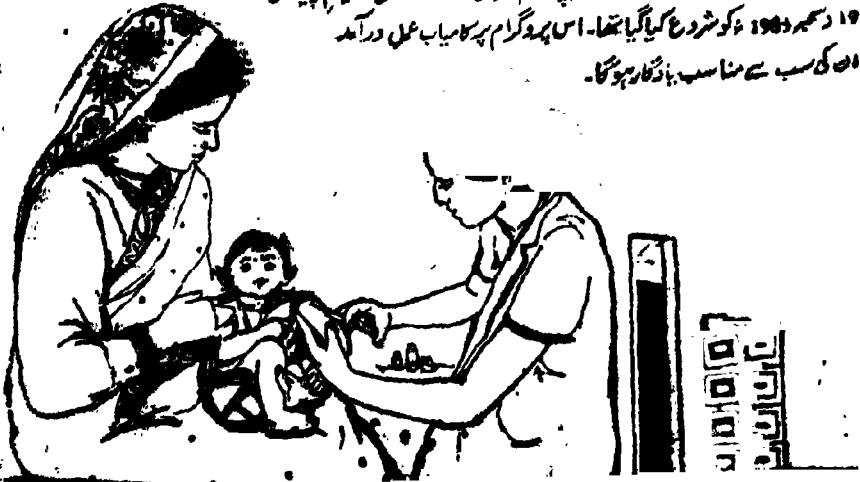
"فرقہ واریت"

فرقہ پرستی ہمیشہ ہی سے ہماری قومی یکجہتی کا خطرناک دشمن رہا ہے لیکن آج وہ جتنا خوفناک ہوتا جارہا ہے اتنا خوفناک وہ ہمارے ملک کی آزادی کے وقت کے فسادات کے بعد کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف لڑائی اور مختلف فرقوں کے بیچ میل ملاپ کی ہم آج پہلے کبھی بھی وقت سے زیادہ ہے۔

ہر روز کے خوفناک وارداتیں بتارہی ہیں کہ ہمارے سرحدی صوبہ پنجاب میں حالات کتنے نازک ہوگئے ہیں۔ صبر کی بات ہے کہ وزیراعظم راجیو گاندھی کے بارے پر بھی پارٹیوں کے لیڈروں نے پنجاب میں انتہا پسندوں کے خلاف مل کر کام کرنے اور وزیر سرجیت سنگھ برنالا کو تعاون دینے کا فیصلہ کیا۔ بے گناہ لوگوں کے قتل عام کے خلاف جنڈی گڑھ میں سبھی پارٹیوں کا شانتی جلوس نکال کر ان پارٹیوں نے اس فیصلہ کو عملی شکل دینا بھی شروع کر دیا ہے۔

لیکن تشویشناک بات ہے کہ ہمارے ملک کے آئے پر آئے خطرے کی اس گھڑی میں فرقہ پرست قوتیں مختلف صوبوں میں تناؤ پھیلانے اور فساد کرانے کی سازشوں میں مشغول ہیں۔ حال ہی میں کئی صوبوں کے درجنوں شہروں اور قصبوں میں فساد کرائے گئے۔ خون خرابہ ہوا، اور کرفیو لگانا پڑا۔ ابھی بھی گجرات اور بہار کے کئی شہروں میں کرفیو جاری ہے۔ بہار کے اورنگ آباد میں پیدا کیا گیا تناؤ اور نوادہ میں ہوئے فساد اس بات کا ثبوت ہیں۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ کچھ سرکاری افسران بھی فرقہ وارانہ تناؤ پیدا کرنے میں مددگار بن جاتے ہیں۔ حالانکہ کئی جگہ افسروں نے مستعدی سے حالات کو سنبھالا ہے۔

ملک پر آئے پریشانی کی اس گھڑی میں صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف جہاد چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ آپسی میل ملاپ کو ختم کرنے کی سازشوں کو ناکامیاب بنایا جاسکے۔

افسوس ہوتا ہے ہندوستان کے بائیں بازو کی پارٹیوں پر کہ ان حالات میں بھی وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوئی ہیں۔ یا زیادہ سے بیان بازی یا کاغذی کاروائی تک ہی محدود ہیں۔ جبکہ یہ موقع عملی طور پر میدان میں آنے کا ہے۔

جمیل منظر سنہاروی

محمد قیصر الزماں قیس

اردو کی خواتین افسانہ نگار، ایک پس منظر

(تحقیق کی روشنی میں)

ان کے بعد ہی پریم چند کا عہد آتا ہے اور پریم چند کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگاروں سے بھی ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ صغرا ہمایوں، فاطمہ بیگم، عشرت آرا بیگم، سردار محمدی بیگم، نذر سجاد حیدر، ظفر جہاں بیگم، اس عہد کی خواتین افسانہ نگار ہیں۔ یہ خواتین تو سند یافتہ نہیں تھیں لیکن اپنی زبان سے گہری تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے ذہنوں میں اپنی قوم اور ہم جنسوں کا درد تھا۔ تعلیم کے ذریعہ عورتوں میں بیداری پیدا کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے میں اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ ان کے ناولوں [illegible] دلوں کو چھوتیں، ذہنوں کو سوچنے پہ مجبور کرتیں۔ اور آنکھوں کو آب گوں کر دیتی تھیں۔ ان کے بعد آنے والی خواتین افسانہ نگاروں نے ناول نویسوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے بعد ہی جدید عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔

"اردو میں مختصر افسانوں سے قبل افسانوں کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک وہ جو داستان ہیں جن میں مختصر اور طویل کہانیاں ملتی ہیں۔ دوسری ناولیں ہیں، افسانے کی تاریخ گرچہ مختصر ہے پھر بھی اس کی چھاپ داستانی دور میں پائی جاتی ہے۔ داستان کے اس پس منظر میں حیدر بخش حیدری دہلوی کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے جنم لیا۔ ان کی اہمیت اردو کے مختصر افسانوں کے روایت میں بہت زیادہ ہے۔ ان میں مختصر افسانے کی فن کی اکثر خصوصیات مل جاتی ہیں۔ ان کے کردار، زمین دار، طوائف رقیہ، بادشاہ اور مسخرے ہیں۔ ان کہانیوں میں داستانوں کی تخیلاتی فضا سے آزاد ہو کر حقیقت نگاری کی غیر رومانی فضا میں سانس لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی کہانیاں اردو افسانوں کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہیں۔" [1]

اس بات کی تصدیق ہو جانے کے بعد کے اردو افسانے کی شروعات حیدر بخش حیدری کی کہانیوں سے ہوتی ہے تو اپنے گفتگو میں افسانے کی صنفی حیثیت، تعریف اور حدود سے واقفیت کا بیان بھی کیا جائے۔ اس کے بعد موضوع پر آئیں گے۔

---

[1] شناخت۔ ڈاکٹر شمس اختر

افسانہ، کہانی اور ناول نثری ادب کی ایک بڑی صنف یعنی فکشن ہی کے تین رخ ہیں۔ شعر و ادب کی ابتدائی درجہ بندی کے اعتبار سے تینوں ہی نثری ادب ہی شمار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ نثری ادب نے مقابلے میں اپنی تمام باریکیوں موشگافیوں، استعاروں، کنایوں، میں کام نکالنے کے تجریدی انداز بیان سے بچتی ہوئی تصویر کھینچنے کے فنکارانہ مظاہرے کے باوجود اظہار میں "کہی" زیادہ اور "ان کہی" کم ہوتی ہے۔ شاعری اور فکشن کے درمیان اس فرق کی بنا پر افسانے کے مطالعے میں فنی موشگافیوں کی تمام اور اظہار و بیان کی ساری حسن کاری اپنی تمام توانائیوں کے باوجود مواد پر کبھی اولیت نہیں پاتی۔ جو کہ افسانے میں بیان کیا گیا قصہ یا حکایت یا اس کی تفہیم (THEME) وہ حقیقت ہے۔ جس کے گرد فنکاری کا غلاف بالکل اس طرح چڑھا ہوتا ہے جیسے قدرت دماغ کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد غلاف چڑھا دیتی ہے۔

لہٰذا اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادیب کے ذہن میں جو مواد ہو اس کو بیانیہ انداز میں کہنے کے علاوہ افسانے کے اجزائے ترکیبی کے استعمال فنکارانہ کو ہی ہم افسانہ، کہانی یا وسیع تناظر میں فکشن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ آسان لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مختصر افسانے کا اطلاق اس کہانی پہ کیا جاتا ہے جس میں تخلیق کار ایک خاص فنی انداز میں کم سے کم الفاظ میں زندگی کی جزوی تصویر کشی بہتر پیرائے میں کرتا ہے۔

فکشن کی اس تعریف کے بعد یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ مختصر افسانے کی ابتدا کا مسئلہ انسان سے اس طرح مربوط ہے کہ وہ ادب اور سائنس دونوں کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ افسانہ پہلی بار کب لکھا گیا۔ اس ضمن میں کہہ چکا ہوں کہ سب سے پہلی کہانی جو سنی گئی وہ حضرت آدم کی کہانی تھی۔ چونکہ میں نے کہانی کی ابتدا انسان کی ابتدا، آفرینش کہا ہے مگر انسانی ابتدائی تہذیب تین ملکوں میں ملتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ کہانیوں کے ابتدائی نقوش ان ہی ملکوں میں ملے گی۔ چنانچہ ہزاروں سال قدیم مصری قومی کہانیوں کا ایک مجموعہ ملتا ہے۔ اور یہ کہانیاں کتابی شکل میں TALES OF THE MAGE - CRAFT کے نام سے جانی جاتی ہے۔ پھر یونانی، چینی، ہندوستانی کے علاوہ دوسرے ملکوں میں کہانیوں کا غیر تحریری سرمایہ سامنے آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی آمد کے بعد بائبل میں بہت سی حکایتیں ملتی ہیں۔ جس میں مختصر افسانے کے اجزاء بحسن و خوبی مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں "پنچ تنتر کی کہانیاں" اور "جاتک کتھائیں" ملتی ہیں۔ جس کا ایک منتخب مجموعہ گوپی چند نارنگ نے "جاتکوں کی کہانیاں" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان تمام ملکوں کی تحریری اور غیر تحریری کہانیاں اور حکایتوں میں بہت ساری باتیں مشترک ہیں۔ جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا گیا، اس کی تاریخ بدلتی گئی۔ میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ کہانی اور انسان کی ابتدا دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ قرون وسطیٰ میں بھی جو ادب ملتا ہے اس میں بھی مختصر افسانے کے نقوش تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ خاص کر عہد وسطیٰ کے زمانے میں بہت سی حکایتیں اور کہانیاں ملتی ہیں مگر باضابطہ طور پر مختصر افسانہ کا آغاز انیسویں صدی سے ہوا اس سے پہلے مختصر افسانے کا رنگ و آہنگ بے ضابطہ ہی ملتے ہیں۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں جرمنی، فرانس، امریکہ، تینوں ملکوں میں ایک وقت یہ کام شروع ہوا۔ مختصر کہانی کی شروعات سب سے پہلے امریکہ میں ہوئی اور اس میں اولیت کا سہرا امریکہ کے ادیب ارونگ کے سر ہے۔ اس کی کتاب SKETCH BOOK مختصر افسانوں کا اولین نمونہ ہے۔ جرمنی میں ہاف مین نے ۱۸۱۴ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان کہانیاں لکھیں۔ پھر ٹیک نے حکایتوں اور کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ ارونگ کے بعد امریکہ میں دو مشہور فنکار پیدا ہوئے۔ جن کا نام ایڈگر ایلن پو اور نتھنیل ہاتھورن ہیں۔ یہ دونوں صرف بہترین افسانہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے دوسرے ملکوں کے افسانوی ادب پہ گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ جس وقت امریکہ میں کہانیاں لکھی جا رہی تھیں اس زمانے میں روس میں بھی دو بڑی شخصیتیں ابھریں۔ اور یہ دونوں پشکن اور گوگول ہیں۔ فرانس میں ۱۸۳۰ء کے قریب تین فنکار سامنے آئے۔ میرمی، بالزاک، اور گوٹیے۔ ان تینوں نے مختصر افسانے کی نئی صنف کو اپنایا۔

افسانے کو تقویت مغرب کی رومانی تحریک سے ملی۔ اور اس کے زیر اثر روس، فرانس اور امریکہ میں کثرت سے کہانیاں لکھی گئیں۔ سب سے آخر میں انگلینڈ کے فنکاروں نے اسے اپنایا۔ امریکی افسانہ نگار کے واضح اثرات انگلینڈ کے افسانہ نگاروں پہ پڑے ہیں۔ انگلینڈ کے بڑے افسانہ نگار میں KIPLING کا نام سر فہرست ہے۔ حالانکہ بڑے افسانہ نویس موجود تھے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ لوگ سامنے آئے۔ ان میں جوتف، جورلس، ای ایم فوسٹر، ورجینیا وولف، ڈی ایم لارنس، مالسن فیلڈ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے افسانہ نگاری کو دوبارہ یوروپی سطح پر لانے کی کامیاب ترین کوشش کیں۔

اردو کے مختصر افسانوں پر بھی مغربی افسانہ نگاروں کے اثرات واضح طور پر مرتب ہوئے ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

> چیخوف اور موپاساں مغربی افسانے کے ذکر کے ساتھ فوراً دو بڑے نام ذہن میں آتے ہیں۔ یہ دو نام جو آج بھی مختصر افسانے کی تاریخ میں سب سے اہم مانے جاتے ہیں، دراصل پوچھئے تو صحیح معنوں میں جدید مختصر افسانے کا آغاز چیخوف اور موپاساں سے ہی ہوتا ہے ۔[۱]

موپاساں اور چیخوف کے اثرات ہمیں سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ بیدی اور منٹو کے افسانے "گرم کوٹ"، "لاجونتی"، "ہتک" اور "سوگندھی" کو پڑھنے کے بعد موپاساں اور چیخوف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ چیخوف کے شعوری اثرات کا اظہار محمد حسن عسکری نے بھی کیا ہے۔ کرشن چندر کا "حسن اور حیوان" بھی چیخوف کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ کرشن چندر کے علاوہ محمد علی نے بھی چیخوف کے اثرات قبول کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعے "جزیرے" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ احمد علی کے افسانوں میں کافکا کی گہری رمزیت کے اثرات بھی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ گو کہ کافکا کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی شخصیت کچھ ایسی غیر معمولی اور یکتا تھی، کہ وہ ... بنا رہا۔ عام ادیبوں کی رسائی سے بہت دور رہی۔ رمزیت کو انہوں نے ... سے اپنے افسانوں میں برتتے احمد علی کی حسین افسانوں میں کافکا کی رمزیت اور اظہار پایا جاتا ہے۔ وہ "قیدخانہ"، "ہمارا کمرہ"، "اور موت سے پہلے" ہیں۔ جہاں احمد علی نے کافکا کی گہری رمزیت کا استعمال وہیں عزیز احمد نے ایملی زولا کا ... "اور حقیقت نگاری کو اپنے افسانوں میں برتا۔ گرچہ احمد علی کلیت سے بھی متاثر ہیں۔

مغربی ادب اور مخصوصاً انگلستان کا اثر ہمارے افسانوں پر دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو انفرادی طور پر لوگوں نے اثرات قبول کئے ہیں۔ دوسرا مجموعی طور پر مغرب کے ادبی مزاج اور نئی مغربی تحریکوں کے اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد "وجودیت" سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ اور فرانسیسی ادیبوں نے خصوصاً فلسفہ وجودیت کے فلسفے کے اثرات قبول کئے۔ حسن کی جھلک ان کے ناولوں میں ملتی ہیں۔ اور ویسے انتظار حسین معاصر افسانہ نگار ہیں انہوں نے اپنے افسانہ "چاند گہن" میں اس کی کامیاب عکاسی کی ہے۔

اس کے علاوہ افسانے کی ایک نئی شکل ہمارے یہاں THREE DIMENSION (سہ ابعادی) کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً کرشن چندر کا "ان داتا"، "صدیاں" اور عزیز احمد کا "زریں تاج" کے علاوہ ممتاز شیریں نے "میگھ ملہار" میں زمان و مکان کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مردوں کے دوش بدوش خواتین افسانہ نگاروں نے بھی مغرب کے افسانوی رجحانات کو اپنایا ان میں ممتاز شیریں کو اولیت حاصل ہے۔ چونکہ انہوں نے مغرب کے افسانوی ادب کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا اور ان کا تنقیدی شعور ہمعصر فنکاروں سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے۔ یہ بات بلا پس و پیش کے کہی جا سکتی ہے کہ فن اور تکنیک کی جتنی واقفیت ممتاز شیریں کو تھی

---

[۱] - شناخت ۔ ڈاکٹر مشتاق اختر۔

> "جدید اسلامی ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کی دوگونہ اہمیت ہے ایک طرف ان واقعات نے سلطنت مغلیہ کے بقیہ کو آخری اور کاری ضرب لگائی۔ اور دوسری طرف زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط پر مہر ثبت کردی۔" [1]

انتشار کے ان حالات میں ایک ایسی جماعت نے ڈوبتی کشتی کی ناخدائی کی۔ جسے انگریز پرستوں کی جماعت کہی جاسکتی ہے۔ دوسری تحریک مولوی سید احمد بریلوی کی تحریک تھی۔ یہ تحریک ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ اس کا مقصد اسلام کا احیا تھا۔ اس کے برخلاف سرسید احمد کی تحریک ثقافتی، سماجی، اور علمی تحریک ثابت ہوئی۔ یہ جماعت سرسید احمد اور ان کے رفقائے کار کی جماعت تھی۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں میں ایک بھی مصنف اور کارکن سرگرم کار نہ تھے۔ سیاست، تعلیم، مذہب، زبان و ادب کی ترقی غرض سماجی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس پر ان کی نظر نہ ہو۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں ان حالات کا تجزیہ کیا ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ یہ ادبی تحریک جو سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ہمہ گیر تحریک تھی جس نے ادبی روایت کی بنیاد انہوں نے ڈالی تھی۔ اس کے استوار کرنے میں ان کے رفقا اور ان لوگوں کی عظیم شخصیت کا بڑا دخل تھا۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں اس تحریک کی بڑی اہمیت ہے چنانچہ یہ تحریک قدیم اور جدید کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس تحریک کے اردو مصنفین اور شعرا کو ایک ادبی نقطۂ نظر ملا۔ اس بیان تحریک نے بیان کی سلاست، اور اسالیب کو تغیری، اور واقعہ ادب کی تخلیق کا ذریعہ بنایا۔ ان تحریکات کے علاوہ ہندوؤں کی سماجی اصلاح کی بعض تحریکات شروع ہوئیں۔ مثلاً راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج جیسی تحریک۔

ان کا مقصد تھا کہ ایک ایسا معاشرہ جنم لے جو سیاسی طور پر بیدار ہو۔ بہرحال ان تحریکات نے ایک ذہنی اور سیاسی بیداری پیدا کی۔ اور آہستہ آہستہ ایسے ادارے اور جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ جن کا نصب العین سیاسی جدوجہد تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی جس نے آگے چل کر آزادی کی تحریک میں ایک اہم رول ادا کیا۔

اس زمانے میں روس اور ترکی کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ جس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر بھی پڑا۔ انہیں سیاسی تبدیلیوں کے دوران ہندوستان میں صنعتی نظام قائم ہوا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے پیش نظر ہندوستان میں بھی صنعتی ترقیات دروازہ کھلا۔ ہندوستان کی دیہی صنعتیں تباہ ہوگئیں۔ یہاں سے خام مال یورپ جانے لگا۔ اور وہاں کی تیار کی ہوئی چیزیں یہاں کے بازاروں میں دوگنے تگنے قیمتوں پر فروخت کی جانے لگیں۔ گاؤں کے رہنے والوں کے حالات دن بدن بدتر ہوتے گئے۔ اسی سماجی پس منظر میں متوسط طبقہ کے باشعور عوام نے ایک جماعت بنائی۔ جو سیاسی پارٹی بن کر ابھری جس کا ذکر آچکا ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی زبردست سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ روس میں مزدوروں کا انقلاب، ترکی میں مصطفیٰ کمال نے ملک کی باگ ڈور اپنے قبضہ میں کرلیا۔ چین میں بھی SENYA TSEN کی قیادت میں آزادی کی تحریک ہوگئی تھی۔ ہندوستان کے تمام شعبے سیاسی، ثقافتی، اور ادبی شعبوں پر ان اثرات کا خوشگوار ردعمل رونما ہو رہا تھا۔ مغربی تہذیب اور کلچر نے بھی ہندوستانی عوام کو متاثر کیا۔ یہ ایسے اثرات تھے جو دائمی تھے۔

> "اس وقت ہندوستان میں دو قسم کے خیالات اور رجحانات پائے جاتے تھے ایک کی نگاہیں اور دلچسپی اسلامی ممالک سے وابستہ تھیں، دوسرے نئی نسل کے مسلمان قومی آزادی کی تحریک میں شامل تھے جس میں آزاد، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال جیسے بڑے دانشور بھی تھے۔" [2]

---

[1] آج کا اردو ادب صفحہ ۸ ۔ [2] ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ڈاکٹر صادق

بیسویں صدی کی ابتدا میں یہاں کے لوگ اشتراکیت سے متاثر ہوئے جبکہ خود کانگریس کے بائیں بازو کے رہنما بھی اس کی تائید کرتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ قید و بند میں جکڑی ہوئی ملک کی نصف آبادی نے اس کو محسوس کیا۔ عورتوں نے اب چہار دیواری سے قدم نکالنے شروع کئے۔ یہ ایک عظیم انقلاب تھا جس کی نظیر اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں ملتی۔ اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کا زور ٹوٹا۔ سائنس کی تعلیم عام ہوئی۔ اور اس کے ذریعہ لوگ تلاش و جستجو میں لگ گئے۔ عورتوں نے انہیں اصلاح کی خاطر انجمنیں قائم کیں۔ اور رسائل و جرائد میں لکھنا شروع کیا۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی شعوری کوششیں کیں۔ ان تمام تبدیلیوں سے قومی زندگی کی جد و جہد میں انقلاب نمودار ہوا۔ پرانے اور روایتی اقدار کا خاتمہ ہوا۔ اس کے علاوہ ہمارے ادب کو بھی اظہار کی نئی راہ ملی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عشرت اختر نے لکھا ہے۔

"یہ عہد اردو نثر کے شباب کا عہد تھا۔ نثر اب داستان نویسی اور ناول نگاری تک محدود نہ تھی۔ اس کی شاعرانہ تصنع سے بھری عبارت ختم ہوگئی۔ لب و لہجہ سادہ اور عام فہم ہوگیا۔ اور افسانہ و ناول کی لگام منشی پریم چند کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔"[1]

یہ دور سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے ایک خصوصیت کا حامل قرار پاتا ہے۔ اب تک عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتہ وہی تھے۔ جو اس سے قبل ہندوستانی معاشرے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عورت صرف چہار دیواری کے اندر رہ کر اور گرہستی کر کے اپنی زندگی گزارتی تھی۔ نہ وہ مردوں کی بہترین رفیق تھی۔ اور نہ اس کی ضرورت شدت سے عام زندگی میں محسوس کی جاتی تھی۔ اس تحریک نے عورتوں کو مردوں کو قریب کر دیا۔ اور مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی جرأت عطا کی۔ وہ اب گھر سے کھلیانوں، میدانوں، اور کارخانوں کے علاوہ دفتروں میں آگئیں۔ اس زمانے میں خواتین اور مستورات میں تعلیم عام ہوئی۔ دانشور طبقہ میں انگریزی تعلیم کو فوقیت دی گئی۔ اس تعلیم نے یہاں کے افکار و خیالات میں اضافہ کیا۔

مغربی افکار میں یہاں دو اسکول بے حد مقبول ہوئے۔ ایک تو مارکسزم جس کی بنیاد بیسویں صدی کی ابتدائی دور میں پڑ چکی تھی۔ دوسرا فرائڈ کا تصور جنس کا اثر بھی عام ہوا۔ روسی انقلاب نے ساری دنیا کے ملکوں میں جمہوریت اور جمہوری تحریک کو تقویت پہونچائی۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کا داغ بیل پڑا۔ اس ادبی تحریک اور سیاسی تحریک نے "ادب برائے زندگی" کا قیمتی نعرہ عطا کیا۔ مساوات، آزادی، متوسط طبقے کی رہنمائی اور انسانی دوستی کے جذبوں کو عام کیا۔ ترقی پسند تحریک نے اپنا باضابطہ ایک مینی فیسٹو بھی شائع کیا۔ اس کا مقصد انجمن ترقی پسند مصنفین، آرٹ اور ادب کو نئی سمت عطا کرنا اور رجعت پسندوں کے ہاتھوں سے نجات دلانا تھا۔ یہی بات تو ہے کہ مختصر افسانے کا آغاز اسی تحریک کے ساتھ ہوا۔ اردو افسانے پر یوں تو کئی مختلف تحریکات اور ادبی رجحانات بیک وقت اثر انداز ہوئے لیکن ترقی پسند ادب میں سماجی حقیقت نگاری ایک نمایاں رجحان بن کر سامنے آئی۔ اس دور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی مسائل کو بھی دخل تھا۔ کیونکہ اسی آفاقی تحریک کا ایک حصہ ترقی پسند تحریک تھی۔ ترقی پسند ادبی تحریک اردو کی سب سے عظیم اور توانا ادبی تحریک ہے۔ جس نے ہمارے شعر و ادب کو زبردست

---

[1] شاعت۔ ڈاکٹر عشرت اختر۔ ص ۹۴

تبدیلیوں سے روشناس کرانے کا کارنامہ انجام دیا ۔ بالخصوص اردو افسانے کا عروج اس تحریک کی رہینِ منت ہے ۔ ترقی پسند تحریک کے اولین دور کو اردو افسانہ کا "زریں دور" کہا جاتا ہے ۔ دوسری تحریکات و رجحانات کی طرح یہ تحریک بھی اپنے وقت اور ماحول کی نمائندہ تھی ۔ اس لئے میں نے موجودہ دور کے سیاسی اور سماجی عوامل و تحریکات سے صرفِ نظر نہیں کیا ۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک زبردست حادثہ ہے ۔ لیکن ہندوستان کی قومی زندگی میں اس کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی ہے جس نے ملک گیر پیمانے پر نہ صرف اپنے تاثرات ہی مرتسم کئے بلکہ زندگی میں ٹھہراؤ کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ اس کے سدِ باب کا عمل بھی انجام دیا ۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے قومی ذہن نے ایک نئے شعور کی معیت میں اپنے نئے سفر کا آغاز کیا ۔ قومی ذہن کے اس سفر نے نہ صرف سیاسی، سماجی، معاشی، نظام ہائے فکر بلکہ شعر و ادب کو بھی متاثر کیا ۔ ۱۸۵۷ء کے قبل کے ادیب جس ماحول میں جی رہے تھے ۔ وہ ماحول انقلاب کے بعد تغیرات کی زد میں آگیا ۔ سید احتشام حسین کا خیال ہے کہ :

> "ماضی کا غم، حال کی پریشانی، مستقبل اور تاریخ کی رفتار سے ناواقفیت، ایسے نئے حالات کی پیدائش، ایسے نئے عناصر کی موجودگی جس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا ۔ قدیم رشتوں کی شکست اور نئے روابط کا واضح شکل میں موجود نہ ہونا ۔ حکومت کی ایک بساط الٹ کر دوسری بساط کا بچھ جانا، تجارت، صنعت اور حرفت سے نئے طریقوں کا رواج، پریس اور اخبارات، نئی تعلیم اور نئے وسائل، اور انہیں کے ساتھ مذہب کے مٹنے کا خوف، یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ انہوں نے بیک وقت پیدا ہو کر شاعروں اور ادیبوں کو الجھن میں ڈال دیا تھا ۔ پرانے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا اور نئے راستے ابھی طرح بنے نہ تھے ۔ پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا، نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی ۔" [۱]

یہی وہ حالات اور کوائف تھے جنھوں نے ادیبوں اور فنکاروں کو اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا ۔ اس نے سوئے ہوئے شعور کو بیدار کیا ۔ انقلاب سے پہلے کا اردو ادب بعض مثالوں کے استثنیٰ کے ساتھ ایک ٹھہراؤ کی کیفیت سے دوچار ہی نہیں تھا ۔ بلکہ فکر و فن کی متعینہ حدود میں سمٹ کر رہ گیا تھا ۔ لیکن انقلاب کے بعد تخلیق ہونے والا ادب اس تجربے کے بعد خود کو تغیرات کی زد سے محفوظ نہ رکھ سکا ۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی اردو زبان و ادب کے شاعروں اور ادیبوں نے پہلی بار زندگی اور ادب کے باہمی رشتے کو سمجھنے اور اس کی نوعیت پر غور و فکر کرنے کا احساس پیدا کیا ۔ اور ذہنی بیداری اور اس کی ذہنی تشکیل و تعمیر نے ایک اہم کروٹ لی ۔ اس زبردست انقلاب کا واضح ترین نقش علی گڑھ تحریک کی شکل میں نمودار ہوا ۔ یہ تحریک بلا شبہ اردو ادب کی سب سے پہلی اور شعوری تحریک تھی جس کی اساس ادب و زندگی کے باہمی رشتے اور اس پر قائم تھی ۔ جس کے متعلق آل احمد سرور نے لکھا ہے :

---

[۱] عکس اور آئینے ۔ ص ۱۱۵

سرسید کی تحریک کو سرتاسر ترقی اور مصلحت یا ضرورت کی آواز سمجھا جانا چاہئے۔ [1]

اس تحریک نے ملک و قوم کی زندگی پر اپنے انمٹ نقوش ہی نہیں چھوڑے بلکہ اسے سمت و رفتار بھی عطا کی۔ اس تحریک کو مزید توانا بنانے میں سرسید احمد خاں، حالی، شبلی نذیر احمد، محسن الملک، اور چراغ علی وغیرہ کے نام نامی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ سردار جعفری کا خیال ہے۔

"حالی اور شبلی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی ادب و تنقید کی بنیاد مادی حالات پر رکھی انہوں نے بتایا کہ ادب مادی حالات کے مطابق اپنا چولا بدلتا ہے۔ اور مواد اور ہیئت دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شبلی نے تشبیہوں اور استعاروں کی تبدیلی کے بھی مادی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی کا شعر العجم بہت بڑے کارنامے ہیں" [2]

۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۵ء تک اردو ادب جن وسعتوں سے ہمکنار ہوا۔ اور جن انقلابی تبدیلیوں سے گذرا وہ یقیناً حیرت انگیز تھی۔ اردو ادب کی پوری تاریخ میں پہلے کبھی نہ تو ایسی زبردست تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ اور نہ اتنی برق رفتاری کے ساتھ اسنے ترقی کی منزلیں ہی طے کی تھیں۔ بقول سردار جعفری:

"ان معاشی اور سیاسی حالات کی رہین منت تھی جس سے ہندوستان کی سماجی زندگی کو سابقہ پڑا۔ وہ زبان جس کا ادب غزل، مثنوی، قصیدے، اور چند تذکروں تک محدود تھی۔ نظم، افسانے ناول، سوانح، تاریخ اور تنقید سے مالا مال ہو گئی۔ اس میں تنوع، گہرائی، اور وسعت آگئی" [3]

صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہوا تھا۔ اور اس تحریک کے ساتھ ایک مخصوص آرٹ کی حیثیت سے عروج کی منزل کو پہونچا۔ ترقی پسند تحریک کی سب سے پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" گویا روایت سے بغاوت تھی۔ ترقی پسند تحریک کا سرچشمہ روس اور روسی ادب میں تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے عام طور پر ٹالسٹائی۔ ترگنیف، دستوئیفسکی چیخوف وغیرہ کے بجائے میکسم گورکی اور اس کے بعد کے ادیبوں سے زیادہ اثر قبول کئے۔ زندگی کو اپنی ساری حقیقتوں میں پیش کرنے کا رجحان اور افسانے پر اس تحریک کے اثرات ہمارے یہاں آیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر نے اردو افسانے کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ اردو افسانے کی پرسکون دنیا میں ہنگامے کا سبب بنا۔ اور ایک طبقے میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کہانیوں میں تلخی، سرکشی، اور ایک نئے تصور فن کی آمد کا اعلان تھا۔ اسے حکومت وقت نے ضبط کر لیا۔ انگارے کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا جو انداز سامنے آتا ہے ان میں نوشتی کی بے شمار خامیاں بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اصلاحی فکر تصور پرستی اور تخلیقی رنگینی سے یکسر پاک ہے جو اس سے قبل اردو افسانے میں نمایاں طور پر دیکھنے میں ملتے ہیں۔ انگارے سے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"انگارے اردو افسانوی ادب میں ذہنی بغاوت اور جرأت آزما تخلیقی تجربات کی ایسی دستاویز ہے

---

[1] سرسید کے حربی اور تہذیبی اثرات۔ علی گڑھ نمبر ص ۴۳۔ [2] ترقی پسند ادب جلد دوم ص ۱۰۶
[3] ترقی پسند ادب ص ۸۲ - ۸۱۔

جس کا احساس اور علم عام نہیں .... کہانیوں کا یہ مختصر سا مجموعہ نہ صرف یہ کہ زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرت اور اس عہد کی ذہنی مرقع تھا۔ بلکہ اس آئینہ میں آنے والے دور کی حقیقت بھی اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے کی نئی بساط بھی جو نئے رجحانات سامنے آئے اسے اس کا پیش رو ہی نہیں سرچشمہ بھی کہا جا سکتا ہے"[1]

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ "انگارے" کے افسانوں میں ہیجان اور جوش کی فراوانی ہے۔ مذہب کے نام پر انسانوں کے استحصال اور ریاکار مولویوں کی باطنی خباثت کو بے نقاب کرنے کے لئے جس طرح طنز و تضحیک کا سہارا لیا گیا ہے اس میں فکر کی گہرائی کم جذباتی ابال کا عنصر غالب ہے۔ تاہم اس مجموعہ میں چند کہانیاں ایسی بھی ہیں جو ان سے تقریباً پاک ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری اور فن کا بلند اور نکھرا ہوا احساس موجزن ہے۔ ان میں سجاد ظہیر کی کہانی "دلاری" احمد علی کی "بادل نہیں آتے" اور "مہاوٹوں کی ایک رات" اور محمود الظفر کی "جواں مردی" میں حقیقت نگاری کا جو تصور نظر آتا ہے۔ وہ تصور پرستی اور رنگینی سے پاک ہے۔ ان کہانیوں میں انسان کے دکھ درد اور اس کی محرومیوں سے نہ صرف گہری ہمدردی ہے۔ بلکہ وہ اس ماحول اور ان حالات کے خلاف نفرت کا شدید احساس بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ جن میں انسان کی بے کرانی دکھ اور محرومیوں کا شکار ہے۔ اس طرح اس انقلابی فکر اور سماجی حقیقت نگاری کا نقش اول بھی ان کہانیوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جس کی نمائندگی بعد میں دوسروں نے بھی کیا۔ اس سے پہلے ہمارے افسانہ نگاروں نے جن پہلوؤں کو دیکھ کر دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی تھی انگارے کے افسانہ نگاروں نے فنی جسارت سے کام لے کر ان پر قلم اٹھایا۔ ان کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سماجی، سیاسی، زندگی اور ان کی پیدا کی ہوئی عجیب و غریب شخصیتوں، ذہنیتوں کی تصویریں ہیں۔ جن میں رعایت کہیں نہیں بلکہ بے باکی اور آزادی خیال ہر جگہ اپنے پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ ان کی مصوری میں تلخ و تند طنز اور شدید جذبات کی آمیزش ہے۔ یہی تلخی کہیں کہیں سنجیدگی کو چھوڑ کر تمسخر اور جھنجلاہٹ اور ابتذال کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ افسانہ نگاروں نے ایسی باتیں ضرور بے باکی سے کہہ دیں جنہیں کہنے میں لوگ اس وقت تک عار محسوس کرتے تھے۔ اور ایک قسم کی جھجک تھی۔ وقار عظیم رقم طراز ہیں۔

"انگارے مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہیں .... انگارے نئے اور پرانے افسانے کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو دونوں کو جوڑتی نہیں۔ بلکہ الگ کرتی ہے۔ اس لکیر پر آکر گنگا اور جمنا کے رنگ ایک دوسرے میں پیوستہ ہو جانے کے بعد الگ الگ لہراتے دکھائی دیتے ہیں"[2]

اردو افسانے میں مارکسی نظریے اور فلسفے کے ساتھ ساتھ فرائڈین نفسیات کے اثرات تقریباً ایک ہی دور میں داخل ہوئے۔ اس دور کے بیشتر افسانوں میں مارکس اور فرائڈ کے اثرات نمایاں ہیں۔ اور سچ ہے کہ ان افسانوں میں مارکس اور فرائڈ گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ انگارے کے افسانے متوسط طبقے کے استحصال اور جنسی جبر دونوں کے خلاف پروٹیسٹ

---

[1] تنقیدی تناظر ص ۶۵ - [2] نیا افسانہ سید وقار عظیم ص ۶۱ تا ۶۵

کی شکل میں سامنے آئے۔ پریم چند کا افسانہ "کفن" جہاں اردو افسانے کے نشانات واضح کرتے ہیں جیسے اردو افسانے کا نقطہ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ "انگارے" اور "کفن" ان دونوں طرز کے افسانے میں ایک چیز مشترک تھی۔ (۲۸۱-۸۸ ۳/۱۵۸) - "ایلی نیشن کا تصور" جو بعد میں آکر جدیدیت یا جدید افسانے کا تصور بنا۔

بیسویں صدی میں فرائڈ نے لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر ذات کی اہمیت کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اور فرد کی محرومیوں کو موجودہ تہذیب کی مایوسیوں کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ اور دلچسپ ہے کہ موجودہ عہد میں کئی ادیب اور دانشور انسان کی آزادی کی جدوجہد میں مارکس اور فرائڈ کے نظریات کو ایک اکائی کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ مارکسیت کے زیر اثر اردو افسانے میں سماجی حقیقت نگاری کا دور شروع ہوا۔ اور ترقی پسند طرز فکر ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

آزادی کے ابتدائی دور میں اس تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں نے اردو کو کئی افسانے دئے جس میں بیشتر افسانے تقسیم سے پیدا شدہ مسائل اور موضوعات سے متعلق ہیں۔ لہٰذا ان افسانوں میں تخلیقی روح کم، اور جذباتی ردعمل زیادہ نمایاں ہیں۔ فسادات کے ضمن میں لکھے گئے اردو افسانے پر دو رجحانات واضح شکل میں سامنے آئے۔ ایک ردعمل کرشن چندر کا تھا جو اپنے وسیع انسانی لبرل ازم اور سیاسی نظریئے کے تحت جذباتی ردعمل پیش کرتے ہیں۔ دوسرا رویہ راجندر سنگھ بیدی کا ہے جو ان سارے سانحے کو انسان کی اندرونی زندگی میں پیوست دیکھتے ہیں۔ اور سماجی ماحول کے پس منظر میں انسانی روح کے کرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک تیسرا رجحان یہ بھی نمایاں ہوا جسے قرۃ العین حیدر نے تہذیب کے المیے اور جلا وطنی کے تصور کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی عکاسی انتظار حسین نے بھی انہیں کہانیوں میں بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ تینوں رویے دراصل انسان اور تہذیب کے مختلف تصورات کے باعث ہیں۔ جسے کرشن چندر نے سیاست اور جذبات کی صورت میں سمجھنے کی کوشش کی۔ بیدی نے تہذیبی حادثے اور انسانی روح کے المیے کی صورت میں اور قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے وجودی فلسفے کی رو سے پیش کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے اس میں مارکسی، نیم مارکسی، انسانی دوستی، لبرل ازم اور ان کے رومانی افسانہ نگار بھی شامل ہے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اپندرناتھ اشک، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، رامانند ساگر، دیویندر ستیارتھی وغیرہ نے آدرش، حقیقت اور رومان کے امتزاج سے انسان دوستی زندگی اور سماج کے بارے میں ترقی پسند نقطہ نظر کی تبلیغ کی۔ بعض ادیب اس سے مستثنیٰ تھے۔ جن لوگوں نے بیشتر انہیں موضوع پر کہانیاں لکھیں جن پر آزادی سے قبل کہانیاں لکھ رہے تھے دھیرے دھیرے ترقی پسند افسانوں میں تبلیغ، خطابت، نعرہ بازی، اور اصلاحی جذبہ زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ یہاں تک کہ افسانے میں استعمالی سیاست کی روزمرہ کی بدلتی ہوئی پالیسی کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ افسانوی کردار سیاہ اور سفید میں تقسیم ہونے لگے۔ فنی اندازوں اور تقاضوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ نظریاتی وابستگی کے باعث جائز قرار دیا جانے لگا۔ یہ اردو افسانے کا بحران اور انحطاط کا دور تھا۔ دوسری طرف فرائڈی نفسیات کا اثر

کا اثر بھی جاری رہا ۔ جنس شعور اور لاشعور کے ملے جلے اثرات کو ہندوستانی معاشرے میں پیش کرنے کا رجحان ایک ترقی پسند رجحان تھا۔ کیونکہ اس رجحان کے تحت ہمارے سماج میں مروج دقیانوسی فکر اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ان ادیبوں نے نسوانی آزادی، اور جنس کے صحت مند نقطۂ نظر کو فکری اور جذباتی گہرائی سے پیش کیا ۔

آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی دوسری نسل سامنے آئی ۔ ان میں رام لال، غیاث احمد گدی، اقبال متین اور جوگندر پال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ان میں ایسے افسانہ نگار بھی شامل ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل بھی افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت صحیح معنوں میں آزادی کے بعد ہوئی ۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ نئی پود میں اقبال مجید، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار، کلام حیدری، قیصر تمکین اور ظفر اوگانوی وغیرہ شامل ہیں ۔ دوسری نسل کے اولین گروپ میں ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے ابتدائی نقوش بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن کئی افسانہ نگار عام طور پر اپنی منفرد حیثیت نہیں قائم کر سکے ۔ اور بغیر کسی نظریاتی وابستگی کے افسانے تخلیق کرتے رہے ۔ اس نسل نے اردو ادب کو کئی بہترین افسانے عطا کئے ۔

اس کے بعد جدید دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اور جدیدیت کے اثر سے اردو افسانے میں علامت اور تجریدیت کے قسم کے افسانے تخلیق کیے جانے لگے ۔ اس قبل میں اردو افسانے میں جدیدیت سے بحث کروں پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ جدیدیت سے کیا مراد ہے ؟ جدیدیت کے متعلق بے شمار بحث و تمحیص کے بعد بھی اس کی کوئی واضح اور متعین تعریف نہیں ملتی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدیدیت کسی ایک ادبی رجحان کا نام نہیں ۔ اس لئے بعضوں نے جدیدیت کو تحریک یا رجحان کی بجائے اظہار خیال کا ایک مخصوص اور ابھرتا انداز قرار دیا ہے ۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ جدیدیت ایک خالص ادبی تحریک ہے ۔ بلکہ ایک وسیع اور کشادہ تحریک جس میں سماجی شعور کے علاوہ روحانی ارتقا، اور تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح بھی شامل ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کا ادیب کسی نظریے کی غلامی قبول نہیں کرتا ۔ بلکہ انسانی زندگی کو آزادی سے دیکھنے اور برتنے کا حق مانگتا ہے ۔ جسے ہم جدیدیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ جدید دور کے تمام رجحانات اس دائرے میں آتے ہیں جو گذشتہ تیس سالوں سے ادب پر اثر انداز ہیں ۔ جدیدیت معاصرانہ حقیقتوں میں نئی بصیرت اور معنویت کی تلاش ہے ۔ جامد اور مطلق اقدار کے بجائے تازہ قدروں کی تلاش اور اپنے عہد کی روح کی دریافت ہی جدیدیت کی اساس ہے ۔ جدیدیت، فلسفوں اور نظریوں کے حدود کو توڑنے کا نام ہے ۔ نا وابستگی ہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے ادیبوں سے متمیز کرتی ہے ۔ جدیدیت کسی نظام فکر، فلسفۂ حیات یا کسی اور مستقل تصور کا نام نہیں ۔

جدید افسانہ نگاروں نے جدید فکر اور طرز احساس کو پیش کیا یہی وہ نقطہ ہے ۔ جہاں سے ترقی پسند اور جدید افسانوں کی راہیں جدا ہوتی ہیں ۔ جدید اردو افسانے کا آغاز ۱۹۵۵ء کے دور میں ہوا ۔ کیونکہ اس زمانے میں اردو افسانہ نگاروں میں ترقی پسند ادب کے مروجہ اصول اور نظریوں سے بغاوت کا رجحان عام ہوا ۔ اور نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان اختلافات ابھر کر سامنے آگئے یہ وہ موڑ تھا ۔ جہاں سے ادیبوں کی نئی نسل گذشتہ دور سے بالکل

الگ ہو گئے۔ اس دور میں جدید ادیبوں نے مروجہ اقدار کی نفی کی۔ اور ہر قسم کی سماجی اور اخلاقی پابندیوں سے انحراف کیا۔
ترقی پسند تحریک میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ خصوصاً اسٹالن کے زوال اور سوشلسٹ ملکوں کے درمیان عالمی
انقلاب کی قیادت کے سوال پر اختلاف پیدا ہوتے ہی برصغیر میں ترقی پسند تحریک کمزور پڑنے لگی جس کا اثر اردو ادب
پر فطری طور سے پڑا۔ آج سے بیس پچیس سال قبل جب جدیدیوں نے لکھنا شروع کیا تو سیاسی اور ادبی سطح پر انتشار
ہی انتشار تھا۔ اسی انتشار نے انسان دوستی، سماجی انقلاب اور معاشی مساوات کے بارے میں اس کی ساری
آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) اور عقائد ملیا میٹ ہو چکے تھے۔ اقدار و عقائد کی شکست و ریخت نے اسے
کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پرانی نسل کے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے نئی نسل کے لکھنے والوں کا کرب، ان کے فکری انتشار کے
اسباب، ان کی ذہنی کیفیت اور افسردگی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ جدید نسل جس افسردگی اور کرب میں گھری تھی
اس کے بارے میں یہ ادیب خاموش تھے یا قطعی بے خبر تھے۔ اور کافی عرصہ تک نوجوان ادیبوں کی سرکشی کے اسباب
کو سمجھنے کی بجائے ان پر برستے رہے۔ اس کے باعث جدید نسل کے ادیبوں اور فنکاروں کے درمیان خلیج قائم ہو گئے۔
اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا کہ ترقی پسندوں کی آواز مدھم اور کمزور پڑنے لگی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی کہ ان بیس سالوں
کے درمیان جدید افسانہ نگاروں نے ترقی پسندیت سے پورے طور پر انحراف کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ترقی پسندوں
کے درمیان سے بہت سے افسانہ نگار جدیدیت کے زمرے میں شامل ہو گئے۔

جدیدیت اور ترقی پسندیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں میں نہ صرف مواد کا فرق ہے۔ بلکہ موضوعات
ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے بھی مختلف ہے۔ اس کی وجہ زندگی اور ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کا اختلاف
ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انسان کی ناآسودگیوں، محرومیوں، تکلیفوں اور کرب ناکیوں کی وجہ سماجی ناانصافی
معاشی ناہمواری، طبقاتی استحصال اور سیاسی ظلم و استبداد کو قرار دیا تھا۔ اور اسی طرح سماجی اور معاشی انقلاب
کے ذریعہ انسان کے انفرادی دکھ درد، اور اس کے ذاتی مسائل کو حل کرنا چاہا تھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے
یہاں پورے معاشرے کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز اجتماعی تھا۔ اس لئے وہ معاشرے میں ادب کے ذریعہ فکری
انقلاب لانے پر مصر رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اظہار کا جو طریقہ اپنایا تھا وہ حاوی تھا۔ اور انہوں نے علامتی
طرز اظہار کے مقابلے میں اس کی فطری اور جذباتی ناآسودگی، انسان کی داخلی شخصیت بکھراؤ، اقدار کی شکست و ریخت
صنعتی معاشرے میں تنہائی اور زندگی کی معنویت، ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو اپنایا اس کے اظہار کے لئے انہوں
نے بیانیہ سے زیادہ علامتی طرز اظہار کو ترجیح دی۔

ترقی پسندوں کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں اور جدید افسانوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ترقی پسندوں
کے افسانوں میں باقاعدہ ایک مرکزی خیال اور منظم پلاٹ ہوتا تھا۔ اور اسی خیال اور پلاٹ کو کرداروں کی مدد سے
آگے بڑھایا جاتا تھا۔ کلاسیکی اور ترقی پسند افسانوں میں "افسانویت" ہر حال میں برقرار رکھی جاتی تھی۔ جب
کہ جدید افسانوں میں پلاٹ کے بغیر خیال اور واقعہ کو ایک خاص لمحہ میں اور خاص ماحول میں خود کے ذہن میں ابھرنے

کو من و عن بیان کیا جاتا ہے۔ جدید افسانوں میں قصے کو پس منظر میں رکھ کر اشارے کنایے اور استعارے استعمال کیے جاتے ہیں جس سے کہانی از خود واضح ہوتی چلی جاتی ہے اور قاری کے ذہن پہ کردار کے خطوط نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے جدید افسانوں سے متعلق شہزاد منظر نے بڑی پتے کی بات کہی ہے:

"جدید افسانہ نگار فارم لیس (بے ہیئت) افسانہ لکھ رہا ہے لیکن یہ اسٹائل آگے چل کر فارم (ہیئت) کی شکل اختیار کرے گا" [۱]

نثری اور افسانوی ادب کے مطالعے (بشمول قدیم سے جدید تک) سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مردوں کے دوش بدوش خواتین بھی افسانے اور ناول کے باب میں اضافے کا سبب بنتی رہیں۔ نہ صرف یہ کہ مردوں کے ساتھ ساتھ ملاتی رہیں۔ بلکہ اپنا ایک منفرد مقام متعین کیا۔ خواتین ہر دور میں کسی نہ کسی انداز میں اپنے فطری حدود کے رہتے ہوئے تہذیبی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مردوں کے برابر حصہ لیتی رہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نصف اول کے اواخر میں جب افسانہ نگاری کا چلن عام ہوا۔ تو اس میں خواتین نے بھی اپنی وہ علمی صلاحیت اور استعداد کی بنیاد پر اپنے مخصوص انداز میں دلچسپی لی جو نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانے کی تاریخ کو بنانے میں خواتین نے مردوں کے برابر حصہ لیا جن میں چند نام تو ایسے ہیں جس کی وجہ سے فکشن کو اعتبار، وقار اور آبرو نصیب ہوا۔ ان خواتین میں طیبہ بیگم، نفیس دلہن، عطیہ فیض، ناہید فیضی، نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی اور صغرا ہمایوں مرزا کا نام سر فہرست ہے۔ ان لوگوں نے جو روایت قائم کی تھی۔ اسے آج ہماری خواتین افسانہ نگاروں نے اتنا پروان چڑھایا کہ کسی بھی نقطہ نظر سے اگر چند افسانہ نگاروں کا ذکر کیا جائے تو مذکورہ کسی نہ کسی خاتون افسانہ نگار کا نام شامل ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آج بھی خواتین کی وجہ سے اردو افسانے کا بھرم قائم ہے۔ چونکہ خواتین نے اردو افسانے پہ مردوں سے کچھ کم اپنا خون صرف نہیں کیا۔ اور اسے عالمی ادبیات میں نمایاں مقام دلانے کی خاطر ہر ممکن اور انتھک کوششیں کی ہیں۔

---

[۱] جدید اردو تنقید۔ شہزاد منظر

سرمہ کی برکت

ناصر اور شاکر دو بھائی تھے۔ ایک دن دونوں مدرسے سے پڑھ کر گھر آئے۔ کتابیں الماری میں رکھ کر اپنے ابّو کے پاس بیٹھ گئے۔ ابّو نے پیار سے پوچھا تم لوگوں نے سبق پڑھا؟ شاکر نے کہا ابّو! ناصر بھائی رات کو سبق یاد نہیں کرتے۔ روز استاد صاحب مار کھاتے ہیں۔" ابّو ناراض ہو کر بولے۔ کیوں ناصر؟ آپ رات کو سبق یاد نہیں کرتے؟ ناصر منھ بنا کر بولے۔ ابّو رات کو مجھے کتاب کے حروف صاف نظر نہیں آتے۔ ابو کچھ دیر سوچ کر بولے ...... اچھّا بیٹے میں بخشی کا سرمہ نورِ نظر لا دوں گا۔ تم رات کو سوتے وقت لگا لیا کرنا ———— دوسرے دن ابّو سرمہ لے آئے۔ ناصر خوش ہوئے اور روز رات کو شوق سے سرمہ لگانے لگے ...... دو چار روز ہی گزرے ہوں گے کہ ناصر کو صاف دکھائی دینے لگا۔ ناصر اب دل لگا کر سبق یاد کرتے۔ صبح وقت پر مدرسے جاتے۔ استاد صاحب کو سبق ٹھیک ٹھیک سنا دیتے۔ استاد صاحب خوش ہوتے اور شاباشی دیتے دن گزرتے گئے۔ ناصر شاکر سے آگے بڑھ گئے۔ اب شاکر کو فکر ہوئی کہ ناصر مجھ سے آگے کیسے بڑھ گئے۔ ایک دن شاکر نے پوچھ ہی لیا۔ ناصر بھائی! آپ زیادہ سبق کس طرح یاد کر لیتے ہیں؟ ناصر نے کہا بات یہ ہے کہ سرمہ نورِ نظر لگانے سے رات کو مجھے صاف دکھائی دیتا ہے۔ سبق یاد کرنے میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔ جتنا بھی سبق ہو یاد ہو جاتا ہے ...... رات کو جب ابّو گھر آئے۔ شاکر دوڑتے ہوئے ابّو کے پاس گئے اور کہا ابّو! میرے لئے بھی بخشی کا سرمہ لا دیجئے۔ اس سرمہ کے لگانے سے سبق زیادہ یاد ہوتا ہے۔ ابّو ہنس کر بولے۔" اچھّا بیٹے لا دوں گا۔"

فون نمبر ۳۹-۲۷۳۰ ● یومِ تاسیس ۱۸۹۲ء ● ٹیلیگرام: بخشیز کلکتہ

ایس اے بی بخشی اینڈ کمپنی

S.A.B. BAKHSHI & CO.

manufacturers of:

UNANI PATENT MEDICINES AND BEAUTY PRODUCTS

بو

جب کبھی جا نماز بچھا کر
خدا کے سجدے کو جھکتی ہوں
ایک تیز سی بو میرے اندر سے آنے لگتی ہے
یہ بو کچھ ویسی ہے
جیسے کہ
آدمی کا گوشت جلتے وقت ہوتی ہے
اور کوڑھ کے سڑنے سے ہوتی ہے

میں جانتی ہوں
یہ میرے جسم ہی انگوں کی طرح ہیں
الگ سے جوڑے ہوئے نہیں ہیں
کہہ نہیں سکتی
اس سے مجھے پیار ہے یا نفرت ؟
لیکن جب بھی
جا نماز پر خدا کے سجدے کو جھکتی ہوں
یہ بو میرے اندر سے آنے لگتی ہیں
اور میرے وجود کے چاروں طرف
دھوئیں کی طرح بکھر جاتی ہے

میں سہم جاتی ہوں
اور اسے اپنی مٹھیوں میں
چھپا لینے کی کوشش کرتی ہوں
چاہتی تو ہوں
کہ اسے ایک ہی بار میں
اپنے سے الگ کر کے
نجات پا سکوں
لیکن ہارے ہوئے جواری کی طرح
ہر بار
نیا داؤں لگانے کو مجبور ہوں
کہہ نہیں سکتی
اس کے اندر سے
پیار اور نفرت کے بیچ
یہ کیسی بو ہے
جو مجھے ہمیشہ گناہوں کی طرف
بڑھائے لئے جا رہی ہے
جسے میں مکمل اقرار بھی نہیں کر پاتی
اور انکار بھی نہیں کر سکتی !!!

سازینہ

سوال

عالم خورشید

تم جنگ پر جا رہے ہو ۔ ؟
ضرور جاؤ
کیونکہ

زمین ماں ہے
اور ماں کی حفاظت کرنا
ہر بیٹے کا
اولین فرض ہوتا ہے
مگر محاذ کی بساط پر
پیدل ، اسپ ، فیل ، کشتی
اور وزیر بنے
بندوقوں اور مشین گنوں
کے ٹریگر دبانے
توپوں اور ٹینکوں
کے دہانے کھولنے
بارودوں اور میزائیلوں
کا رقص شروع کرنے سے پہلے
ایک پل کے لئے
صرف ایک پل کے لئے سوچنا
کہ تم جن کے لئے
موت کے دروازے
کھولنے جا رہے ہو
اُن کا قصور کیا ہے ۔ ؟؟؟

چٹکیاں لیتی ہے گویائی کیسے آواز دوں — کس کو ہے توفیق شنوائی کیسے آواز دوں
نیکیوں کی کیا پزیرائی، کیسے آواز دوں — مجھ سے روٹھی میری رسوائی کیسے آواز دوں
سر میں سودا ہے نہ دل میں آرزو کس سے کہوں — جلوتیں مانگے ہے تنہائی، کیسے آواز دوں
میں تو خوش ہو جاؤں ایک لطف غلط انداز سے — لیکن اے امکان افزائی، کیسے آواز دوں
کون دیکھے زندگی کی ناگہانی کے ستم — اور ادھر میں بھی ہوں سودائی کیسے آواز دوں
اپنی نظروں میں تو میرا زعم ہستی لغو ہے — کس سے پوچھوں اپنی سچائی، کیسے آواز دوں
جس مسافت کا تعلق مجھ سے ہے ایسی نہیں — ذہن مطلق کی سبک پائی کیسے آواز دوں
مرہم ہر زخم بن کر آنے والا کون ہے — خواب ہے یا خواب آسائی کیسے آواز دوں
بیچ دوں گا میں اپنا ضمیر اگر لے سکیں ملے — اے مسلسل روح فرسائی کیسے آواز دوں
ذہن و دل پہ نقش جہہ کے یوں کیا ارشاد ہے — پوچھتی ہے مجھ سے پروائی، کیسے آواز دوں
کون مانے گا کہ ہے کہ صد منزلت کی مستحق — بد نصیبی کی بھی یکتائی کیسے آواز دوں
ان گنت سچائیوں کو دفن میں خود کر لیا — طعنہ دیتی ہے شکیبائی کیسے آواز دوں
میری حسرت کوئی پوچھے مجھ سے میرا حال دل — لوگ اپنے اپنے شیدائی کیسے آواز دوں
آزمائش کا یہ پہلو بھی ہے کیا معلوم تھا — کامرانی کی گھڑی آئی، کیسے آواز دوں

کس کے نام آخر کروں حسرت میں اپنی وحشتیں
منتظر ہے دشت پیمائی کیسے آواز دوں،

میں اپنی شکل تو دیکھوں ذرا وہ آئینہ لا — مجھے یہ شک ہے کہ میں زندگی سے ہار گیا
چلو ہوائے پراگندہ طبع سے پوچھیں — ہمارا جاگنا سونا حرام کیسے ہوا،
مرے علاوہ بھی دنیا میں لوگ رہتے ہیں — کبھی تو ان کا بھی احوال دل ضمیر سنا
ابھی تو وقت لگے گا قیامت آنے میں — ابھی سے کیوں لرز اٹھی ہے کائنات فضا
شکست خواب حقائق کو خوں رلاتی ہے — مگر یہ بات کسی حق پرست کو نہ بتا

مری تباہی پہ ہر شخص رو پڑا حسرت
مگر یہ خیر ہوئی کوئی چہرہ فق نہ ہوا!

غزلیں

ہزار اہل جہاں اور اہل دیں کہتے ! — زباں پہ بات نہ آئی تو ہم نہیں کہتے

ادھوری لکھی ہے تاریخ کائنات ابھی — ہمارا حال بھی اس میں کہیں کہیں کہتے

لہولہان تو اپنا بھی دل رہا ہے مگر! — وہ زخم ہی نہ لگے جس کو دلنشیں کہتے

اسی لئے ہمیں آنکھیں نہیں ملیں شاید — جسے بھی دیکھتے ہم لوگ اسے حسیں کہتے

چمن تو نام ہے تزئین لالہ و گل کا ! — ہجوم لالہ و گل کو چمن نہیں کہتے

کوئی تو اور بھی نام اس کے واسطے ہوگا — میں تھک گیا ہوں ترے وہم کو یقیں کہتے

کلنک کا یہ ہمارا کا جبیں پہ داغ جو ہے — تری جبیں پہ لسے ہم بہ جبیں کہتے

میں زندگی کے ہر اک مسئلے پہ بول تو دوں — مگر یہ بات کچھ ایسی ہے خود نہیں کہتے

جب اپنی ذات سے آگے کبھی بڑھے ہی نہیں — ہم آسماں کسے کہتے، کسے زمیں کہتے

عبث ہمارے لبوں پہ لگا دیئے تالے — ہم اس کی بات ہی کہتے جہاں کہیں کہتے

اسی گھڑی کے ہیں اب تک ہیں منتظر حیرتؔ
وہ دل پہ چوٹ لگاتا ہم آفریں کہتے،

دل کے ہاتھوں خراب ہو جانا — زندگی کامیاب ہو جانا

مجھ سے کب ایسے معجزے ہوں گے — خود ہی عزت مآب ہو جانا

آج گلی بن نے زخم تنہائی — پھر کبھی آفتاب ہو جانا

گھر کے آواز ناسں آتا ہے — لغزش انقلاب ہو جانا

کہیں معراج تشنگی تو نہیں — ندیوں کا سراب ہو جانا

میں نے تسکین کرب مانگی ہے — اے دعا مستجاب ہو جانا

جب کسی امتحاں سے خوف لگے — تم مرے ہمرکاب ہو جانا

خواب کو سچ میں ڈھالنے کی لگن — دیکھیو، خود نہ خواب ہو جانا

بے حساب ابھی کبھی حیرتؔ
محو احتساب ہو جانا

بلراج حیرت

نفرت و بغض و حسد کی کھائیاں بن جائیں گی
کیا خبر تھیں قربتیں بھی دوریاں بن جائیں گی

ریت کے تودے فضاؤں میں بکھر جائیں گے سب
رفتہ رفتہ یہ ہوائیں آندھیاں بن جائیں گی

مان بھی جاؤ خدا کے واسطے مت رو ہوا
شعلۂ جوالا یہ چنگاریاں بن جائیں گی

بند تو کر لوں زباں لیکن بتا دو رہبرو
جل چکیں جو بستیاں آبادیاں بن جائیں گی ؟

کیا غضب ہے آج اگر چھینکیں بھی ہم کو آ گئیں
تو یہی اخبار کی کل سرخیاں بن جائیں گی

ہم اندھیروں میں بسر کر لیتے اپنی زندگی
جانتے جو خوبصورت یہ پرچھائیاں بن جائیں گی

ہار بیٹھو گے اگر محنت اور ہمت اس طرح
آہنی زنداں قفس کی تیلیاں بن جائیں گی

مختار سیرتا بگڈھی

راستہ اس لیے اس کا پُر خار تھا
وہ غرض دار لوگوں میں خود دار تھا

غم کے بدلے جو مجھکو خوشی دے گیا
غالبًا زندگی سے وہ بے زار تھا

کون کہتا ہے تنہا تھا میں گامزن
آپ کی یاد تھی ساتھ سرشار تھا

آخرش اس کو نیلام ہونا پڑا
قسمتوں کا جو سب کی خریدار تھا

شہر میں جتنے قاتل تھے معصوم تھے
ایک زاہد اکیلا گنہ گار تھا

خالد زاہد مظفر نگری

غزل

شکوے گلے تمام ، زمیں بانجھ ہو گئی
خاموش! دل کو تھام زمیں بانجھ ہو گئی

اب زندگی کی کوئی بھی صورت نہیں رہی
اے مردِ نیک نام ، زمیں بانجھ ہو گئی

کچھ خوبیِ نصیب ، عدو آسماں ہوا
کچھ اپنا حسنِ کام ، زمیں بانجھ ہو گئی

شہرِ پناہ سے کوئی باہر نہ آ سکا
تھا اشتہارِ عام ، زمیں بانجھ ہو گئی

اس خامشی کے جشن میں کیا کچھ نہیں ہوا
گونگے تھے نام نام ، زمیں بانجھ ہو گئی

اپنے کمین گاہوں کو آؤ پلٹ چلیں
اب ہو چکی ہے ختم ، زمیں بانجھ ہو گئی

صفدر امام قادری

خواجہ عبدالرزاق

بڑے بے آبرو ہو کر ....

ریاض رحمانیہ ہوٹل سے چائے پی کر باہر نکلا۔
سیدھا سلام پان والے کی دکان پر چلا گیا۔ ریاض کو دیکھ
سلام اخلاقاً مسکرا اٹھا۔ اور فوراً اس کی پسند کے مطابق
پان لگانے لگا۔ اور چند ہی لمحوں میں دو خوشبودار پان کے
بیڑے اسے دے دیئے۔ پان منہ میں دبا کر ریاض جانے لگا تو
سلام اسے روک کر بولا: "ریاض بھیا" وہ دیکھو جو آدمی
بسنت سینما کے مین گیٹ کے سامنے بوٹ پالش والوں کی
طرف قطاروں کو پار کرتا ہوا ادھر آرہا ہے، اسے تم جانتے
ہو؟ ——"

ریاض اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر چندان
توقف کے بعد بولا۔

"یہ تو شائق معلوم ہوتا ہے"

"ہاں بھیا شائق ہے"۔

"اسے کچھ دن پہلے میں نے رانچی میں دیکھا تھا۔
وہاں وہ رکشہ چلاتا تھا۔ اب یہاں کیا کرتا ہے؟"

"سینما کے ٹکٹ بلیک کرتا ہے غریب پڑھ لکھ کر بھی
بیکار ہے۔ سچ ہے بھیا اس زمانے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں
کی کوئی قدر نہیں"

"کیا تعلیم ہے اس کی؟"

"کہتا تھا اردو ہندی اور انگریزی کی جانتا ہے اچھا

"میں یقین نہیں کرتا"

"کیا کہتے ہو بھیا! وہ دو ایک ٹیوشن بھی کرتا ہے
لیکن اس پر بھی اس کا گذارہ نہیں چلتا۔ بعض اوقات وہ
غریب فاقہ کشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔" سلام نے ہمدردی
کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جو شخص غلط راستہ پر چلتا ہے وہ اسی طرح ٹھوکریں
کھاتا ہے" ریاض جانے لگا تو سلام نے پھر اسے روک کر کہا
"ذرا ٹھہر جاؤ وہ آہی رہا ہے۔ اس سے ملتے ہوئے چلے
جاؤ گے"

اتنے میں شائق قریب آگیا۔ ریاض اسے حیرانگی
نظروں سے دیکھنے لگا۔ عجیب میلا کچیلا سا انسان، سر کے
لمبے لمبے بکھرے بال تیل سے بے نیاز، شرابی کی سی سرخ
آنکھیں، لٹکا ہوا چہرہ، بغل میں چند پرانے پرچوں کا پلندہ
بالکل پاگلوں جیسا حلیہ تھا اس کا۔ آتے ہی اس نے اخلاقاً
سلام کیا۔ اور دو زردہ پان کے لئے کہا۔

سلام کی بھونڈی شکل پر مسکراہٹ کی ایک جھلک
بکھر سی گئی۔ وہ جیسے بے صبرا ہو کر بولا: "شائق تم انہیں
جانتے ہو؟ یہ میرے بہت پرانے دوست ریاض ہیں۔
کسی وقت ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدقسمتی سے
میں نے اسکول چھوڑ دیا۔ اور کاروبار میں لگ گیا۔

لیکن ریاض پڑھ لکھ کر جمشید پور میں اسکول ماسٹر ہو گئے۔
یہاں یہ اپنے عزیزوں سے ملنے آئے ہیں"
شائق خوشی سے بے اختیار ہو کر ریاض سے
مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔
"آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی میں آپکی
کیا خدمت کروں، پان کھائیے"
"شکریہ، ریاض نے سنجیدگی سے کہا۔" شائق
تم مجھے نہیں پہچان سکے لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ جب میں
ناگپور میں تھا تو تمہیں کئی بار دیکھا۔ اس وقت تمہاری حالت
بہت اچھی تھی"
"کیا عرض کروں ریاض صاحب! یہ قدرت
کی ستم ظریفی ہے جو پڑھ لکھ کر بھی بیکار ہوں"
"یہ تمہارا غلط خیال ہے شائق، ایک پڑھا لکھا
آدمی اپنی سوجھ بوجھ سے روزی کی راہ نکال لیتا
ہے لیکن جو شخص اپنا غلط اصول نہیں چھوڑتا وہ ہمیشہ
مصیبت کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے۔ تم نوجوان ہو بلند
خیالی اور حوصلہ مندی سے کام لو، انشاء اللہ ایک دن
ضرور کامیاب ہوگے"
"میں نے چھوٹے بڑے تمام دروازوں کو کھٹکھٹایا
لیکن ہر دروازے سے دل شکن جواب ملا" شائق نہایت
دھیمی ہوئی آواز میں بولا۔ آخر مجبور ہو کر سینما کے سامنے میں
نے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان لگالی ہے۔ کبھی کبھی
سینما کے ٹکٹ مل جاتے ہیں۔ تو وہاں سے کچھ کمیشن پالیتا ہوں"
"کوئی اور دھندہ نہیں کرتے؟" ریاض کے
لہجہ میں دبا ہوا طنز تھا۔ شائق اسی انداز میں بولا۔ پہلے کچھ
ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے
ایک جگہ اب ٹیوشن پڑھاتا ہوں"
"شائق اگر بار خاطر نہ ہو تو ایک بات کہوں؟"

شائق جذبات ہو اٹھا۔ ریاض صاحب یہ
گندگا رہی۔ سچ پوچھئے تو مجھے زندہ نہیں رہنا چاہئے"۔
اور چپ چاپ سر جھکائے چلا گیا۔ جیسے کوئی فرض ادا کرنا
یاد آگیا ہو۔
ریاض اور سلام ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے

لبرٹی سینما سے ریاض "مغل اعظم" دیکھ کر
باہر نکلا۔ تو شائق کو مین گیٹ پر کسی پنجابی نوجوان سے باتیں
کرتے ہوئے دیکھا۔ آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا۔
"شائق پکچر دیکھنے جا رہے ہو کیا؟"
"نہیں صاحب یہ میری دیکھی ہوئی پکچر ہے۔ شاید
آپ دیکھ کر آ رہے ہیں"
"جی ہاں! ریاض مختصر جواب دے کر جانے لگا۔"
شائق بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔
"چائے پیوگے؟" ہوٹل کی طرف مڑتے ہوئے ریاض نے کہا
"شکریہ! پھر شائق نے کتابوں کی ایک چھوٹی
سی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہی میری دکان
ہے ریاض صاحب! وہ دیکھئے میرا پارٹنر بیٹھا ہوا ہے
سفید کھدر کی ٹوپی والا"
ریاض کھڑا ہو گیا اور غور سے دکان کی طرف
دیکھنے لگا۔ چند پرانے جاسوسی ناول اور کچھ فلمی رسالے
قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ اور ان پر پانچ سات اردو
ہندی اور انگریزی اخبار پڑے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی
پھینک کر چلا گیا ہو۔
"بڑی اچھی بزنس ہے شائق، ریاض نے حوصلہ
افزا لہجے میں کہا۔ اگر سچی لگن اور ایمانداری سے اسی
دھندے میں لگے رہو تو ایک دن ضرور تمہارا کاروبار

نکھر جائے گا۔"

شائق کے اداس چہرے پر یکبارگی تشکرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور جلدی سے بھولا بھائی تاج کے ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔ اور وہ دونوں ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

"چائے کی چسکی لیتے ہوئے شائق بولا۔ مغل اعظم آپ کو پکچر کیسی لگی؟"

"بہت عمدہ، دلیپ کمار کا رول مجھے بہت پسند آیا۔"

"لیکن مدھوبالا اور دلیپ کمار نے اس پکچر میں بہت کھل کر کام کیا ہے۔ ساری پکچر میں مدھوبالا کی جذباتی ایکٹنگ سب پر بھاری ہے۔ خدا کی قسم اس قدر عمدہ اور دلکش انداز سے اس نے کبھی کام نہیں کیا ہے۔ تعجب نہیں کہ مغل اعظم رواں سال کی بہترین پکچر قرار دی جائے۔"

"ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تا وقتیکہ سال رواں کی تمام فلمیں ریلیز نہ ہو جائیں۔"

"خیر یہ میری اپنی رائے ہے۔" شائق قدرے سنجیدہ ہو گیا۔"

"یہ تمہارے پاس کیسے پرچے ہیں شائق" ریاض نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"اخبار مشرق، آئینہ ہند، اور نشیمن" شائق کے چہرے پر تبسم کی ایک غیر مرئی جھلک ابھر گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں اردو ادب اور سیاست سے بہت دلچسپی ہے۔" پرچے الٹتے ہوئے ریاض مسکرائے

"جی ہاں! اپنی زبان کے ناطے مجھے لگاؤ ضرور ہے"

"شاعری کرنا جانتے ہو؟" ریاض نے چٹکی لی

"جی ہاں، کچھ تک بندی کر لیتا ہوں۔"

تم شعر بھی کہہ لیتے ہو؟ — ریاض نے کہا اس اطلاع سے کہ [illegible]

پھونک دیتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" ریاض کا سنجیدہ چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔"

"بس زیادہ وضاحت کر کے شرمندہ نہ کیجئے ریاض صاحب۔"

"اچھا بھئی، چلو پان کھایا جائے۔" ریاض اٹھ کر جانے لگا۔ اور شائق نے پرچے اپنی بغل میں دبا لئے۔

دھندلی دھندلی پرچھائیاں زمین کی گود میں اترنے لگی تھیں۔ شام کے اترتے ہوئے کاجل بھرے سائے جہانگیر باغ کی شاخوں پر رینگنے لگے تھے۔ اور فضا میں شدید [illegible] پیدا ہو گئی تھی۔ روشنیاں جل اٹھیں تو ریاض جہانگیر باغ سے چل پڑا۔ اور ساکچی بازار آیا بازار میں لال پیلے سنترے [illegible] اور کیلے خریدے اور آٹھ بجے رات وہ جمشید پور جانے والا تھا وہ سلام سے ملنے کے لئے اس کی دکان پر آیا۔ سلام اسے دیکھ کر مسکرا اٹھا۔ اور جھٹ اس کے لئے پان لگانے لگا۔ پان لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

شائق تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔ اور تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا۔

ریاض مسکرا دیا۔ اور بولا۔ "وہ عجیب طبیعت کا آدمی ہے یار۔ اس کی باتوں سے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اسے کسی حادثہ کا شدید صدمہ ہے۔"

"ہاں بھیا!" سلام نے اسے پان کی دو خوشبودار گلیاں دیتے ہوئے کہا۔ "بے چارہ گھر اور زندگی سے مجبور ہو کر خانہ بدوشی کی سی زندگی اختیار کر لی ہے۔ ایک دن غصے دکھ سے کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی [illegible]

اس بہانے کی خاطر ذلیل سے ذلیل کام بھی کیا۔

اتنے میں شائق دوڑتا ہوا آیا اور دس روپے کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا "سلام بھیا! ذرا مہربانی کرکے دس روپے کی ریزگاری دیدو۔ گاہک دکان پہ کھڑا ہوا ہے۔"

سلام نے نوٹ لے لیا اور ریزگاری دینے سے پہلے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا "یہ لو آج تمہارا خط آیا تھا۔"

شائق نے لفافہ کھول کر خط پڑھا اور ایک عجیب سرد مہری سے خط کو موڑ کر پھینک دیا۔ ریاض نے اس کی اس حرکت کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا "کیا ہوا شائق خط کیوں پھینک دیا؟"

شائق کے چہرے پہ بیزاری کی آڑی ترچھی لکیریں بکھر گئیں۔ اور وہ اپنے دلی درد کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اس چنڈال عورت کا خط ہے ریاض صاحب جو اپنے باپ کے گھر بیٹھی ہر مہینہ دو مہینہ بعد مجھ سے اپنا پاکٹ خرچ منگاتی ہے۔ کمبخت بیوی نہیں گلے میں مصیبت کا طوق ہے۔ حرام خود مرتی کیا نہیں۔ باپ کے گھر میں مفت کا کھا کھا کر بھینس بن گئی ہے۔ اور پھر مجھ سے روپیہ منگاتی ہے۔ اپنے پاکٹ خرچ کے لئے۔ بھائی جان! آپ ہی بتائیے جو عورت اپنے ماں باپ کے اشاروں پہ اپنے شوہر سے صبح و شام جھگڑتی رہتی اور بدکلامی کرتی ہو حتیٰ کہ وہ مارنے کی بھی دھمکی دیتی ہو۔ اس کے ساتھ ایک شریف آدمی کا نباہ کیسے ہو؟"

ریاض نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ بیوی کو اپنے ساتھ رکھ کر اسے پھر کوئی شکایت کا موقع نہ دو۔"

"کیا کروں ... بھائی صاحب" شائق سنجیدگی سے بولا "بہلانے کے واسطے کیا ہم ہر روز آج کے ... میری بچپن ہی میں شادی ہو گئی تھی۔ اور اس خطرے سے کہ مجھے گھر داماد بنا لیا جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ اڑوس پڑوس کی کانا پھوسیوں سے اس بد دماغ عورت کے تیور بدل گئے اور آئے دن بات بات پر ایک فتنہ کھڑا کر دیتی اور مرد کے وقار کے خلاف حملے کرنے لگتی۔"

شائق کی باتیں سن کر ریاض کے جذبات بھڑک اٹھے اور درمیان میں بگڑ کر بولا۔ "ایسی بد اخلاق اور بدکلام عورت کو ایک بار اچھی طرح سبق سکھا دیتے کہ پھر کبھی وہ نازیبا حرکت نہیں کرتی۔"

"بھائی صاحب! کیا عرض کروں۔" شائق کپکپا کر خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔ "دیو پیکر عورت سے کون ہاتھا پائی کرے۔ کمبخت مجھ سے دو فٹ لمبی اور ایک من بھاری ہے۔ ایک دن کی تو تو میں میں سے تنگ آ کر ایک دن میں نے اسے مارنے کی دھمکی دی۔ تو حرام زادی نے میرے سر کے بال پکڑ کر دو جھٹکے لگا دیئے۔ بس اسی دن سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ نہ جانے چڑیلوں کو میرا پتہ ٹھکانہ کیسے معلوم ہو گیا جو مہینہ دو مہینہ خط لکھ کر مجھ سے روپے کا تقاضا کرتی ہے۔"

"تم اسے یہاں کیوں نہیں بلا لیتے" ریاض نے مشفقانہ کہا۔

"میں اسے پھر اپنے گلے کا تعویذ نہیں بنانا چاہتا۔ بھائی صاحب!" پھر اس نے سلام سے مخاطب ہو کر کہا "لاؤ بھیا جلدی ریزگاری دو۔ گاہک انتظار کرتا ہو گا۔"

شائق ریزگاری لے کر دوڑ گیا۔ اور چشم زدن میں لوگوں کے ہجوم میں ڈوب گیا۔ ریاض اور سلام لے دیکھتے ہی رہے۔

شائق ـــــ او شائق ـــــ

سنو بھائی ـــــ شائق!!!

(کہانی)

شکیل علائی (گیا)

"خشک پودا، تازہ گلاب!!"

باوف دنوں سے چلی آرہی ٹیچرس ایسوسی ایشن کی ہڑتال ابھی تک جاری تھی لیکن سرکار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگ سکی تھی۔

شاہد کا تو زائیدہ بچہ اسکی خشک چھاتیوں سے اسقدر [illegible] نہ کر سکا کہ اسکی زندگی محفوظ رہتی اور ماں صرف سر جھکائے بیٹھی تھی ــــــ کہ آنسوؤں کا چشمہ بھی خشک سا ہو گیا تھا ـــــ! بازو میں بیٹھی دو ننھی زندگیاں جن کی عمر زیادہ سے زیادہ تین سال، پانچ سال ہونگی، ماں کو تنگ کر رہی تھیں کچھ کھانے کو مانگ رہی تھیں اور.......... اور...

.... فائینل ایر کا طالب العلم شاہد ایک سخت کشمکش میں مبتلا کبھی کمرے کے اندر آتا، اور کبھی باہر نکل جاتا، کبھی وہ مٹھیاں بھینچ لیتا اور کبھی دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتا ـــــ مگر جب سر اٹھا کر گردن جھکائے ماں اور روتی ہوئی بہنوں کو دیکھتا تو پھر وہ اسی فیصلہ تک پہونچتا ـــــ، اور پھر وہ ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا ـــــ!

حنا شاہد کی دلہن بن کر اس گھر میں خوشی خوشی [illegible] بچوں سے بہت محبت تھی جب بھی وہ کسی [illegible] کو دیکھتی تو پیار سے اسکے سر پر ہاتھ پھیرتی اور اسے چومنے لگتی آج تین سال سے بھی زیادہ ہو گئے لیکن حنا ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی ــــ!

حنا خاموش خاموش سی رہنے لگی تھی اسکے باوجود وہ اپنے لئے شاہد کے دل میں بے پناہ محبت سے بھی واقف تھی، لیکن وہ اپنے دل کو کسطرح سمجھاتی ـــــ! اور..........

اور.......... کب تک ؟

قدموں کی آوازیں ـــــ اور پھر دروازہ کھلتا ہے، سامنے شاہد کھڑا ہے، قیمتی ساڑیاں اور زیورات کا [illegible]! حنا سسک اٹھتی ہے۔ شاہد اس کی کھنکتی چوڑیوں میں اپنی انگلی گھماتا ہے اسے پیار کی قسم دیتا ہے اسے سینے سے لگا لیتا ہے لیکن حنا کو یہ احساس کچوکے لگاتا ہے کہ وہ ـــــ وہ سفید بادلوں سے پانی کی امید لگائے بیٹھی ہے ـــــ!!

راشد پانچ سال بعد آیا تھا، شاہد اس سے لپٹ کے ملا، حنا نے بھی اس کا ہنک کر

لیا مگر راشد کی نگاہوں سے حنا کے مرجھائے ہوئے رخسار پوشیدہ نہ رہے۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے حنا کی طرف دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا۔ مگر شاہد جبراً اٹھا،

تم کچھ چھپا رہے ہو ــــــ،

ہاں میں کچھ چھپا رہا ہوں، تم سے مطلب؟

ارے تو یہ بات ہے؟

کیا بات تھی؟

شاہد گھبرا جاتا ہے، جیسے اس کی چوری پکڑ لی جاتی ہے،

میں دراصل ....

شاہد کچھ کہنا چاہتا ہے،

تم دراصل بیوقوف ہو،

راشد ڈانٹتا ہے۔ اور پھر دونوں نکل پڑتے ہیں، گنگا کے کنارے جہاں انہوں نے برسوں ساتھ شامیں گذاری تھیں۔

اور پھر شاہد سسک پڑتا ہے اور پھر سسکیاں کہانی بن جاتی ہے۔ راشد! ابا تحریک کے جلوس کی قیادت کر رہے تھے بھوکے پیاسے گھر میں بھی ایک دانہ نہ تھا، میرے ننھے بھائی نے ٹھیک سے آنکھیں بھی نہ کھولی تھیں کہ سسک کر دم توڑ دیا، اس وقت منی اور بنو تین اور پانچ سال کی تھیں اور بھوک سے بلک رہی تھیں۔ ماں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور خبر ملی کہ ابا پولیس کی گولیوں سے شہید ہو گئے ــــــ،

میں کیا کرتا ــــــ؟

میں صرف طالب علم تھا ــــــ۔

چھوٹے بھائی کی لاش کو کفن اور ننھی بہنوں کی روٹی کے لئے میں اس وقت نسبندی کیمپ دوڑ گیا کہ وہاں پیسے مل رہے تھے نا ــــــ؟

اب! اب!! میں حنا کو کیسے سمجھاؤں کہ ....

میں تو شادی کے لئے ہی منع کر رہا تھا مگر وہ تو آنکھیں بند کئے ہوئے تھی۔

اب کیا ہوگا راشد؟

میں کیا کروں؟ اُف؟؟

اور سال بھر بعد حنا کی گود میں ایک گلاب ہنس رہا تھا ــــــ،

شاہد اس بچے کو اپنے بچے کی طرح پیار کر رہا تھا۔

اور راشد سر جھکائے کھڑا تھا ــــــ، جیسے سوچ رہا ہو،

نئے قوانین ضرورتاً وضع ہوتے ہیں یا مجبوراً ــــــ؟!

(تبصرہ)

نئی کتابوں کا تعارف

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
ڈاکٹر مغنی تبسم
رؤف جاوید

نام رسالہ: سہیل (ایک شمارہ شفیع مشہدی کے نام)
صفحات:- ۱۲۰
قیمت:- ۶/ روپے
پتہ:- ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ
روڈ، گیا- ۸۲۳۰۰۱
مبصر:- ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

"سہیل" کئی معنوں میں ایک تجوبہ روزگار ہے ایک تو اردو کا رسالہ ہوتے ہوئے گیا سے کوئی ۴۰ سال سے برابر نکل رہا ہے۔ اور پھر خاص نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ علامہ جمیل مظہری نمبر، کلیم الدین احمد نمبر، علیم اللہ حالی نمبر، منور رانا نمبر، اور ان کے بعد زیر نظر شفیع مشہدی نمبر تو حالیہ شمارے ہیں۔ ۴۰ سال سے جانے کتنے نمبر شائع کر ڈالے۔ سہیل عظیم آبادی پر ایک شمارہ شائع کیا تو کیفی اعظمی پر بھی ایک نمبر نکالا اور سالانہ زر تعاون بھی ایک عرصہ دراز سے صرف ۲۴/ روپیہ ہے۔ حالانکہ کاغذ سے لے کر روشنائی تک کون چیز ہے جس کے دام نہیں بڑھے۔

ان حالات میں "سہیل" کو اگر بیسویں صدی کا عجوبہ سمجھا جائے تو اس میں سمجھنے والے کا کیا قصور ہے۔

"سہیل" کے خاص شماروں میں عام طور پر اور زیر نظر شمارے میں خاص طور پر قاری یہ محسوس کرے گا کہ ادارہ "سہیل" سخن فہمی کا مظاہرہ کرتا ہے "غالب کی طرفداری" کا نہیں شاعر اور ادیب کی پہچان کرواتا ہے اور قاری کے ذہن کو مہمیز کرتا ہے پھر قاری اس شاعر اور ادیب کی تخلیقات کو باقاعدہ پڑھنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔

"سہیل" کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ بہار کے ادیبوں کو (جو خاصے "گھر پسند" ہوتے ہیں باہر کی دنیا سے متعارف ہونے سے بچتے ہیں) اردو کی دوسری ریاستوں کے پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اردو والوں کو بہار کے اردو دانوں سے متعارف کراتا ہے۔

شفیع مشہدی سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا حالانکہ بہار کئی بار جا چکا ہوں کئی ادبی محفلوں میں شامل رہا ہوں۔ اردو کانفرنس میں جا چکا ہوں لیکن اگر نہ مل سکا تو شفیع مشہدی سے نہیں مل سکا۔

شفیع مشہدی لگتا ہے اتنے ہی "مشہدی" ہیں جتنے آپ ہم آریہ یا دراویڈین ہیں۔

اس شمارے میں شفیع مشہدی پر کئی مضامین ہیں۔ ان کی ڈرامہ نگاری پر، ان کی کہانیوں ۔ ان کی شاعری پر اور خود ان کے انشائیے بھی ہیں۔ کہانیوں کے نمونے بھی ہیں اور شاعری کا انتخاب بھی ہے۔ ایک ڈرامہ بھی شامل ہے

اس شمارے کا میری نظر میں بہترین مضمون ذکیہ مشہدی کا ہے۔ وہ "دھرم سنکٹ" میں پڑ گئی تھیں کہ کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں۔ تعریف کرتی ہیں تو الزام عائد ہوتا ہے کہ "غالب کی طرفدار" ہیں۔ کچھ ایسی ویسی بات کہہ دیں تو خطرہ ہے کہ گھر میں کہرام مچ جائے۔

لیکن ذکیہ ایک ادیبانہ شان سے اس مرحلے سے گزر گئیں۔ ان کے مضمون میں اگر لکھنؤ کی زبان کا لوچ ہے بیان میں بذلہ سنجی کی زیریں رو آپ پر مسکراہٹ طاری کر دیتی ہے تو کہیں کہیں شوخیانہ چھیڑ۔ اپنے شوہر سے ان کے والہانہ عشق کی چغلی کھاتی ہے پھر وہ بھی تو کہانیاں لکھتی ہیں۔ معاصرانہ رکھ رکھاؤ بھی ان کے مضمون سے جھانکتا نظر آتا ہے۔

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے وہ خاکے بنائے ہیں جن میں مشہدی کی شخصیت بھی اجاگر ہوتی ہے اور ادبی حیثیت بھی ابھر آتی ہے پھر بھی بات مزاح کا لبادہ اوڑھے ہوئے رہتی ہے۔

ان کے ڈراموں، کہانیوں اور منتخب کلام کے بھی نمونے اس شمارہ میں شامل ہیں اور ان پر کچھ تبصرے یہاں ملتے ہیں ان سے شفیع مشہدی کی ادبی شخصیت اور ان کے ادبی سفر کا کچھ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

ایک تو ان کی دو رخی شخصیت ہے اور دوسرے ان کی دفتری حیثیت ہے۔ پھر وہ سماج کے ایک فعال رکن ہیں۔ مشاہدہ کرتے اور مشاہدے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس لئے وہ حقیقتوں کو بیان کر دیتے ہیں اور دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کہیں چناؤ کی دھاندلیوں سے غمگین ہوتے ہیں تو کہیں جمہوریت کی پامالی اور جمہوری اداروں کی تباہی پر نالاں ہیں۔ جہاں رشوت خوری پر کھل کر کہتے ہیں وہیں ایک فرشتہ صفت بیوی کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں جو اپنے بیمار بیٹے کی موت برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے شوہر کے اندر رشوت خوری کا کیڑا نہیں سہہ سکتی۔

وہ معاہدے کر کے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ نہیں کہ بڑھنا نہیں چاہتے بلکہ شاید مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ قاری کو آئینہ دکھا دیں اب آگے کا راستہ قاری نکال لے پھر ادب ہی تخلیقی نہیں ہوتا قاری تو ادب پارے کی تخلیقی تاویل کرتا ہے اپنے شعور اور اپنے تجربوں کی روشنی میں۔ یہ تجربے اور یہ شعور مشہدی اور ان کے قاری میں قدر مشترک لگتا ہے۔ مشہدی پر ایک ایسا دور بھی گزر چکا ہے جب کہ وہ کچھ علامتوں کی زبان میں لکھنے لگے تھے جو ایک اوسط قاری کی فہم کی سطح سے شاید اونچا تھا۔ کہیں یہ جدیدیت کی ہوا تو نہیں تھی؟ کہیں یہ بات تو نہیں تھی کہ مشہدی اپنے ہم عصر شہریوں کی اپنا چہرہ زوال پذیر سماجی نظام کے ٹوٹے بکھرتے آئینے میں دیکھ رہے تھے اور اپنا آپ کی پہچان نہیں پا رہے تھے

تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ کوئی ان کی پہچان انہیں لوٹا
دے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ سرکاری نوکری اور ادبی
مزاج میں ایک ٹکراؤ تھا جس سے ان کی شخصیت ٹوٹ
سی گئی انہیں جمالیاتی تسکین میسر نہ تھی۔ "شق البشر"
کی کیفیت تھی لازم سرکار شفیع ایک ہیں تو ادیب
شفیع دوسرے۔

لیکن ان میں پھر ایک طرح استحکام آجاتا ہے۔
"سبز پرندوں کا سفر" افسانہ اور "ابابیل"
نظم دونوں ایک ہی سمت میں اشارہ کرتی ہیں۔ اب
آسمانوں پر وہ حیات افروز "پرندے" نظر نہیں آتے
جو بدی کا مقابلہ کرکے انسانیت کو بچالیتے۔

قریب قریب یہی بات وہ شعر میں کہتے ہیں۔

عجیب موڑ پہ آکر ٹھہر گئی ہے حیات
نہ کوئی سمت نہ جادہ نہ کوئی پیش نہ پس

یہاں صاف ظاہر ہے کہ شہدی ایک طرح بدی
کی قوتوں کی یورش سے افسردگی کا شکار ہیں اور ان کی
نظروں سے وہ قوتیں اوجھل ہیں جو اس بدی سے برسر
پیکار ہیں۔ ان قوتوں سے وہ حوصلہ حاصل نہیں کرتے
لیکن یہ موڈ بدل بھی جاتا ہے۔ کبھی تو وہ کہتے ہیں۔

وہ پڑھتا رہتا ہے مجھ کو کتاب کی صورت
خود اپنے چہرے پہ میں نے تو کچھ لکھا بھی نہیں

پھر یوں بھی کہتے ہیں ـــ

رہی نہ جادہ و منزل نہیں ہمارا سفر
ہمارے نقش کف پا کو رہبری ترسے

یا یہ سفر ...

جنہیں فانوس میں تو کچھ بھی ہے، کلیا بھی

شعور سنجیدہ کو لیکن یہ تبدیلی محسوس
سارا رسالہ چھان ڈالنے کے بعد بھی یہ پتہ
نہیں چلتا کہ شفیع مشہدی ملول کیا ہیں؟ ڈرامہ نگار
کہانی کار یا شاعر یا پھر راجا مزدور کہ بند موشگاف
پڑنے پر دیہات والوں کے ساتھ خود بھی مزدوری
کرنے لگتے ہیں یا پھر بانس کی سیڑھی پر چڑھے پیاز
ٹانگتے نظر آتے ہیں۔ کبھی بچوں سے کھیلتے ہیں تو کبھی
بیوی کی بہنیں ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں
کی ایسی تعریف کرتی ہیں کہ قاری کے منہ میں پانی
آجائے۔ لیکن اس تعریف میں بھی عاشقانہ معتبری
جھلکتی ہے۔

غرض شفیع مشہدی کا سب کچھ ہیں لیکن اعلاً
وہ ادیب و فنکار ہیں۔

"سہیل" نے یقیناً شفیع مشہدی کے نام
ایک شمارہ شائع کرکے ایک ادیب کو اردو والوں
کے سامنے پیش کیا اور ادب کی بڑی خدمت انجام دی

(نئی دہلی ۱۹ فروری ۱۹۸۷ء)

کتاب کا نام: لب گویا (شعری مجموعہ)
فنکار کا نام: علی عباس امید
مبصر: ڈاکٹر محمد مثنیٰ

"لب گویا" علی عباس امید کی نظموں اور غزلوں
کا مجموعہ ہے۔ علی عباس امید کی شعری تخلیقات ہندوستان
اور پاکستان کے متعدد جرائد اور رسائل میں شائع ہوکر
سنجیدہ قارئین اور ناقدین سے خراج تحسین وصول
کرچکی ہیں۔ ان کا نام ادبی حلقوں میں جانا پہچانا
نام ہے ان کی تخلیقات جہاں ایک طرف ہمارے
جذبات و احساسات کے نازک تاروں کو چھیڑتی

رہیا دہیں دوسری طرف دعوت غور و فکر بھی دیتی ہیں۔ جذبہ اور فکر کے اسی امتزاج نے اور لب و لہجہ کی ندرت اور تازگی نے ان کو اپنے ہمعصروں میں ایک خاص اہمیت بخشی ہے۔ ان کی شاعری میں طرفگی کے ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے دکھ درد کا جو شدید احساس ہے وہ ان کے لہجہ میں گھلاوٹ اور نرمی تو ضرور پیدا کرتا ہے لیکن یاس اور ناامیدی کی فضا کو ان کی شاعری پر چھانے نہیں دیتا کیونکہ زندگی کے سچے عرفان کی بدولت روشنی اور قوت شفا پر ان کا ایمان بڑا پختہ ہے۔ وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ تاریکی سے نور انہیں صاف چھنتا نظر آتا ہے۔ زندگی کے اس عرفان اور شعور کو انہوں نے بڑے تیکھے مگر شائستہ انداز میں اپنی نظموں اور غزلوں میں منتقل کیا ہے اسی لئے ان کے یہاں تاثیر اور کیفیت کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ "التجا" "اور ایک کہانی" "گیان" "یزدان اور اعتماد" "ندی کا رجز" "جنریشن کا دکھ" جیسی خوبصورت، فکر خیز اور پُر اثر نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی ان کی یہ انفرادیت پوری طرح نمایاں رہی ہے۔ راہی معصوم رضا اور وزیر آغا کے پیش لفظ کی شمولیت نے کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے۔ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی یہ مجموعہ بہت دلکش ہے۔ قیمت پچاس روپئے ہے اور تقسیم کار ہیں شب خون ۳۱۳ رانی منڈی۔ الٰہ آباد اور بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ۔ بھوپال

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

کتاب کا نام: فکر نو (غزلیات کا مجموعہ)
فن کار کا نام: واحد پریمی
مبصر: ڈاکٹر محمد مثنیٰ

"فکر نو" واحد پریمی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جسے بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال نے شائع کیا ہے واحد پریمی صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کے کلام میں شدت احساس کے ساتھ زبان و بیان کا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ ان کے تجربات میں خلوص اور احساسات میں صداقت محسوس ہوتی ہے۔ روایت کے صحیح احترام کے باعث فن کے نکات پر ان کی نظر گہری ہے۔ ان کے مجموعہ "گل نو" کو ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی امید ہے کہ اس مجموعہ کی پذیرائی بھی ویسی ہی ہوگی۔ کتاب صوری اعتبار سے اطمینان بخش ہے۔ قیمت بیس روپے ہے۔

نام کتاب: روشن الاؤ
مصنف: سیفی سرونجی
ناشر: سیفی لائبریری، سرونج (ایم۔ پی)
مبصر: معروف جاوید

سیفی سرونجی کا مجموعہ کلام "روشن الاؤ" ہمارے سامنے ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال کی امداد پر شائع ہوا ہے۔

سیفی سرونجی خالص غزل کا شاعر ہے۔ اس کی غزلوں میں زندگی اور زندگی کی عصری حقیقتیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ مسلسل جد و جہد پیہم کوششیں اور زندگی کی راہوں میں آنے والے ہر طوفان سے ٹکراتے رہنا اس

کا مقدر ہے۔ کسی کے ساتھ دینے کی توقع اسے قطعی نہیں ہے۔

سیفی کا ساتھ رہینگے بھلا کس طرح وہ لوگ
طوفاں کا نام سن کے جو غمناک ہو گئے

آج ملک بھر میں انگنت شعراء ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں چھپنے والے بھی کم نہیں۔ لیکن اس بڑی بھیڑ میں وہ ہی شعرا الگ سے دکھائی دیتے ہیں جنکی شعری زبان تخلیقی ہے۔ لہجہ نیا اور موضوع کو برتنے کا طریقہ way of treatment مختلف ہے۔

ان صفحات کی روشنی میں سیفی کی شعری زبان اگر تخلیقی نہیں ہے تو کتابی درباری بھی نہیں ہے بلکہ سڑکوں گلیوں، ہوٹلوں اور کھولیوں میں بولی جاتے والی عوامی زبان یقینی ہے۔ اپنے دعوے کی تصدیق میں چند اشعار نوٹ کر رہا ہوں۔

تجھکو اگر تلاش کسی دیوتا کی ہے
محلوں کے خواب چھوڑ دے کچے مکان دیکھ

جب تری گلیوں سے ہم لوٹ کے گھر آئے تھے
دھول سر پر تھی بہت خون تر آئے تھے

مجھکو حیرت ہے کہ گھاٹا نہیں ہوتا تم کو
کس سے سیکھا ہے یہاں تم نے تجارت کرنا

کل کائنات قدرت کی تخلیق ہے۔ انسان کی کاوشیں، تلاش اور تحقیق تک محدود ہیں۔ پتھر کے زمانے سے ایٹمی زمانے تک جتنی بھی تخلیقات انسان کے نام سے منسوب ہیں وہ ساری انسانی تحقیقات (INVENTIONS) ہیں انسان نے تحقیق کو نیا روپ (CREATIVE) شکل دی ہے۔ یہ برتنے یا ترتیب دینے کا طریقہ فن کہلاتا ہے۔ لیکن سیفی کے یہاں نہ کوئی تحقیق (INVENTION) اور نہ کوئی تخلیق (CREATION) ہے اس نے تو ایک بڑا سچ بولا ہے۔ جو زندگی وہ بھوگ رہا ہے زندگی کی ان حقیقتوں کو سلیقہ سے سپرد قلم کر دیا ہے کر رہا ہے۔ یہ سچ ہی اس کا موضوع سخن ہے اور اس کا سلیقۂ اظہار اس کا فن ہے۔ جو بات وہ کہتا ہے اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے۔ اس کے یہاں ترسیل کا المیہ نہیں ہے۔

گوالیار کی ایک ادبی نشست میں جناب ندا فاضلی نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا۔ "وہ ماں کے پیٹ سے قبر تک ایک راستہ ہے ہر شخص اس راستہ پر سفر کر رہا ہے۔ یہ شخص پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح یہ سفر طے کرے"

سیفی سرونجی نے اپنے سفر میں جس راستے کا یقین کیا ہے وہ ادب اور زبان کی خدمت ہے۔ جس کے لئے سیفی کی مسلسل جدوجہد ہے

مقصد ہے مرا جلنا جلوں گا تمام عمر
مانا کہ راستہ ہے نشیب و فراز کا

بقول کسی نقاد کے شاعر کو سمجھنے کے لئے کوئی تبصرہ یا تجزیہ پڑھنے کے بجائے شاعر کا کلام پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقے کا ملک ہے، نہ کسی
خاص مذہب کا، یہ سبھی مذہبوں، زبانوں، فرقوں
اور کلچر کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی
وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ ٹیگور
رویندر اور قاضی نذرالاسلام یا ذکر اور
اقبال سبھوں نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور
کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے سبھی گھروں میں گائے
جاتے ہیں۔ نانک کی بانی آج بھی ہندوؤں کے
گھروں کو پاک کرتی ہے۔ مختلفتا میں ایکتا ہی
ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی
ہی روایت ہے۔

یہی ہماری مریادا ہے

آیئے ہم سب مل کر اس روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

... 386 - ...(...-307)/85-86

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

آپ کے موقر جریدہ "سہیل" کے دسمبر ۱۹۸۵ء کے
شمارے میں ڈاکٹر شعیب راہی کا وقیع مضمون "حسرت
کا رجحان شاعری" پڑھا۔ یہ مضمون مختصر سہی لیکن اس سے
حسرت کے سیاسی نظریئے پر روشنی پڑتی ہے اور یہ فیصلہ
کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ مولانا حسرت موہانی
ڈکٹیٹرشپ، سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ اور ان قوتوں کے
کٹر مخالف تھے جو انسانی محنت کا استحصال کر کے ہر سال
کروڑوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی
ہے۔ اور جو ادیب اور دانشور ان سیاہ طاقتوں کے خلاف
جدوجہد کرتے ہیں انھیں بھی گوناگوں مصائب سے دوچار
ہونا پڑتا ہے۔

آزاد ہندوستان چالیس سال (تقریباً نصف
صدی) سے انھیں منحوس طاقتوں کے شکنجے میں ہے اور یہ
طاقتیں وقت بے وقت گاندھیائی فلسفۂ حیات اور ناقابلِ
عمل عدم تشدد کا ڈھنڈورا پیٹ کر اپنا الو سیدھا
کرتی رہتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جن طاقتوں نے غلامی
کے دور میں سفید آقاؤں کا ساتھ دیا اور مجاہدینِ آزادی
سے غداری کرتی رہیں آج وہی طاقتیں ہندوستان کی تقدیر کی
مالک ہیں۔ یہ طاقتیں، مجاہدینِ آزادی کے کارناموں
سے عوام کو بے بہرہ رکھنا چاہتی ہیں تاکہ عام آدمی کو یہ
معلوم نہ ہو سکے کہ آزادی کے لئے قربانی کس نے دی

اور اس کا جشن کون منا رہا ہے

جنگ آزادی کے مجاہد مولانا حسرت موہانی نے اردو
شاعری خصوصاً اردو غزل کو اس کے سطحی اور تر
گھروندے سے نکال کر زندگی کی صداقتوں اور عصر
کی ضرورتوں سے روشناس کرایا۔ موصوف "یاسیت"
احساس شکست" کے خلاف فنی محاذ پر نبرد آزما
یہاں تک کہ سچ بولنے اور سچ لکھنے کے جرم میں جیل
بھیج گئے۔ اس حسرت کے فنی کارناموں پر بڑی بے شرمی
پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری
اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ حسرت کو نئی غز
کا معمار تو کہا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری کا رخ
کی طرف نہ موڑ کر خالص رومان کی طرف موڑ دیا جاتا ہے

"تیرا ننگے پاؤں وہ کوٹھے پہ آنا یاد ہے" یا
"نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

کے ارد گرد کہیں ان کی قبر تیار کر دی جاتی ہے اور
مولانا کو ایک شوخ، غیر سنجیدہ اور بذلہ سنج غزل گو بنا
اس قبر میں لٹا دیا جاتا ہے

حسرت بلاشبہ ایک سامراج دشمن شاعر تھے۔ ڈا
شعیب راہی نے اپنے مضمون میں حسرت کے اسی فنی رخ
پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے عوض "معتوب" ہوئے
جس کا ذکر انھوں نے اسی شمارے میں شائع شدہ اپنے
مراسلے میں کیا ہے۔ ڈاکٹر شعیب راہی نے اپنے مضمون
میں حسرت کے تقریباً چالیس ایسے اشعار کوڈ کئے ہیں جن
سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد ملک میں جو بھی رفتار
سیاسی تبدیلیوں کی تھی حسرت اس کا ایک ایک سے کو
اپنا ندہ کرتے رہے اور کسی مرحلے پر اس سے غافل نہ رہے
ڈاکٹر موصوف اگر اپنے مضمون میں گاندھیائی فلسفے کی قلعی

ضرور کھولتے تو شاید اُن کا مضمون "بارگاہ کبکلاہی" میں
شرفِ باریابی حاصل کر لیتا۔ اُمید ہے کہ راہی صاحب حسرت
کی زندہ اور متحرک شاعری پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ ڈاکٹر صاحب
کے ساتھ ادارہ سہیل بھی شکریے کا مستحق ہے جس نے حق گوئی
و بے باکی کا مظاہرہ کیا۔

حسن نجمی سکندر پوری۔ دہلی

سہیل کے ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۸۵ء کے شمارے ملے۔
یادِ رفتگاں کا شکریہ۔ ستمبر کے شمارے میں قیصر زماں قیس کا
لکھا ہوا سوانحی خاکہ "رضیہ سجاد ظہیر" اچھا تھا۔ ڈاکٹر
وودے سرن ارمان کی لکھی ہوئی کہانی "اترا ہوا چہرہ" بہت
اچھی کہانی ہے۔ اگرچہ کہانی تلخ ہے لیکن بالکل حقیقت کے
مترادف ہے اور حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ مختصر صفحات میں دلچسپ
مواد پیش کیا گیا ہے۔ عقیل گیاوی اور حسن نظامی کی غزلیں
خوب ہیں۔ انتخاب۔ عارف کی نظم "ایک رُخ" بہت عمدہ ہے۔
اتنی کم قیمت میں اس قدر شاندار پرچہ نکالنے پر آپ
مبارکباد کے مستحق ہیں۔ البتہ چھپائی کا کچھ سقم ہے اگر
اس طرف توجہ دیا تو پرچہ معنوی اعتبار کے علاوہ صوری
اعتبار سے بھی اچھا ہو جائے گا۔

شمیمہ عباس جارچوی۔ کراچی

اکتوبر ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ قرآن کی روشنی
میں بہت ہی معلوماتی مضمون ہے۔ سبھی افسانے اور غزلیں
اچھی ہیں۔ "اترا ہوا چہرہ" افسانہ بیحد پسند آیا۔ غزل
میں حسن نظامی صاحب کا یہ شعر دل کو چھو گیا ؎

وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں چہرے سارے
آج اپنے ہیں، وہی لوگ پرائے ہوں گے

حسن نظامی صاحب ایک اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ انہیں میری
مبارکباد پہنچا دیجئے۔

آفتاب عالم سکریٹری شاہین کلب "دھ

سالِ نو مبارک ہو۔ ماہنامہ سہیل کے دو شمارے پڑھنے
ملے۔ پڑھ کر کافی مسرت و فرحت حاصل ہوئی۔ سہیل کا ادبی
معیار بہت ہی بلند ہے۔ میں نظریاتی اعتبار سے اختلاف
تو ضرور رکھتا ہوں مگر ادبی افادیت کے پہلو کو سامنے رکھتے
ہوئے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ عظیم فیروزآبادی
اور ڈاکٹر عبدالمغنی کے بحث و تحقیق کا سلسلہ خوب ہے
اس کی وجہ سے علامہ اقبال کے سلسلے میں بہت سے تاریک
گوشے سامنے آئیں گے۔ عظیم فیروزآبادی کا مضمون میں
جو گوش حقیقت نیوش ہو" پڑھ کر مسرت ہوئی۔ مگر عظیم
آبادی صاحب اقبالیات کے سلسلے میں صرف ظاہری معلومات
رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی ذہنی پستی اور خیالات کی سطحیت
کا پتہ چلتا ہے۔ وہ شاید تحقیق کے مشناور نہیں
لئے صرف ظاہری معلومات پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
انھیں اقبالیات کے سلسلے میں معلومات عطا فرمائے۔

عبدالحق حقانی ایم۔ اے قاسمی
دارالعلوم، دیوبند

"سہیل" نومبر ۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں
کے کالم میں خواجہ عبدالرزاق جمشید پوری کا خط شائع ہوا ہے
جس میں انہوں نے تبصرہ فرمایا ہے۔ "ان میں تارا چرن
رستوگی کا جاندار اور پُر مغز مضمون پسند آیا۔ عظیم فیروز
آبادی کے نام خطوط میں جس طرح ...... انھیں لتاڑا
ہے وہ ان کے مستحق بھی تھے۔ لگے ہاتھوں ڈاکٹر مغنی کو بھی
نہیں بخشا۔" حیرت ہوتی ہے کہ آپ بے علم حضرات
خطوط شائع کر کے اپنے رسالہ کا معیار گرا رہے ہیں۔ بھلا

صاحب کی علمی استعداد اتنی کہ ہے کہ رستوگی صاحب کے مضمون کا مفہوم بھی انکی سمجھ میں نہیں آیا۔ رستوگی صاحب نے عظیم صاحب کی ناقدانہ صلاحیتوں کو اور انکی اصابت رائے کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور اس کے ساتھ مغنی صاحب کی سخن ناشناسی کو طشت ازبام کیا ہے۔ رستوگی صاحب نے عظیم صاحب کو سراہا ہے نہ کہ لتاڑا ہے ــــ ایسے شخص کا خط شائع کر کے جسمیں تحسین اور تنقیص میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہو آپ اپنے موقر جریدے کی اہمیت کم کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خود رستوگی صاحب کی نظر سے جب یہ خط گزرے گا تو ان پہ کیا بیتے گی۔

جلال قریشی۔ دہلی

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ سہیل بھجوانے کے لئے شکریہ۔ "یگ یگ پہ قدموں کے نشان کا شاعر" شاذ تمکنت بہت اچھی تحریر ہے اور قریب قریب سبھی مضامین تشفی بخش ہیں۔ غزلوں کا STANDARD ٹھیک نہیں ہے۔ ہمتاد تشنہ صاحب کی غزل وزن سے خارج ہے۔ اُمید ہے آپ میری رائے سے متفق ہونگے۔ کتابت کی طرف ذرا دھیان دیں گے۔ اُمید کہ میری باتوں کا بُرا نہ مانیں گے

اعجاز طالب۔

حیرت ہے۔ میرا لہجہ آپ کو غیر شائستہ لگا اس لئے کہ اقبال کے پردے میں اسلامیت پر نشتر چلانے والوں کا میں نے احترام نہیں کیا۔ مگر وہ لہجہ آپ کو شائستہ لگا جنہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں عظیم مفکر اور دلمن دوست اقبال کی شان میں تضحیک آمیز بیانات قلم بند کئے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں مغربی مفکروں کے اقوال سے پرہیز کیا ہے۔ اقبال پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ شاید ہی کوئی گوشہ باقی بچا ہو

اگر میں نے اپنی جانب سے جس بات کا بائیکاٹ کیا ہے اس کے لئے بھی تمہید کا ہونا ضروری تھا۔ مغربی تنقید کا اصول آپ کو معلوم ہوتا تو میرے مضمون کے بارے میں آپ غیر شائستہ کا ذکر نہ کرتے۔ میں نے تو شائستگی برتی ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے جو مجھ سے پہلے کے لوگ نہ کر سکے۔ صحافت ایمانداری کیا ہے۔ یہ میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ آپکو زیادہ تجربہ ہوگا۔ اردو رسائل اور مدیران کی خوش فہمیوں سے اب گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ مجھے چھپنے چھپانے کا زیادہ شوق نہیں رہا۔ آپ کو حق ہے آپ مضمون شائع نہ کریں میرے پاس مضمون واپس تو بھیج سکتے ہیں۔ یہ تحریک جو اس مضمون کے ذریعے میں نے شروع کی ہے اسے میں جاری رکھوں گا۔ اور ہر اقبال شکن حضرات، ان سے جڑے لوگوں کی مٹی پلید کرتا رہوں گا۔ پھر ایکبار اس کے لئے معافی چاہوں گا۔

مظفر عالم ذوقی (آرہ)

دسمبر ۸۹ء کے سہیل میں نسیم بن آسی کے افسانے سے متعلق خط پڑھکر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ مذکورہ بالا خط کی تحریر سے محض ذاتی اختلاف ہی نہیں بلکہ عناد کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ مزید برآں آپس میں نفاق پیدا کرنے کی غرض سے اس میں میرا اور میرے ساتھ عزیز محمد نواز سہیل کا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے جبکہ اس خط سے ہم دونوں کا نہ تعلق ہے اور نہ ہمیں اس کا علم۔

نسیم بن آسی کے افسانہ کے ساتھ ساتھ سہیل کے دوسرے مندرجات پر جو "تنقید" کی گئی ہے وہ بھی بجائے خود ناقص اور غیر سنجیدہ تحسین یا تنقیص سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "سہیل" کا معیار کافی اچھا ہے۔ اور اسے اچھے اور معیاری اہل قلم حضرات کا [illegible]

انتہا سہیل کا
بھی حاصل ہے

میرے خیال میں "سہیل" جیسے شائستہ ادبی و علمی جریدہ میں اس طرح کے فرضی اور شرانگیز خطوط کی اشاعت سے گریز بیحد ضروری ہے۔ والسّلام۔

اصغر علی انصاری۔ غلمرائے

جنوری کے "سہیل" میں جناب نسیم بن آسی کے افسانہ پر ایک تنقیدی خط شائع ہوا ہے۔ خط کے نیچے میرا نام ہے۔ جب کہ میں نے موصوف کا افسانہ پڑھا ہی نہیں۔ حیرت ہے غلط کار لوگ کس طرح ٹٹی کی آڑ میں شکار کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

برائے مہربانی یہ خط شائع کریں جس سے آئندہ اس طرح کی نازیبا حرکتیں کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہو۔

شہناز نواز، غلمرائے

خط اور محبت کا شکریہ۔ فی الحال دو مضامین بھیج رہا ہوں ۱۔ "آخر لادو گل" سری نگر اور جہلم کے تعلق سے دلچسپی کا حامل ہے۔ لیکن نئی باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۲۔ "لوک کہانیاں منٹو کی" جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے جذبات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

منٹو ___ جسے بعض انتہا پسند ادبی حلقوں نے عریاں نویس اور جنس زدہ کہہ کر رد کر دیا گیا ___ [illegible] مسئلے پر اپنے انداز میں اظہار خیال کرتا ہے۔

اور اس کا مطالعہ تقریباً لفظ لفظ کرتے ہیں

یہاں تو اس بار جاڑے میں بُری طرح پھنس گئے ہیں۔ درجہ حرارت منفی ۱۱ اور ۱۲ درجے سے بھی گر گیا۔ اس قدر شدید جاڑا تو ہم نے بہت کم دیکھا ہے۔ کام ہی نہیں ہو پاتا۔ آپ کے یہاں موسم کیسا ہے؟ بیمار ہوں اور گوشۂ عافیت میں پڑا ہوں۔ یہاں تو ویسے بھی چاروں طرف بھائیں بھائیں کرتا ہوا سناٹا ہے۔ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ جیسے کسی تاریک غار میں دفن ہو گیا ہوں۔ کبھی کوئی کالا کوا بھوک سے بے چین ہو کر چیختا نکلتا ہے اور کسی چھت کی منڈیر سے اڑ کر کسی درخت کی اونچی ٹہنی کی طرف بھاگ جاتا ہے ___ تب احساس ہوتا ہے کہ ہم اس دنیا میں رہ رہے ہیں۔

برج پریمی۔ سری نگر

سہیل کا مطالعہ گزشتہ پندرہ سال سے کر رہی ہوں۔ سہیل کو کسی بھی علمی اور ادبی جریدے کے مقابل فخر کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ کم قیمت پر اس قدر معیاری علمی و ادبی جریدہ کی اشاعت واقعی حیرت کی بات ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ آپ ذرا طباعت پر بھی دھیان دیں۔

مس کائنات رشید
گریڈیہہ (بہار)

مٹھائیاں
اور
نانفیاں
تیار کردہ: آر۔ ایس فیکٹری گیا (بہار)
SOHAIL

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
RAHIM KHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے۔ آر۔ چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال

d. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Sid. .oad, Gaya - 823 001
years of Publication Phone ; 21573
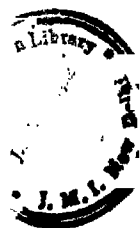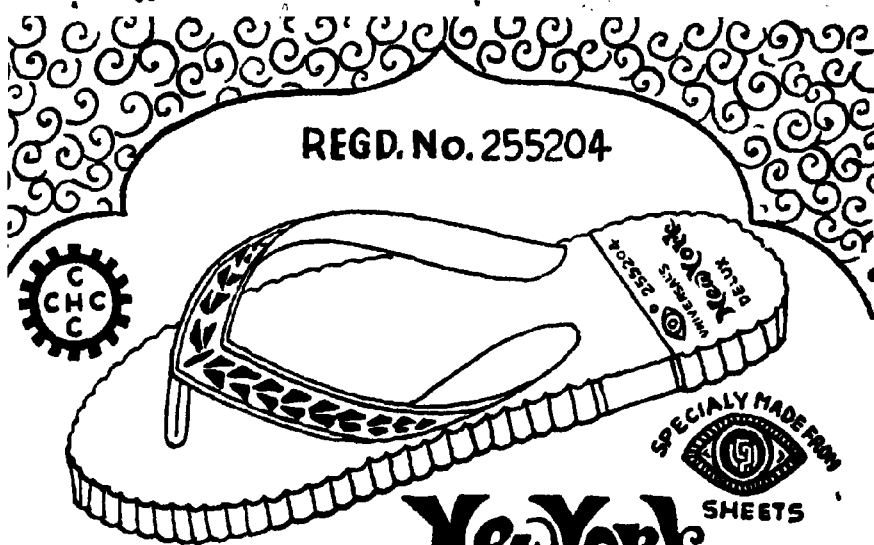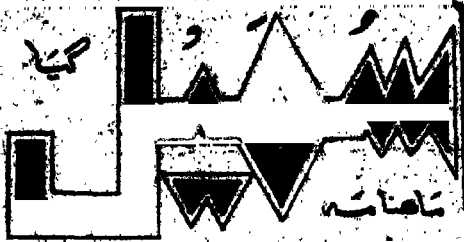
" When, in the process of creation, the writer does not determine a goal for himself, all that he writes is doomed to oblivion. When his works reflect that which the people as a whole are thinking about, when the writer expresses the aspirations of the whole nation, then his works will surely occupy their proper place in literature."

— Rabindra Nath Tagore

MAY - JUNE '86 Rs. 2/-

JRI
TRADE MARK
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبُوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22

بالوں کی جڑوں کو
ہے اور نئے
اور بڑھنے لگتے
اس کے استعمال سے
ہے اور دماغ کو
روغن بینظیر
سے طبی اصول
TEKKA
KEORA WATER

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

سنہ ۱۹۸۶ء

مدیر و سرپرست: ادریس سنسہاروی
چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
ایڈیٹر: جمیل منظر
معاون: شکیل احمد جالی ۔ عبدالقیوم ابدالی

مجلس مشاورت
ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینیر

جلد نمبر:
شمارہ نمبر:
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ ۔ گیا

بدل اشتراک: فی شمارہ ۲ روپے ۔ زر سالانہ: ۲۴ روپے ۔ لائف ممبری: ۲۵۱ روپے ۔ فون نمبر ۲۳۰۷۱۵

۱۔	نمود (آہ! سبطِ حسن)	جمیل منظر سنسہاروی	۸
۲۔	اقبال اور عالمی ادب	ڈاکٹر شعیب راہی	۹
۳۔	پریم چند کے سوانحی مضامین	مانک ٹالہ	۲۱
۴۔	قرآن کی روشنی میں	اصغر علی انجینیر	۲۷
۵۔	جالب صاحب	اسیم کاویانی	۳۱
۶۔	نظمیں	مشتاق شبنم	۴۲
۷۔	غزلیں	فضا ابن فیضی	۴۵
۸۔	غزلیں	حسن نجمی سکندرپوری	۴۶
۹۔	غزلیں	محمد عبدالقادر ادیب	۴۷
۱۰۔	اکھڑتے قدم (کہانی)	شرون کمار ورما	۴۹
۱۱۔	اور گھاٹا پورا ہو گیا (کہانی)	ڈاکٹر شکیل احمد	۵۳
۱۲۔	گرم سویٹر (کہانی)	نسیم بن آسی	۵۵
۱۳۔	نئی کتابوں کا تعارف	جمیل علائی	۵۸
۱۴۔	شہرِ خیال	عبدالقادر ادیب ۔ نقیب اکبر ۔ منصور اعجاز ۔ نسیم شمسی ۔ عطاءاللہ جلال ۔ نسیم بن آسی ۔ نشاط الایمان	[illegible]

[ممد]

آہ! سبطِ حسن

مُمتاز ترقی پسند دانشور
ایک عظیم فن کار
ایک عظیم انسان
ایک بزرگ دوست
اور
"موسیٰ سے مارکس تک"
کے خالق

سبطِ حسن

کے
اچانک انتقال پُرملال پر

ادارہ سُہیل

موصوف کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے
اور
دُعا گو ہے کہ
خدا انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے
آمین ط

سوگوار: جمیل مظہر سُنہاروی

ڈاکٹر شعیب راحی

"اقبال اور عالمی ادب" میں عبدالمغنی کا تنقیدی نظام

فن تنقید ایک نظام ہے۔ بلکہ نظام فن ہے۔ اس اعتبار سے عبدالمغنی کا تنقیدی نظام ما بعد الطبیعاتی نہیں، جدلیاتی ہے۔ ما بعد الطبیعات اور جدلیات کا فرق و امتیاز ماؤزے تنگ نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"Through*out* the history of human Knowledge, There have been two Conceptions concerning the low of development of the universe, the metaphysical Conception on the dialectical Conception, which form two opposing world out-looks"

[SELECTED READINGS FROM THE WORKS OF MAO TSETUNG PAGE 86]

کائنات کے بارے میں ما بعد الطبیعاتی اور جدلیاتی نقطۂ نظر کے اس تصادم کی ہیئت و کیفیت کو ماؤزے تنگ نے آگے چل کر یوں بیان کیا ہے:

As appose to the metaphysical world out-look, the materialist dialectics hold that in order to under stat, the development of a thing we shows study it internaly and in its relations with other things, in other words, the development of things should be seen as their internal and necessary self development while each thing is in its movement is inter related with and inter acts on the things around it." [SELECTED READINGS FROM WORKS OF MAOTSETUNG. P 87-88]

مجنوں گورکھپوری نے روایت اور بغاوت کے تضاد کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

"ہم کو یہ جدلیاتی نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قوت اپنے اندر ہی اپنی ضد کا مادہ بھی رکھتی ہے، بغاوت کے جراثیم روایت کے اندر ہی موجود ہوتے ہیں، اور روایت کو نہایت صحت بخش بغاوت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔"

(ادب اور زندگی ص ۲۲۹)

عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

"اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فکر و خیال کے ساتھ ساتھ شاعری کی دنیا میں اقبال کے کلام نے کتنا عظیم انقلاب پیدا کر دیا، اس کی طرف شاید کسی کی نگاہ بھی نہیں جاتی، برصغیر آزاد ہو چکا مگر اقبال ابھی تک ایک ایسے خطۂ ارض کے شاعر ہیں جو ذہنی طور پر محکوم ہے۔ سولہویں، سترہویں صدی میں شیکسپیئر محض ایک جزیرے کا شاعر تھا، انیسویں بیسویں صدی میں انگریز قوم جب عالمی طاقت بن گئی تو شیکسپیئر بھی عالمی شاعر ہو گیا۔ قوموں کی یہ حدیں موجودہ بین الاقوامی کہلانے والے دور میں بھی قائم ہیں، اور اقبال کی شاعری کی آفاقی طاقت انہی حدوں میں بند پڑی ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ وقت بہت قریب آگیا ہے جب پوری دنیا کو محسوس کرنے کا موقع ملے گا اور اقبال کی یہ پیشین گوئی ان کے کلام کے بارے میں پوری ہوگی ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے"

(مقدمہ اقبال اور عالمی ادب ص)

اس اقتباس سے عبدالمغنی کے تنقیدی نقطۂ نظر کا علم ہوتا ہے، وہ شاعری کو تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور جب بین الاقوامی سماج حاکم و محکوم قوموں کے درمیان بٹا ہوا ہے تو اسی تناظر تخلیقات کا مطالعہ صحیح نتیجہ برآمد کر سکتا ہے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان تضاد اور تصادم تاریخی عمل ہے، ماؤزے تنگ نے اپنے مضمون "On Contradiction" میں لکھا ہے:

"When Certain Contradictions are present Certain Contradictions arise in the pocess of development of things and more over, the apposites Contained in them are inter dependent and become transformed into one another; other wise none of this would be posible." (page 123)

تضاد کے بارے میں لینن لکھتے ہیں:

The unity (coincidence, identity, equal ac-

tion) of opposition conditional, temporary, relative. The struggle of mutual exclusive."

[V.I. LENIN "on question of dialectic collective works Page 358]

ماؤزے تنگ نے تضاد کے سلسلے میں چین کی ایک کہاوت یوں نقل کی ہے:

"We chinese often Say: Things that appose each other also compliment each other. That is things opposed to each other have identity. This Saying is diabetical and Contrary to metephysics.
(page 125)

عبدالمغنی کے الفاظ میں:۔

"قوموں کی حدیں موجودہ بین الاقوامی کہلانے والے دور میں بھی قائم ہیں۔"

(مقدمہ اقبال اور عالمی ادب صہ)

حاکم و محکوم قوموں کے درمیان یہ حد بندیاں وہی تضادات ہیں، جنھوں نے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کہیں جمہوری اور کہیں اشتراکی نظام کو جنم دیا۔ اقبال ہو چی منہ اور ماؤزے تنگ تینوں کے کلام میں (خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں) برطانوی ملوکیت کے خلاف

آہنگ بغاوت کی شعلہ نوائی ہے۔"

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"ہمارا مرکزی تصور یہ ہے کہ ادب ہو یا فلسفہ وہ دراصل تاریخ ہوتا ہے یعنی وہ زمانہ اور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور زندگی کے تمام اسباب اور حالات سے متاثر ہوتا رہتا ہے، اور جس طرح یہ اسباب اور حالات دور بہ دور بدلتے رہتے ہیں جس طرح انسانی معاشرت بدلتی رہتی ہے، اسی طرح ادب بھی بدلتا رہتا ہے، اور پھر وہ معاشرت کو بدلنے اور بہتر سے بہتر صورت اختیار کرنے میں مدد بھی دیتا ہے۔"

(ادب اور زندگی ص۲۱۶)

عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"ہم آہنگ اور ہم دار فن کی قدر شناسی ایک ہم آہنگ اور ہموار تنقیدی تصور اور عمل سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص۳۲)

ظاہر ہے کہ ہم آہنگ اور ہم دار تنقیدی تصور کے لئے جدلیاتی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے، مابعد الطبیعاتی نگاہ ان کروٹوں کو نہیں دیکھ سکتی اور نہ ان ہلچلوں کو محسوس کر سکتی ہے جو محکوم قوموں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کے لئے لاوے کی طرح پھوٹتی رہتی ہیں، یہی کروٹیں اور ہلچلیں جب شاعری میں پیش کی جاتی ہیں تو آفاقی اپیل بن جاتی ہیں۔

عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"فنون لطیفہ میں شاعری موسیقی سے قریب تر ہے بہ نسبت مصوری کے۔ لہٰذا شاعری کی خصوصیات موسیقی کی طرح کیفیات ہیں نہ کہ

جزئیات جو مصوری کی خصوصیت ہے اور ادب میں مصوری سے قریب تر جو صنف ہے وہ افسانہ ہے، چنانچہ شاعری میں بنیادی طور پر ایک آفاقی اپیل ہوتی ہے جو کچھ جوہری یا عنصری (Essential or elemental) قدروں پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ تعین (Exact-ness) پر۔"

(اقبال اور عالمی ادب ص ۵۶-۳۵۵)

شاعری میں یہ آفاقی اپیل جدلیاتی نقطۂ نظر کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

علیبا مہدی لکھتے ہیں:

جو ادیب یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس جنگ سے بالاتر ہیں اور عام جماعتِ انسانی کیلئے لکھ رہے ہیں، وہ اپنے کو دھوکا دیتے ہیں، اس لئے کہ جب سماج کی بنیاد ہی طبقاتی تقسیم و تفریق پر ہو تو اس میں جماعتِ انسانی جیسی کوئی چیز نہیں اس وقت غیر جانبداری کے صرف یہ معنی ہوں گے کہ جہاں تک عملی اغراض و مقاصد کا تعلق ہے ادیب انقلاب اور ترقی کا حامی نہیں بلکہ تمام سماجی حالات کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتا ہے، جو نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اگر ممکن بھی ہے تو سخت مضر ہے۔"

(بحوالہ "ادب اور زندگی" مضمون، ص ۲۲۲)

عبدالمغنی نے شاعری میں جن "آفاقی اپیل" کی گفتگو کی ہے وہ تضاد (Contradiction) سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ تضاد خواہ اسلام اور کفر کے درمیان ہو یا محمدؐ اور ابوجہل، یا توحید و تثلیث یا حسینؓ اور یزید یا اکبر اور مجدد الف ثانی یا عصر حاضر میں مزدور سرمایہ دار کے مابین — اور اس تضاد میں ادیب، شاعر، فن کار اور اہلِ قلم کو کس طرف ہونا چاہئے۔ عبدالمغنی کے الفاظ میں:

"مسجد قرطبہ جیسی دنیا کی بہترین نظم کوئی ایسا شخص بھی لکھ سکتا تھا جس کے رگ و پے میں ایمان موجزن اور ریشہ ہائے دل میں اسلام پیوست نہ ہو؟ یہ عقیدے کا نہیں فن اور فنِ شاعری کا سوال بنیادی سوال ہے جس سے گریز کرنے والی تنقید، تنقید نہیں، محض کوڑا کرکٹ ہے۔"

"اس محورِ تخلیق میں بندۂ مومن ہی انسانِ کامل ہے، مردِ خدا ہے، اور پوری خدائی پر حاوی ہے۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص ۲۳۱)

"یہ محض ذاتی عقیدے کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ فنکار کے تصورِ حیات اور مطالعۂ [illegible] کا معاملہ ہے جن پر دنیا کے عظیم ترین شاعر کے محرکات، شاعری مبنی ہیں۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص ۲۳۸)

اس عظیم و بسیط، مرکب و منظم، زیبا و رعنا اور دانشمندانہ و خردمندانہ شاعری کی تنقید صرف اس قول سے کی جا سکتی ہے:

"ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا" (شعر سے حکمت ٹپکتی ہے اور بیان سے جادو جاگتا

اہنامہ [illegible]
نوازتا ہے۔

"لا الٰہ الا اللہ کے انقلابی تصورِ توحید سے نا واقف ہے، نہ الیٹ، اس لئے کہ دونوں تثلیث کے فرزند ہیں۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص ۲۰۵)

گویا تنقید ہو یا شاعری عقیدے کے بغیر ممکن نہیں، اور یہی عقیدہ شاعری یا تنقید نگاری میں نظام و ترتیب پیدا کرتا ہے۔

کامریڈ ماؤزے تنگ نے اسی نکتہ کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں عالمی کانگریس میں اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے:

"we must learn to take to the masses, not in the language of books formulas but in the languge of fighter for the Cause of masses, whose every word, whose every idea reflects the movement thoughts and sentiments of millions

("SELECTED READINGS FROM THE WORKS OF MAOTSETUNG" P.245)

انقلابی تصورِ توحید کی بات ہو یا محنت کش طبقے کی آمریت (Dictatorship of (proletariat) کی گفتگو، منضبط نظریاتی نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ جب شاعری کے لئے نظریہ، عقیدے اور نظام کی ضرورت ہے تو تنقید کے لئے بھی نظریہ، عقیدہ اور نظام لازمی شرط ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے اسی نکتے کو اس طرح بیان کیا ہے:

"کوئی ادیب یا ادبی کارنامہ ایسا نہیں جس کا کوئی ادبی مرتبہ مسلم ہوا ہو اور جو کسی خاص اجتماعی ذہنیت کا نتیجہ نہ ہو۔ ادب اور سماج لازم و ملزوم ہیں۔ سماج ایک نامیاتی قوت ہے اور ادب اس کی علامت بھی ہے اور اس کا محرک بھی۔"

("ادب اور زندگی" ص ۲۱۵)

عبدالمغنی کا تنقیدی نظام ان کے اپنے نظریہ کا آئینہ دار ہے، ان کا نظریۂ فن اور نظریۂ حیات اسلامی ہے، اور اسلام خود کفر کے مقابلے میں جدلیاتی نظام ہے، یہی وجہ ہے کہ عبدالمغنی کا تنقیدی نظام ما بعد الطبیعاتی نہیں، جدلیاتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"خیر و شر اور حق و باطل کی رزم آرائی اور اس میں خیر اور [illegible] کے ہاتھوں شر اور باطل کے خلاف مسلسل جہاد ہی کے علمبردار اقبال بھی ہیں، یہی وہ [illegible] اور [illegible] حالی جدلیات ہے جس پر دنیا کی ہر نظریاتی کشمکش مبنی ہے اور جس کے نتیجہ میں تاریخ کے انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں اور ارتقائے حیات کا سامان بھی ہوا ہے جس سے گریز کھلی

شکست اور مسائلِ حیات سے فرار ہے۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص۲۸۵)

عبد المغنی کو زندگی سے پیار ہے، وہ زندگی کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مغربی اور مغرب زدہ ناقدوں کی طرح تنقید کو زندگی سے علاحدہ معلق کر کے محض لفظی موشگافیوں کی تاریکی میں بند نہیں رکھا، بلکہ زندگی، ادب اور تنقید کے درمیان اس پھیلے اور غیر منقسم رشتے کو مضبوط کرنے کی کامیاب کوشش کی، جسے اردو کے بورژوا اور ظلمت پرست ناقدین نے گمراہی کی خاک میں دفن کر دیا تھا، مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

"فن کاری ایک پیچیدہ، جدلیاتی تخلیقی عمل کے ذریعہ داخلی یا خارجی حقیقت کو نیا جنم دیتی ہے۔"

("ادب اور زندگی" ص۱۲۵)

اسی طرح تنقید بھی ایک پیچیدہ جدلیاتی نظام فن ہے۔ تنقید کے اس فرضِ منصبی سے وہی ناقد کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو زندگی کے بارے میں انقلابی نقطۂ نظر کا حامل ہو۔ اقبال کی طرح عبد المغنی بھی اس سے متفق ہیں:

"عہدِ حاضر کا پورا سرمایہ دارانہ نظام ایک ابلیسی نظام ہے جو شیطانی قوتوں ہی کے بل پر قائم و جاری ہے۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص۴۳۶)

تنقید بھی حق و باطل کی کشمکش ہے اور فن کاری بھی، اس کشمکش اور پیکار میں عبد المغنی حق طرف ہیں،

یہ انکی تنقیدی حق پرستی ہی ہے کہ انھوں نے اقبال کے شاعرانہ رموز و نکات کو اس قدر دلیرانہ انداز میں پیش کیا کہ برطانوی ملوکیت کے ہاتھوں بکے ہوئے قلم کی باطل پرستی فاش ہو گئی، تنقید حق کی علمبرداری اور باطل کی مخالفت ہے، جس حق پرستی کے ساتھ انھوں نے کلامِ اقبال کے انقلابی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، وہ اقبال کے باطل پرست ناقدوں کے بس میں نہ تھا:

"حق کے لیے سرفروشی ایک تاریخی مثال، اور عظیم الشان نمونہ حضرت امام حسین کا ہے، جو اقبال کے سب سے بڑے علامتی شاہین ہیں، اور انکی شخصیت کو شاعر نے مجاہدِ حق کا ایک مستقل استعارہ بنا دیا ہے
ع "حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری"

(اقبال اور عالمی ادب ص۳۸۹)

اسی نقطۂ نظر اور پیکارِ حق و باطل کی کرشمہ سازیوں اور صداقت آفرینیوں کو ماوزے تنگ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

If anyone opposes the Communist party and the people and keeps moving down the path of reaction we will firmly oppose him. As for the masses of the people, their toil and their struggle their army

کی فضا نئے سرے سے تکلیم و تخلیل کا متقاضی ہے۔"
("اقبال اور عالمی ادب" صفحہ ۲۳۱)
اوزے تنگ لکھتے ہیں:

"Our writers an[illegible] artists who Come from ranks of intellectuals love proletariat become Society has made them feel that they and the proletariat Share a Common fate." (Page 277)

وہاں مسجد قرطبہ کے والہانہ عشق کا اظہار ہے، یہاں محنت
کشوں کے "سرچشمہ" کی نوعیت بدل سکتی ہے،
لیکن "الہام" کے بغیر تخلیقِ فن ناممکن ہے۔ عبدالمغنی کی
تنقید نگاری کا یہی تلازم فن ہے، وہ ترتیب و تزئین کے
ساتھ تنقیدی عمل جاری رکھتے ہیں، اس کی خاص وجہ
یہ ہے کہ ان کے ذہن میں کہیں الجھاؤ، بھٹکاؤ، بے راہ روی
اور گمراہی نہیں، عقیدے کی پختگی، فنی نظریے کی سلامت
روی اور تحریر و نگارش کی سیدھی راہ متعین ہے۔

عبدالمغنی کی تصنیف "اقبال اور عالمی ادب" مطالعہ
اقبال کے سلسلہ میں فکر و ذہن اور عقل و دانش کے لئے نئے
افق کھولے اور پر مغز دروازے کھولتی ہے، وہ روایت میں
حسن و زیبائش اور ترتیب و تزئین کے متلاشی ہیں،
اقبال کی غزلوں میں جو فکر انگیزی ہے، وہ تغزل کی
تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے، اقبال کی فکر
نے غزل کی تمام تنگ دامانیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا،
غزل کے تقاضے میں عبدالمغنی نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت
ان الفاظ میں کی ہے:

"اچھی غزل صرف مسلسل غزل ہی نہیں ہوتی،
غیر مسلسل بھی ہو سکتی ہے۔ غزل کے منتشر اشعار
کو ریزہ خیالی اور پراگندگی قرار دینا
صریحاً زیادتی ہے اور حسنِ لطیف کا فقدان
نیز ادبی شعور کی مفلسی ہے۔ غزل، غزل ہے
نظم نہیں، اور تغزل کو تنظیم کا پابند کرنے کی
کوشش نسیم صبا کے جھونکوں کو پابہ زنجیر
کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔"
("اقبال اور عالمی ادب" صفحہ ۲۱۳)

یہ عبدالمغنی کا تنقیدی کمال ہے، اور انکی منطق
فکر ہی ہے جس نے غزل کے معنی و مطالب کو تابناکی
عطا کی ہے:

"کہا جا سکتا ہے کہ تغزل کے تمام محاسن کے
باوصف یہ 'ورائے غزل' چیزے دیگر است"
بھی ہے، اس لئے اس کے تاثرات محض فرد و
شاعر ہی تک محدود نہیں رہے، ان سے ایک
پوری تہذیب کو نئی زندگی ملی، اور ایک نئے تمدن کو
نئی گرمی ملی، اور اس کا درخشاں عکس ان کے
مشرق کی نشاۃ الثانیہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔"
("اقبال اور عالمی ادب" صفحہ [illegible])

نئی زندگی، نئی گرمی، مشرق کی نشاۃ الثانیہ کا یہی
تصور لمحاوزے تنگ نے اپنے نقطۂ نظر سے یوں
پیش کیا ہے:

"In the world of today [illegible]

قرآن کی روشنی میں

اصغر علی انجینئر

سورۃ آل عمران میں ۷۸ سے ۸۰ تک کی
آیتوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنَّ مِنْهُمْ
لَفَرِيقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ
مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ
هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ
مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ
تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ
وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۗ اَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ
اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۚ

ان آیتوں کے لفظی معنی حسب ذیل ہیں!

اور ان (اہل کتاب) میں بعض ایسے ہیں کہ
کتاب (توریت) کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں
تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب میں سے
ہے حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا اور کہتے
ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے (نازل ہوا) ہے حالانکہ
وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ خدا پر جھوٹ
بولتے ہیں اور (یہ بات) جانتے بھی ہیں۔ کسی آدمی کو
شایان نہیں کہ خدا تو اسے کتاب اور عقل سلیم (بعض
لوگ اس کے معنی حکومت کے بھی کرتے ہیں) اور ن

پیغمبری عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔ بلکہ (اس کو یہ کہنا سزاوار ہے کہ اے اہل کتاب) تم (علماء) ربانی ہو جاؤ کیونکہ تم کتاب (خدا) پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔ اور اسکو یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنالو۔ بھلا جب تم مسلمان ہو چکے ہو تو کیا اسے زیبا ہے کہ تمہیں کافر ہونے کو کہے۔

بظاہر یہ سیدھے سادے الفاظ ہیں لیکن سمجھنے والوں کے لئے ان میں معنی وحکمت کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ بظاہر اور متن اور سیاق کے اعتبار سے یہ خطاب یہودی علماء سے ہے لیکن ہر دور میں اور ہر قسم کے علماء اور غیر علماء پر ان بیش بہا آیتوں کا مفہوم صادق آتا ہے۔

ہم عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ اسلام مذہب فطرت ہے اور پھر اس مذہب فطرت میں ہم ہر طرح کے اوہام اور مافوق عادات اور دور وسطیٰ کے غیر فطری نظریات کو بھی شامل کر لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے ارتقاء میں حائل ہوتے ہیں اور انسان کو طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اسے غیر متوازن بنا کر عدل وانصاف کے تقاضوں سے دور کر دیتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فطری مذہب سے ہماری کیا مراد ہے؟ عام طور پر یہ الفاظ دہرائے تو جاتے ہیں لیکن ان کی کماحقہٗ وضاحت نہیں کی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے مراد مذہب کا قوانین فطرت کے مطابق ہونا ہے۔ اور پھر قوانین فطرت کا تصور ہم علم وسطیٰ کے تصورات اور تعلیمات کے مطابق قائم کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی تفاسیر میں قدیم اسرائیلیات اور عہد وسطیٰ کے فلسفیانہ اور طبیعیاتی نظریات اسطرح شامل ہو گئے گویا وہ قرآن مجید کا ہی ایک حصہ ہوں اور ان کی مخالفت قرآن مجید کی مخالفت قرار پائی

دراصل قوانین فطرت یا اخلاقی تقاضوں یا مذہبی تصورات کو کسی زمانی یا مکانی قیود میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سلیم اور حکمت کے خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔ اور چند حدود کا پابند کر کے اسے عقل سلیم استعمال کرنے کی مکمل آزادی دی ہے اللہ تعالیٰ خود تو احسن الخالقین ہے لیکن اپنی مخلوق انسان کو بھی خلاقانہ قوت عطا کی ہے ان خلاقانہ قوت اور عقل سلیم استعمال کر کے ہی انسان فطری قوانین کی جس میں طبعیاتی اور مابعد طبیعیاتی قوانین شامل ہیں، وسعتوں کو اپنے دور کی حقیقتوں اور علمی ترقیوں کی روشنی میں تلاش کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فطری قوانین کا تصور جامد نہیں حرکی ہے۔

زندگی کی وسعتوں اور افلاک کی پہنائیوں کو ایک دور میں ناپا نہیں جاسکتا۔ عدل وانصاف کے تقاضے اور اخلاقی مطالبے بھی علوم کی ترقیوں اور فطری قوانین کے دریافت شدہ نئے پہلوؤں سے اور بدلتی ہوئی سماجی ساخت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لئے فطری مذہب وہی

کہلائے گا۔ علوم کی نئی دریافت شدہ حقیقتوں اور زندگی کی وسعتوں کا جو منزل بہ منزل ہم پر وا ہوتی ہیں ساتھ دے سکے۔ کسی ایک دور کی سچائیوں میں مقید رہنے والے اوہام پرست مذہب کو مذہب فطرت کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے کچھ ایسا ہی سمجھ لیا ہے۔

اب ہم مندرجہ بالا آیتوں کے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چند اہل کتاب اپنی زبان کو مروڑ مروڑ کر اسطرح پڑھتے ہیں کہ عام آدمی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا یہ سب کچھ کتاب میں موجود ہے اور گویا یہ سب عند اللہ ہے حالانکہ نہ وہ کتاب میں ہوتا ہے نہ اللہ کی جانب سے۔ یہاں زبان مروڑ کر پڑھنا یَلْوُنَ اَلْسِنَتَھُمْ بڑا بلیغ لفظ ہے۔ اس کے لفظی معنی بھی مراد ہیں اور لفظی معنی سے پرے مفہوم بھی اس قسم کے علماء کتاب کے متن کو ہمارے سامنے اپنی زبان سے اسطرح ادا کرتے ہیں (زبان کو مروڑنا ـــ حرکت دینا، الفاظ کو جیسے تیسے ادا کرنا) کہ ہم ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور اسے عند اللہ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ ہرگز ہرگز عند اللہ نہیں ہوتا۔ یہ علماء محض کتاب کے متن کو جیسے تیسے پڑھکر اپنا مفاد یا اپنے اوہام اور اپنی کم علمی ہم پر اللہ کے نام پر لادنا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ اور وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اللہ کے نام پر جھوٹ بول رہے ہیں۔

یہ علماء اپنے مفاد اور کم علمی یا دونوں یا دونوں میں سے ایک ہم کو ہم پر لاد کر ہمیں اپنا بندہ اور عقلی معاملوں میں غلام بنا لینا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ تو علماء یہ حق دراصل اس انسان کو بھی نہیں پہنچتا جسے اللہ تعالیٰ نے کتاب حِکْمَۃ یا حکومت اور نبوت سے نوازا ہے۔ ایسا شخص بھی انسانوں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم میرے بندے بن جاؤ (کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ) چہ جائیکہ معمولی علماء۔ وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ تم اللہ والے یا رب کے منشاء کے مطابق بن جاؤ (کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ) اور یہاں ربانی کا لفظ بھی بڑا بلیغ ہے۔ رب کے مفہوم میں مرحلہ بہ مرحلہ ارتقاء شامل ہے۔ دراصل (رَبَّانِیّٖنَ) ان کو کہیں گے جو ارتقاء کے مراحل یوں طے کرتے رہتے ہیں کہ رب کا منشاء بھی پورا ہوتا ہے اور زندگی ترقی پذیر بھی رہتی ہے۔

دراصل کتاب اور حکم من اللہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو ہر قسم کی غلامی ـــ طبعی اور عقلی ـــ سے آزاد کیا جائے اور اس کی قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں [illegible] کار [illegible] ربانی [illegible] کی طرف گامزن [illegible] جائے۔ ظاہر ہے [illegible] اور روشن خیالی کی عدم موجودگی اس ارتقاء کے سلسلہ کو روک دیتی ہے۔ قرآن مجید کی ان [illegible] بالا آیتوں کا واحد منشاء یہی ہے کہ انسانیت کو نام نہاد علماء کی عقلی غلامی سے نجات دلائی جائے چاہے یہ علماء یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مسلمان ـــ

قرآن مجید روشن خیالی اور ارتقاء کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ ملائکۃ اور انبیاء کی غلامی کی بھی مکمل نفی کرتا ہے۔ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا تمہیں اس بات کا بھی حکم نہیں دیا جاتا کہ فرشتوں اور انبیاء کو بھی ارباب تسلیم کیا جائے [illegible]

اسلم کاویانی یمبئی

خلیل جبران نے کہا ہے "جو شخص نیکی اور بدی کے درمیان حدِ فاصل پر انگلی رکھ سکتا ہے وہ دراصل ردائے الٰہی کے دامن کو چھو سکتا ہے۔"

شاید انسانی زندگی میں استاذ ہی کا منصب ایسا ہے جو اس تعریف کے شایاں ہے۔ غور کیجے تو تمیز نیک و بد کو علم انسانی کی ابتدا اور خوب سے خوب تر کی جستجو کو اس کا منتہا پائیے گا۔ چوں کہ طبع انسانی کو کسی مقام و منزل پر رکنا گوارا نہیں، اس لئے علم کی کوئی انتہا نہیں اور یہیں علم آشنا کرانے والی عظیم المرتبت ہستی استاد کی ہوتی ہے۔

اس تمہید سے دراصل آج مجھے اپنے استادِ محترم جالب مظاہری صاحب کا کچھ اپنی آنکھوں دیکھا، کچھ دوسروں کی زبانی سنا اور کچھ اپنے طور پر برتا سمجھا ہوا احوال آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

مدیر گلگت "شمس کنول صاحب نے ایک بار جالب صاحب کے بارے میں لکھا تھا "سہسرام کی دو چیزیں مشہور ہیں ایک شیر شاہ سوری کا مقبرہ اور جالب مظاہری"۔ جالب صاحب وہی سہسرام (صوبہ بہار) میں ۹ اگست ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں ان کی بسم اللہ خوانی وہاں [illegible]

کے دستِ مبارک سے ادا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سہسرام مدرسہ خیریہ نظامیہ کی رہینِ منت ہے جہاں انھوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی مروجہ درسی کتابیں ختم کیں۔ اپنے اس دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کبھی کبھی کہا کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچپن میں بڑے شرارتی تھے اور بڑے بہن سے شوخیاں کرتے تھے۔ اُن کے اساتذہ جس قدر انکی ذہانت کے معترف تھے اسی قدر انکی شرارتوں اور شوخیوں سے نالاں۔ اسی بنا پر سب انھیں طوفان کہا کرتے تھے۔

مدرسہ خیریہ نظامیہ کے بعد انھوں نے سہارنپور (یوپی) کے مدرسہ نظامیہ مظاہر العلوم میں عربی ادب، معقولات، منقولات، فقہ، تفسیر اور حدیث کی تعلیم کی تکمیل کی۔ اور یہیں کی مناسبت سے وہ مظاہری کہلانے۔ تحصیلِ علم ہی کے زمانے میں انکی شادی ہو گئی تھی۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں وہ بمبئی وارد ہوئے۔ مشہور ماہرِ تعلیم اے۔ آر داؤد صاحب پرنسپل انجمن خیرالاسلام ہائی اسکول نے انھیں ابتدائی جماعتوں کی تدریس کے لئے مامور کر دیا۔ وہ اس منصب کے اہل اور اس منصب کے شایاں نکلے۔ ان کی سادہ مزاجی، اپنے فرض سے شیفتگی، [illegible]

کرنے کی صلاحیت اور والہانہ محنت سے داؤد صاحب
ان کے گرویدہ ہو گئے اور ایک واقعے نے تو انکی نظر میں
جالب صاحب کا اعتبار و اعتماد اور بڑھا دیا۔ ہوا یہ کہ
ایک دن جالب صاحب پرنسپل موصوف کے آفس میں گئے۔
اس وقت اُن کے بشرے سے الجھن اور پریشانی کا اظہار
ہو رہا تھا اور وہ گومگو کے عالم میں نظر آ رہے تھے۔ پرنسپل
داؤد صاحب کے استفسار پر کچھ پس و پیش کے بعد جالب
صاحب نے کہا کہ انہیں اُس دن جو سبق پڑھانا ہے اس
کی تمہید نہیں سوجھ رہی ہے اور وہ دقت محسوس کر رہے
ہیں کہ کلاس میں سبق کا تعارف کس طرح کرائیں۔ پرنسپل صاحب
حیرت کے عالم میں اُن کا مُنھ تکنے لگے۔ ادھر جالب صاحب
اس خیال سے مضطرب ہو گئے کہ مبادا داؤد صاحب انکے
اعترافِ لاچاری کو انکی نااہلیت پر محمول کرتے ہوئے
انھیں ملازمت سے برخاست نہ کر دیں۔ لیکن چند ہی سکنڈ
بعد داؤد صاحب نے یہ کہکر انھیں حیرت میں ڈال دیا کہ
جالب صاحب! آج تک میرے عہدے کے طویل زمانے
میں آپ وہ پہلے ٹیچر ہیں جو اپنی تدریسی مشکل حل کرنے
میرے پاس آئے ہیں۔ آج تک کسی موضوع کے کسی ٹیچر نے
اپنی کوئی اس طرح کی مشکل میرے سامنے پیش نہیں کی۔
یہ بات نہیں کہ کوئی تدریسی دقت انھیں پیش ہی نہ آئی
ہوگی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دقت پیش کرنے
میں شرم و سبکی محسوس کی ہوگی۔ یاد رکھئے جالب صاحب
جس کسی نے استفسار و استفہام سے خفت و ذلت
محسوس کی وہ کبھی نہ اپنی کمی کو پورا کر سکا اور نہ اپنی
کمزوری کو دُور کر پایا۔ جالب صاحب نے ایک تجربہ کار
ماہرِ تعلیم اور کامل فن ناصحِ مشفق کی اس نصیحت کو بقول
شاعر کے نصیحت گفت بشنو و بہانہ مگیر
ہر آنچہ ناصحِ مشفق بگویدت بپذیر
ہمیشہ کے لئے ذہن گرہ میں باندھ لیا۔ پرنسپل موصوف نے نہ
صرف اُس دن اُن کی دشواری دُور کی بلکہ آئندہ بھی
وہ انکی راہ نمائی کرتے رہے۔ اور کچھ ہی دنوں بعد اُن کی
مثالی صلاحیتوں کے پیش نظر ایس۔ سی جماعت
تک کی اُردو اور فارسی کی تعلیم انھیں تفویض کر دی۔ جالب
صاحب نہ صرف داؤد صاحب کے اعتماد پر پورے اُترے
بلکہ انھوں نے اپنی تعلیمی صلاحیت اور تدریسی اہلیت
کا لوہا اُن سے منوا لیا۔ وہ اس طرح کہ ایس ایس
سی بورڈ کے امتحان میں اُن کے طلبہ اُردو میں سات
مرتبہ اور فارسی میں پانچ مرتبہ مہاراشٹر بھر میں اوّل آئے۔
اور گولڈ مڈل لائے۔ استادِ محترم کی یہ وہ عظیم الشان
کامیابی ہے جو ہندوستان کے کسی ہائی اسکول کے
کسی اُردو یا فارسی کے ٹیچر کو شاید ہی نصیب ہوئی ہوگی

ے ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

جالب صاحب کی پہلی اہلیہ سے اولادِ نرینہ
میں ایک لڑکا اور اولادِ اناث میں تین لڑکیاں موجود
ہیں۔ افسوس کہ وہ بائیس ۲۲ برس کی رفاقت کے بعد
انھیں داغِ جدائی دے گئیں اور انکی جمعیتِ خاطر
کا شیرازہ بکھر گیا۔ کوئی دو ۲ سال کے تعطل کے بعد
بچوں کی پرورش کے مسئلے کے پیش نظر محترم داؤد
صاحب کی کوشش سے اُن کے دوست پرنسپل عبد
السبحان صاحب (آنریری مجسٹریٹ دیولالی) کی
بڑی صاحبزادی ممتاز بیگم سے ان کا نکاح ثانی ہوا۔
اس سلیقہ شعار اور غمگسار نے جالب صاحب کی جمعیتِ
خاطر اور بچوں کی نگہبانی اس طرح کی کہ ان سب کے

میں بھی تیرا ہوں ایک آئینہ
[illegible] دیکھا کیا ہے

تب [illegible] قباحتوں (حشو و حشوِ قبیح) کی گرد سے آئینہ پاک ہو جاتا ہے۔ اصغر صاحب سامعین سے تحسینی داد کے بجائے میں جالب صاحب سے بھی داد خواہی کے متوقع تھے۔ لیکن یہ بلند و بلیغ تنقید سن کر دم بخود رہ گئے جس نے علامہ نیاز کے پُراسرار رویّے کو بھی حل کر دیا۔

اور اصحابِ علم کی طرح جالب صاحب بھی فطری طور پر تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کا کتابی صورت میں اشاعت کا سلسلہ ۱۹۵۵ء سے شروع ہوا، جب ان کی پہلی تالیف "رموزِ نظم" شائع ہوئی۔ یوں تو اردو زبان میں علم عروض، صنائع بدائع اور اصنافِ شاعری پر سیر حاصل اور ضخیم کتابوں کی کوئی کمی نہ تھی، مگر ایک ایسی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت تھی، جو طلبہ کے معیار کی حامل ہو اور جملہ اصنافِ سخن، محاسنِ شاعری علم عروض، اور اقسام ہائے نظم کا مکمل تعارف بھی کراتی ہو۔ منجملہ ان خوبیوں کے حامل ہونے کے "رموزِ نظم" کی افادیت و دلچسپی میں عام فہم اندازِ بیان اور افہام و تفہیم کے لئے دلکش و معیاری انتخابِ کلام نے بھی اضافہ کیا۔ ۱۹۶۲ء میں اردو میں فارسی قواعد پر ان کی مبسوط اور مفصل تالیف "ممتاز القواعد" منصۂ شہود پر آئی جو دسویں جماعت سے کالج تک کے فارسی کے طلبہ کی ضروریات کا کما حقہ احصا کرتی ہے۔ اور جس کا مقدمہ خانۂ فرہنگی ایران کے فاضل (ڈائرکٹر) ڈاکٹر احمد [illegible]

اس کے اگلے سال ۱۹۶۳ء میں جالب صاحب نے "نگارشِ شبلی" لکھی۔ اس کتاب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے انھوں نے پیش لفظ میں تحریر فرمایا ہے:

"شبلی کے تبحرِ علمی پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے ان کے جامع کمالات ہونے کا پتہ چلتا ہے مگر ان کی شخصیت کے اس پہلو کو کہ وہ ایک زندہ دل انسان تھے بہت کم اجاگر کیا گیا ہے۔ میں نے اس تالیف میں شبلی کی تحریروں میں سے جو جواہر ریزے جمع کئے ہیں ان کے مطالعے کے بعد شبلی کی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے اور ان کی زندگی کچھ اور درخشندہ اور پرکشش نظر آنے لگتی ہے۔"

۱۹۶۸ء میں انھوں نے اپنے ستائیس سالہ تدریسی تجربے کے پیشِ نظر طلبہ کی زبان سے رونما ہونے والی تلفظ کی عام غلطیوں کے سدِّباب کے لئے "اصلاحِ تلفظ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا ایک اہم حصّہ "اختلافِ اعراب" سے پیدا ہونے والے معنوی فرق پر مبنی ہے۔ اسی تالیف کے ضمن میں انھوں نے کبھی کسی روزنامے "انقلاب" کے صفحات پر کم سواد کم نظر آغا خلش کاشمیری کے خلاف بعض تلامذہ کے اصرار پر قلم اٹھایا جس نے لایعنی اعتراضات کے سہارے سستی شہرت پانے کی کوشش کی تھی اور بالآخر اسے منہ کی کھانی پڑی۔ ۱۹۷۴ء میں راقم کے اصرار پر انھوں نے اپنی دیرینہ آرزو یعنی "محاوراتِ فصیح الملک" کی تالیف کا سلسلہ شروع کیا، لیکن افسوس کہ ایک بڑا حصّہ لکھنے کے بعد داغ کے آخری دیوان "یادگارِ داغ" کے دستیاب نہ ہونے کے سبب یہ آرزو تشنۂ تکمیل ہی رہی۔ [illegible]

کا ”اصلی مطالعۂ قاموس الادب“ کے عنوان سے تحریر کر دیا کہ یہ کتاب نہ صرف اُن کے قلمی سرمائے میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ اُس سے گلستانِ اُردو بھی مدّتِ مدید تک مہکتا رہے گا۔ نکتہ رس قارئین دیکھیں گے کہ حضرت جالب نے پنڈت کیفی کے کام کو کس خوش اسلوبی سے ترقی دی ہے اور ”کیفیہ“ کے تکملے کی جستجو میں ایک ایسی لازوال تالیف بہم پہنچا دی ہے کہ ”کیفیہ“ کو جس کا دیباچہ کہلانے میں نازش و افتخار حاصل ہو۔ انکی یہ بیش بہا تالیف بہار اسٹیٹ اُردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہے۔ اِن کتابوں کے علاوہ کافی تعداد ایسے مضامین کی ہے جو انھوں نے مقتدر رسائل میں مختلف عنوانات پر سپردِ قلم فرمائے ہیں۔

اُن کی شاعری کا ذکر کرنا عمرِ رفتہ کو آواز دینے ہے۔ کیوں کہ اب انھیں شعر و شاعری سے لگاؤ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہر کیف انکی شاعری مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام کی دین ہے، جہاں کی شعری نشستوں میں وہ شرکت فرمایا کرتے تھے اور اپنے کلام پر فخر الشعرا شیدا سہسرامی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد میں نوح ناروی اور شفق عماد پوری سے بھی فیض حاصل کیا اور آخر میں یہ سلسلہ سیماب اکبرآبادی پر ختم ہو گیا۔

ایک زمانے میں وہ حضرتِ سیماب کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ جب ۱۹۴۲ء میں حضرتِ سیماب کی نظم ”موحدِ اعظم“ کے خلاف سارے ہندوستان میں مخالفت کا طوفان بپا ہو گیا تھا۔ اور مفتی راندیر مہدی حسن صاحب نے اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر کے اخبار ”مدینہ“ وغیرہ میں اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو حضرت سیماب کے تلامذہ کی فوج میں وہ جالب صاحب ہی تھے، جنھوں نے رسالہ ”شاعر“ آگرہ میں ”موحدِ اعظم اور مفتی اعظم“ کے عنوان سے ایک سال تک نظم سے متعلق اعتراضات کا علمی، ادبی اور شرعی اعتبار سے مدلّل اور مسکت جواب لکھ کر معترضین کو ہر محاذ پر پسپا کیا، لیکن ایک ایسا دور بھی آیا جب انھوں نے خود کو اُن کا مرتد شاگرد کہا اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے اساتذہ میں سوائے شفق عماد پوری کے کسی کی اصلاح سے مطمئن نہیں ہوئے۔

اُنھوں نے بمبئی میں سینکڑوں مشاعرے پڑھے اور نامور گرامی شعرا سے اُن کی مجالست رہی لیکن اب برسوں سے شعر و شاعری سے تائب اور مشاعروں کی شرکت سے مجتنب ہو گئے ہیں۔ دراصل موجودہ رنگِ زمانہ سے اُن کی طبیعت میل نہیں کھاتی اور شعر و ادب کے روایتی اور جامد تصوّرات سے ترک و تجرید اور قدمائے ادب کی پیروی سے گریز انھیں گوارا نہیں ہے۔ وہ اخلاق آفریں اور زندگی آموز حقائق بیان کرنے کے قائل ہیں۔ اُن کا شعری سرمایہ دستیاب نہ ہو سکنے کے سبب تفصیلی گفتگو ممکن نہیں لیکن انتخابِ کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا کلام اساتذہ کے اسلوبِ سخن اور پیرایۂ بیان سے متاثر اور اُردو کی قدیم شعری روایات و ردیہ کا پابند ہے۔ زبان و روزمرّے کی کسوٹی پر کھرا اور عروض و فن کی تول میں پکّا ہے۔ البتہ موضوعات میں تنوّع اور لب و لہجے میں تازگی اور طرفگی کم پائی جاتی ہے، اگرچہ انکی شاعری خود اُن کی نظر میں سرمایۂ ناز نہیں ہیں پھر بھی اشعار کی خاصی تعداد ایسی ہے جو زبان و بیان ہر دو اعتبار سے کلاسیکی ادبی درجے کے لذت چشیدگان کے ذوق کی آسودگی کا سامان بہم پہنچا سکتی ہے۔ یہاں

چند اشعار بلا تبصرہ نقل کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین خود فیصلہ کرلیں ؎

میرے ہی دم سے رونقِ بازارِ عشق تھی
اس کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

دل اپنا کسی پر کیا ٹھہرے اپنا سا کوئی ملتا ہی نہیں
کچھ تجربے ہی ایسے ہیں ہوئے کہ آس سبھی سے ٹوٹ گئی
اب صبحِ شبِ غم ہوتی ہے مایوس نہ ہو تو اے جالب
وہ دیکھ کہ تارے ڈوب گئے وہ دیکھ کر پو بھی پھوٹ گئی

دہن غنچہ، رخسار گل، آنکھ نرگس
چمن ہے الٰہی کہ صورت کسی کی
مرے ضبطِ غم کا یہی مدعا ہے
زباں پر نہ آئے شکایت کسی کی
جوانی نے بھر دی ہے رگ رگ میں شوخی
بڑی چلبلی ہے طبیعت کسی کی
خدا کا ہمیں خوف آتا ہے ورنہ
پرستش کے لائق ہے صورت کسی کی

بدل گیا مطمحِ نظر ہی نئے زمانے میں آدمی کا
نہ بھول وعدے پہ تو کسی کے نہیں بھروسا اب کسی کا
نہ وہ محبت، نہ وہ مودت، نہ وہ مروت رہی کسی میں
بدل دیا ہے ضمیر بالکل نئے زمانے نے آدمی کا
نہ پائیداری ہے دوستی میں نہ استواری ہے دشمنی میں
مزا نہیں کچھ بھی دوستی کا، گلہ نہیں کچھ بھی دشمنی کا

زیبا نہیں ہے آپکو مجھ سے یہ بدظنی ۔ اچھوں کو ہونا چاہیے اچھے خیال کا

مر کے بھی ہو سکا نہ لیلیٰ تک مقدر دیکھیے
رہ گیا تھک کر غبارِ قیس محمل کے قریب

یہاں تو ہر اک لمحہ مری حیات کا ایک عذاب میں ہے
مرا کوئی ہم نوا کبھی یارب ترے جہانِ خراب میں ہے

انھی کے کلام کے ضمن میں اُن کی اُردو اور فارسی کی ایک ایک مکمل غزل ملاحظہ فرمایئے تاکہ اُن کے رنگِ سخن کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے ؎

موت ہے وہ زندگی کہ جو عشق کی زندگی نہ ہو
دیکھ نقوشِ حسن سے دامنِ دل تہی نہ ہو
دیکھ تو لے نشانِ حق، قلب کی روشنی نہ ہو
شعلۂ طور، قصۂ سرخیِ موسوی نہ ہو
مری نظر نہ توڑ دے شیشۂ مہر و ماہ کو
تیرے نظامِ دہر کو خطرۂ برہمی نہ ہو
تو مرا آئینہ ہوا، میں ترا آئینہ بنا
میری شکستگی کہیں تیری شکستگی نہ ہو
رازِ حیات کا ملا، ذوقِ تلاش ہی میں ہے
منفعلِ سکوں کوئی لمحۂ زندگی نہ ہو

ساقیِ گل عذار ہیں موسمِ نوبہار را
شہد بکن ز جامِ مے تلخیِ روزگار را
من ز ہجومِ وصل تو نعمتِ اضطرابِ دل
قطع مکن تسلسلِ لذتِ انتظار را
طبع غیور ست اگر محتاجی بیش کس مبر
بارہا آزمودہ ام ہمتِ روزگار را
حفظِ خودی گر آشنا حرمتِ خویش باختی
تو نہ مگر شناختی، گوہرِ تابدار را

ہاتھ سہیل، گیا

جائے کہ جالبِ حزیں شاعرِ مشرق[1] رفت
سرمۂ چشم خود کنم ذرۂ ایں دیار را

بہر حال جب ہم ایک معلم کی حیثیت سے انکی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو کہ ان کی حقیقی حیثیت ہے تو وہ اتنے قد آور نظر آتے ہیں کہ اُن کی شاعر و ادیب کی شخصیت ضمناً نظر آنے لگتی ہے۔

اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول میں جالب صاحب نے جس جاں فشانی، تن دہی، لگن اور اخلاص سے اپنے فرائض کی انجام دہی کی اور یہاں کے طلبہ میں جو علم کی جوت جلائی، انکی طبیعت میں ادب کا جو ذوق رچایا اسلوب کے اخلاص و کردار کی تعمیر میں جو ہنر آزمایا اور اس ہائی اسکول کو جس مرتبہ و مقام پر پہونچایا وہ نہ صرف اس درسگاہ کی تاریخ بلکہ بمبئی کی تاریخِ تعلیمات میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

پچھلے صفحات میں اُن کے طلبہ کو ایس ایس سی میں اُردو اور فارسی میں بارہ مرتبہ گولڈ میڈل ملنے کا ذکر آچکا ہے۔ جالب صاحب کے زمانۂ معلمی کا یہ کارنامہ بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان کے طلبہ پندرہ پندرہ ہائی اسکولوں سے اُردو تقریری مقابلے میں مسلسل پانچ مرتبہ جناح ٹرافی جیت کر لائے۔ حتیٰ کہ جناح ٹرافی پر تقریری مقابلے کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور جناح ٹرافی اسکول کی ملکیت بن کر آج تک اسکول کی زینت اور جالب صاحب کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ بمبئی کے ہائی اسکولوں کے ٹیچروں میں شاید یہ اعزاز بھی اُنھیں ہی حاصل ہے کہ وہ مختلف کالجوں (مثلاً صفایہ کالج، اسماعیل یوسف کالج، برہانی کالج، مہاراشٹر دیانند کالج وغیرہ) میں اُردو تقریری مقابلوں میں ایک منصف کی حیثیت سے مدعو کئے جاتے رہے۔

ایک بار محکمۂ تعلیمات کے ایک انسپکٹر نے اُن کے کلاس کا معائنہ کرتے ہوئے اس بات پر اعتراض کیا کہ نصاب مقررہ تکمیل کو نہیں پہونچا ہے۔ خاص طور پر مضمون نگاری کے ضمن میں لکھوائے گئے مضامین مقررہ نصابی تعداد سے کم ہیں۔ جالب صاحب نے اُن انسپکٹر سے سوال کیا کہ مضامین کی ایک معین تعداد سے محکمۂ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ انسپکٹر نے جواب دیا کہ مضامین کی معینہ تعداد کی مشق کے بعد طلبہ کو مضمون نگاری کی مناسب صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔

جالب صاحب نے ملائمت سے جواب دیا "اگر میں چند مضامین ہی لکھوا کر طلبہ کی تحریری استعداد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لیتا ہوں تو محکمۂ تعلیم کو ایک مقرر کردہ تعداد پر اصرار نہ ہونا چاہیئے اور آپ کو کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تعداد کی بجائے استعداد اور معیار کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، جس کا میں زیادہ خیال رکھتا ہوں اور مجھے ناز ہے کہ میرے طلبہ بھی Subjects میں کسی بھی اسکول کے مساوی الدرجہ طلبہ سے بہت آگے ہیں۔"

انسپکٹر صاحب طلبہ کے چند مضامین ملاحظہ فرما کر لاجواب ہو کر کلاس سے تشریف لے گئے۔

آج کل کے اساتذہ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جالب صاحب نے کبھی اپنے اسکول کے طلبہ کا پرائیوٹ ٹیوشن نہیں لیا اور اسے اخلاقی اعتبار سے نادرست سمجھا اور اسے ایک اُستاد کی معلمانہ صلاحیتوں میں نقص سے تعبیر کیا کہ وہ طلبہ کی کمی استعداد، تفویض کردہ اوقاتِ درس میں پوری نہ کرتے ہوئے انھیں پرائیوٹ ٹیوشن لینے کی ترغیب

---

[1] علامہ اقبال علیہ الرحمۃ والرضوان

دے۔ نہ ہی انھوں نے کسی طالب علم کی ناکامی کو اس کی
نااہلیت پر منطبق کیا بلکہ یہی کہا کہ ہر شخص میں ایک شوق تو
ہے، ضرورت ہے تو مناسب نگہداشت اور آبیاری
کی جس طرح جی جان سے وہ پڑھایا کرتے تھے، اسی طرح
طلبہ بھی اُن پر جان چھڑکتے تھے۔

پچھلے دنوں ایک ہم عصر نے روزنامہ "انقلاب" بمبئی
کے صفحات پر "عظمت کے ستون" کی سرخی کے تحت جالب
صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ایک بار وہ جب اپنے
لڑکے سبحان کے انتقال کے بعد اسکول آئے اور کلاس میں
پڑھانے کے لئے داخل ہوئے تو طلبہ نے اُستاد کی آشفتگی
و افسردگی دیکھ کر سبق موقوف کرنے کے لئے کہا۔ سوئے اتفاق
سے اُن دنوں مراثی انیس کا سبق چل رہا تھا۔ ایسی افسردگی
و غم گینی کی حالت میں ایسے سبق کا پڑھانا استاد کی آتشِ
دروں کو ہوا دینا اور تنگی ہوئی میں اور لگتا تھا، لیکن
جالب نے اپنے غم سے اعراض کرتے ہوئے اپنے فرض
کی ادائیگی کو ترجیح دی اور پڑھائی شروع کی۔ اُنکا سا غم
زدہ دل اور مراثی انیس کا بیان، دل خون کے آنسو رو رہا
تھا اور صنائع بدائع کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک ایک شعر
کے رموز و نکات کے بیان اور اشعار کی توضیح و تشریح
میں ایسے منہمک ہوئے کہ کلاس میں ایک محویت کا عالم
طاری ہوگیا۔ یوں تو اُستاد نے ہر سبق میں ایک
جہانِ معنی کی سیر کرائی تھی، لیکن اس دن کا سبق طلبہ کے
دلوں میں ایک یادگار بن کے رہ گیا۔ ایسے ایسے کتنے ہی
واقعات اُن کے شاگردوں کے سینوں میں پنہاں ہیں۔ اُن
کا اپنے اسم گرامی (سلیم الدین) کی مناسبت سے
یہ کہا کرنا کہ "مذاقِ سلیم پیدا کرو" آج بھی اُن کے
تلامذہ کے کانوں میں گونجتا ہوگا۔

جالب صاحب نے اپنے طلبہ کو محض میٹرک کا سرٹیفکیٹ،
گولڈ میڈل اور ٹرافیاں حاصل کروانے ہی پر اکتفا نہیں
کیا بلکہ انھیں آدابِ مجلس اور عوائدِ رسمیہ کا حامل اچھا
انسان بنانے کی سعی بھی کی۔ اُن کے شاگردوں کی
تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، جن میں سے بیشتر دنیاوی
اعتبار سے کامیاب ہیں۔ ان کے سینکڑوں طلبہ ٹیچر، پروفیسر
ڈاکٹر، صحافی، وکیل بن چکے ہیں۔ بہت سے کامیاب
تاجر پیشہ افراد ہیں اور بعض فلمی دنیا کی زینت بن
گئے ہیں، لیکن جو بھی، جب، جہاں کہیں اُن سے مل جاتا
ہے، چاہے وہ آج کسی بھی مرتبہ و مقام کا حامل ہو،
اور عمر کی کسی بھی منزل میں ہو، انتہائی عقیدت سے
سرِ نیاز خم کر دیتا ہے اور نیاز مندانہ، اُن کے احوال
و کوائف کا استفسار کرنے لگتا ہے۔

اُن کے شاندار تدریسی کیریر، انکی گراں قدر خدمات
اور ان کے طلبہ کی بےمثال کامیابیوں نے اسماعیل بیگ محمد
ہائی اسکول کو جو شہرت و ناموری اور عزت و افتخار بخشا،
افسوس کہ اسکول کے اربابِ اختیار اس کے صلے میں اُن کو
کوئی وقعت اور قدر افزائی نہ کر سکے اور سنہ ۱۹۷۰ء میں
۴۴ سالہ خدمات کے بعد جب وہ خاموشی سے ریٹائر کر
دیے گئے، جیسا کہ عموماً ایک ٹیچر کا انجام ہوا کرتا ہے
تو اُن کے دل کے درد کو اُن کے کچھ شاگردوں ہی نے
سمجھا اور ہندوستان میں پہلی بار ایک ریٹائرڈ معلم کے
اعزاز میں ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو بمبئی کے پاٹکر ہال میں
"جشنِ جالب" منعقد کر کے، جس کے صدر خواجہ غیاث
مرحوم آئی سی ایس اور مہمانِ خصوصی دلیپ کمار
اور سائرہ بانو تھے اور جس میں بین الاقوامی شہرت یافتہ
غزل سنگر بیگم اختر کا غزل سرائی کا پروگرام رکھا گیا

تھا، انھوں نے ایک گراں قدر کیسہ زر اور اسی سے ہزاروں لاکھوں گنا اپنی عقیدت و محبت اور سعادت و ارادت اپنے گرو کو گرو دکھشنا میں نذر کر دی۔

اب آئیے ہم ان کی شخصیت و کردار کے بعض دیگر پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔

کشیدہ قامت، ستواں جسم، گندمی رنگ، مولویانہ وضع، سفید پاجامے پر کسی گہرے رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی گول ٹوپی پہنے، ہونٹوں پر ایک مشفقانہ مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کسی کتاب کے ساتھ مدتیں گزر گئیں۔ جالب صاحب کو ہمیشہ اسی وضع میں دیکھا۔ زمانے میں کیسے کیسے انقلاب آئے اور خود ان کی زندگی طرح طرح کے سرد و گرم سے دوچار ہوئی، لیکن آج بھی انھوں نے اپنے ہونٹوں کی مدھر مسکان، اپنی شگفتہ خاطری اور جودتِ طبع کو زمانے کی دست و برد سے بچا رکھا ہے ؎

ہیں اپنے ایک رنگ پہ رہنے کی کس سے داد
ہم آج تک وہی ہیں، زمانہ بدل گیا

(وحید)

رابرٹ کوٹن نے کہا ہے کہ کردار وہ ہے، جس پر آپ کی شخصیت یا وجود قائم ہے اور شہرت وہ ہے جو آپ کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ جالب صاحب کی زندگی گویا اس مقولے پر صاد کرتی ہے۔ انھوں نے کبھی شہرت و ناموری کی تگ و دو نہیں کی اور اپنے کنج عزلت کی سکوت پر شور و غوغائے مجلس و محافلِ ادب کو قربان کرتے رہے۔ انکی بلند کرداری اور نیک سیرتی کے انمٹ نقوش انکے جاننے والوں کے دلوں پر ثبت ہیں۔ وسیع النظر، سلیم الطبع اور حلیم المزاج نظر آنے والے جالب صاحب نے کبھی کسی کے غرور بےجا کی پروا نہیں کی اور مقابل کے مرتبہ و مقام کو خاطر میں لائے بغیر حق گوئی اور بےباکی پر عمل پیرا رہے بلکہ انھوں نے ہمیشہ غرور و نخوت سے پیش آنے والے کا جواب کج کلاہی و شانِ بےنیازی سے دیا ؎

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

(مصحفی)

وہ نظم و ضبط اور پابندیٔ اوقات کے اعتبار سے انگریز، مظاہر العلوم کے فاضل ہونے کی بنا پر کٹر مسلمان صفائی و پاکیزگی کا غلو کی حد تک لحاظ رکھنے کی وجہ سے شدھ برہمن اور صلح کل کے مسلک اور وسیع النظری کی رو سے آزاد منش اور اپنی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کے سبب سے بڑھاپے میں بھی جوان ہیں اور لطف یہ کہ ان متضاد اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود وہ رشید کیفی جیسے رند شاہد باز، مولانا عبدالمجید حنیفا اعظمی جیسے دیندار اور شمس کنول جیسے دین بیزار کے ہم دم و دمساز بنے رہے۔ گویا وہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق ہیں ؎

در دیر نیاز من، در کعبہ نماز من
زنّار بدوشم من، تسبیح بدستم من

ایک زمانے میں انکی مکاتبت علامہ نیاز فتح پوری، پنڈت دتاتریہ کیفی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے مشاہیر ادب سے رہ چکی ہے۔ لیکن رشید کیفی اور حزیں سے انکی خط کتابت کا سلسلہ کافی دراز رہا۔ ان دو صاحب کمالوں کے مخلصانہ و بےتکلفانہ تعلقات اور ادبی نوک جھونک کا دلکش مرقع ان کے مکاتیب میں جھلکتا ہے۔ اگر شائع کر دیا جائے تو یہ اردو کے ادبی خطوط کا ایک گراں بہا مجموعہ ہوگا۔

یہ امر افسوسناک ہے کہ جالب صاحب نے معاصرین کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کم ہی کیا، جبکہ تقسیم کے بعد کے اردو ادب سے وہ بے زار ہی نظر آئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی بنیاد گزار، اصنافِ ادب کے اوّلین معماروں اور زبانِ اردو کے کلاسیکی خداوندگانِ سخن یعنی شعرائے اردو کا انھوں نے خوب خوب مطالعہ کیا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے نصفِ آخر کے اردو ادب کو انھوں نے قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ کبھی اس کی ستائش کی۔ اکثر محسوس ہوا کہ اردو ادب سے انکی دلچسپی تنقید و سوانح میں حالی، شبلی اور عبد الحق، شاعری میں جگر، جوش اور مجاز، تذکرہ و تاریخِ ادب میں رام بابو سکسینہ اور شمس العلماء محمد حسین آزاد، ادبِ لطیف میں نیاز فتح پوری، مہدی افادی اور رشید احمد صدیقی، افسانہ و ناول میں سرشار، نذیر احمد اور پریم چند، علم اللسان میں مولانا وحید الدین سلیم اور ندرت دتاتریہ کیفی اور صحافت اور انشا میں عبد الماجد دریابادی اور امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کے بعد سے ختم ہو کر رہ گئی اور اس کے آگے بدلتے ہوئے عہد کی بدلتی ہوئی ادبی روایات کو ان کے ذہن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دورِ حاضر کے ادب اور عوامی مذاق کے معیار سے انھوں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ترقی پسند تحریک اور اس کے بعد کے اردو ادب سے ان کی بیزاری اور بے گانگی ناقابلِ تو ہے ہی، رنج اس بات کا بھی ہے کہ انھوں نے ٹھوس علم کے حامل اور اہلِ زبان ہونے کے باوصف اپنے معاصروں پر بھی اردو ادب کو علمی نگارشات سے نوازنے میں بخل سے کام لیا۔

اردو زبان کے مستقبل کے سلسلے میں وہ عام مسلمانوں کی طرح جذباتی ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ہندوستان کا کرۂ ارضی بالکل پلٹ بھی جائے تو بھی اس پر حسرت و افسوس کا جو مرثیہ پڑھا جائے گا وہ اس کی زبان اردو ہوگی۔ اردو رسم الخط کی تبدیلی کو وہ غیر سود مند سمجھتے ہیں اور اس لایعنی بحث میں الجھنے کی بجائے انکی رائے میں اردو املا کو بے ضابطگیوں اور ناہمواریوں کو دور کرنا اور صحتِ املا کے اصول و معیار عام کرنا وقت کی کہیں زیادہ اہم ضرورت ہے تاکہ کتابت و طباعت میں انتشار و اغلاط سے بچا جا سکے۔

صحتِ زبان کے معاملے میں آج کل کے نقطۂ نظر سے وہ بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ ان کے سامنے کوئی غلط تلفظ ادا کرے یا کوئی شعر غلط پڑھ جائے یا کوئی شعر کسی غلط شاعر سے منسوب کرے اور ان کے تنقید سے بچ جائے۔ عصرِ حاضر کے ادب سے ان کی بیزاری کا بڑا سبب صحتِ زبان کا گرتا ہوا معیار اور ان کی کم نویسی کی ایک بڑی وجہ کاتب کی غلط نگاریوں کا خدشہ ہے۔ اس اعتبار سے جب بھی ان کی شخصیت پر نظر کرتا ہوں تو مجھے میر کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے، جب وہ لکھنؤ سے چلے اور اثنائے سفر میں، گاڑی میں ان کے کرایہ کے شرکت دار ہم سفر نے وقت گزاری کے لیے ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میر صاحب چیں بر جبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ! آپ نے کرایہ دیا ہے، بیشک گاڑی میں بیٹھیے، مگر باتوں سے کیا تعلق!"....... اس نے کہا "حضرت کیا مضائقہ ہے، راہ کا شغل ہے، باتوں

همزة لمزة

خدا تو نہیں ہوں
کہ تم کو سزا و جزا کی بشارت سناؤں
مگر علم اور تجربوں کی بنا پر جو تھوڑا بہت مجھ کو حاصل ہے
تمہیں باخبر کر رہا ہوں
تمہاری جبلت تمہیں قتل کرنے

تمہاری طرف بڑھ رہی ہے
یقیں جان لو دوست ہونے کے ناطے
مجھے تم سے بے انتہا انس ہے
تمہاری فراست کا بھی معترف ہوں
کہ ہمز اور لمز کی یہ جبلت
تمہیں ایک دن قعر ذلت میں غرقاب کرکے رہے گی
یہ اس لئے بڑے واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے
"تباہی ہے ہر اس کے لئے"
اور اس کے لئے خوب بھڑکی ہوئی آگ ہے"
اور یوں بھی تمہاری سرشتِ مدامن
انسانی اخلاق و اقدار کے حق میں زہراب ہے
اگر ہو سکے تو تم اپنی جبلت کو اب چھوڑ کر
خود کو ذلت، تباہی سے محفوظ کر لو
عذاب الٰہی سے محفوظ کر لو ! ○

○
مشتاق شمع
○

ٹوٹے رشتے کی دعا

مقدس آیتوں کے ورد سے پہلے
گواہوں نے تمہارے پاس جاکر
زندگی بھر کے لئے
اک اجنبی کے پاس رہنے کی رضا مانگی !
تمہارے لب ہلے
میں عہد کرتی ہوں، مجھے اقرار ہے منظور ہے
پھر اس کے بعد
شادیاں اور قہقہے لوٹ آئے سب
مقدس آیتیں اک شخص نے پڑھ کر
وہی اقرار جو تم سے لیا تھا، اجنبی سے بھی لیا
صدائے تہنیت ہر سمت سے گونجی
دعائیں کی گئیں (رسمی طریقے سے)
مگر اک ہاتھ جب اٹھا تو اس کی آنکھ میں آنسو امڈ آئے
خدائے پاک سے اس نے
خلوصِ جذبۂ دل سے
تمہاری زندگی کی کامیابی کی دعا مانگی
یقیناً یہ دعا مقبول ہوگی ! ○

کم نگہی

لہو ٹپکتا ہے میری رگوں سے ہم نفسو
وہ تیر لفظوں کے زہراب میں ڈوبے ہوئے
تمہارے لب کی کماں سے کبھی جو نکلے تھے
مری فگار رگوں میں چبھے ہیں
لہو ٹپکتا ہے
یہ کیوں کہا تھا بھٹکتا رہوں گا راہوں میں
نہ پا سکوں گا کبھی اپنی منزلِ مقصود
ہر ایک سعی مری ہوگی تشنہ و ناکام
ہر ایک عزم پشیماں، ہر اک طلب بے سود
مرے رفیقو! تمہاری یہ حوصلہ شکنی
مجھے مذاق لگی تھی مگر یہ سوچتا ہوں
یہ جذبے کون سی فطری جبلتوں کے طفیل
تمہارے دل سے گزر کر زباں تک آئے تھے
مرا تو کچھ نہ گیا میرے دوستو لیکن
تمہارے حسنِ مروت کا اعتبار گیا!

مشتاق شبنم

تلاش

اجنبی شہر ہے، انجانے سے چہرے ہر سو
اپنے قدموں کی طرف سر کو جھکائے ہوئے
راستوں پر یہ لڑھکتے ہوئے بے جان بدن
اپنی بلّوری سی آنکھوں میں سموئے ہوئے درد
جانے کس سمت رواں ہیں یہ کسے اب معلوم
اپنے ماحول سے اکتائے ہوئے لوگ جنہیں
ساتھ چلتے ہوئے سایوں کا بھی احساس نہیں
کس سے پوچھوں کہ فلاں سمت مجھے جانا ہے
کون بتلائے گا اس شہر میں مجھکو وہ مکاں
جس میں اک اجنبی انسان رہا کرتا ہے!

ٹوٹتے بکھرتے وجود کا المیہ

اور پھر یوں ہوا
ایک وحدت کی کشتی میں بیٹھے ہوئے
میں نے تم نے
مصائب کے طوفان کو روکنے کے لئے
اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں
اور پھر یوں ہوا
تھمتے طوفان پر فتح پالی
مگر رفتہ رفتہ تمہیں اپنی قوت کا احساس ہونے لگا
اور وحدت کا وہ غیر فانی تصور
تمہارے دماغ و دل و ذہن سے دور ہونے لگا
تمہارے ہر اک ناروا ظلم نے
میرے اعصاب کو مضمحل کر دیا،
میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات ہر گز نہ تھی
میری قربانیاں سب کی سب رائیگاں جائیں گی،
میری محرومیاں حد سے جب بڑھ چکیں
میرا "میں" مجھکو اندر سے آواز دینے لگا
اپنی لا انتہا قوتوں سے میں اب کام لوں
سبھی بندھن ہی توڑ دوں
میرے اندر کی آواز یہ کہہ رہی ہے
کہ یہی ہوگا
ہاں اب یہی ہوگا
تم دیکھنا!

مشتاق شبنم

ہندوستانی بنکر

(سروجنی نائیڈو کی ایک نظم کا ترجمہ)

بنکر! صبح سویرے،
طائر کے نیلے پنکھوں جیسے
اتنے سندر کپڑے کیوں بنتے ہو؟
اک نوزائیدہ بچے کی پوشاک کی خاطر
ہم کپڑے بنتے ہیں۔

بنکر! اتنی رات گئے،
مور کے نیلے ہرے پروں جیسے
اتنے چمکیلے کپڑے کیوں بنتے ہو!
ایک نئی نویلی دلہن کا
ہم آنچل بنتے ہیں۔

بنکر! اتنی خاموشی سنجیدگی سے
ٹھنڈی چاندنی شب میں
بادل اور پروں جیسے
اتنے اجلے کپڑے کیوں بنتے ہو؟
اک مردہ انسان کی تجہیز و تکفین کی خاطر
ہم ایک کفن بنتے ہیں۔

فضا ابن فیضی

جن حالوں میں جینا انہیں حالات پہ لکھنا
مشکل ہے مری آشوبِ غمِ ذات پہ لکھنا

دکھتی ہوئی رگ پر نہ کہیں انگلیاں پڑ جائیں
آساں نہیں گزرے ہوئے لمحات پہ لکھنا

گھر میں بھی دہکتا ہے بیاباں کا ہر موسم
مجبوری ہے اپنی انہیں دن رات پہ لکھنا

ہاتھوں سے پھسل جائیں گے بھیگے ہوئے لمحے
برسات گزر جائے تو برسات پہ لکھنا

دل بیٹھوں جو اس پر تو کھلیں ذہن کی گرہیں
موقوف رہا اب تو اسی بات پہ لکھنا

اپنی جگہ دونوں ہی تقابل کا ہیں موضوع
تم اپنی کہانی بھی مرے ہات پہ لکھنا

لکھ دوں یہ قلم اور خراشوں کو سمیٹوں
ہے آج مجھے اپنے ہی حالات پہ لکھنا

تشکیک کی لذت بھی بہرحال ہے اک چیز
ہر نفی کو لازم نہیں اثبات پہ لکھنا

دیکھو تو ابھی تم میں ہے ناپختگی کتنی
اے تجربو! کچھ تو بھی روایات پہ لکھنا

شیشہ آدم تیشے ہوئے مشق ہوئی تحریر
لکھنا تو اب آئندہ کے خدشات پہ لکھنا

یا لکھوں کہ گردن پہ ہے رکھی ہوئی تلوار
جس بات پہ لکھنا ہے اسی بات پہ لکھنا

انساں کا مقدر ہے مسائل کا یہ الجھاؤ
ہم کو ابھی پیچیدہ سوالات پہ لکھنا

بیٹھے ہیں یہاں ساتھ ادب اور سیاست
اب سیکھ لو کچھ اپنے مفادات پہ لکھنا

یہ بھی تو شکست مرے ارباب قلم کی
"اُردو" کے حقوق اور مراعات پہ لکھنا

باسر و ساماں بھی ہے شکستہ یقینی
مجھ کو ابھی دیوارِ قیاسات پہ لکھنا

ہم جل کے ہوئے راکھ فضاؔ تب کہیں آیا
کرنوں کو بکھرتے ہوئے ذرات پہ لکھنا

ویراں نہ یونہی قریۂ جاں چھوڑ جاؤں گا
کچھ خوشبوؤں کی گود یہاں چھوڑ جاؤں گا

میں ڈوب جاؤں گا بھی تو اے موجِ خاک پاک
پانی پہ ایک نقشِ رواں چھوڑ جاؤں گا

معنی کی دھوپ ہوں گھنے لفظوں کے موسمو
صحرا کی طرح تم کو تپاں چھوڑ جاؤں گا

گو معتبر نہیں ہے یہ لاعلمیوں کی دھند
شعلوں کے آس پاس دھواں چھوڑ جاؤں گا

خود زندگی ہے سلسلۂ جلوہ و حجاب
دیوار و دیدۂ نگراں چھوڑ جاؤں گا

اس رختِ رہ گزر کو بھی دامن میں باندھ لوں
یہ دھول دھول جسم کہاں چھوڑ جاؤں گا

ترکش میں بچی ہوئی سانسوں کے چند تیر
یہ بھی جو چل گئے تو کماں چھوڑ جاؤں گا

مجرم کی طرح کب ہے یہاں زندگی بسر
پاگل ہوں میں کہ اپنا نشاں چھوڑ جاؤں گا

اس سے زیادہ مجھ سے توقع فضول ہے
اتنا یقیں تو ہے کہ گماں چھوڑ جاؤں گا

چلتی ہیں یوں بھی نطق و لغز کی دو ریاستیں
میں کاٹ کر یہ اپنی زباں چھوڑ جاؤں گا

مجھ کو پڑھیں گے لوگ تو سوچیں گے کیا فضاؔ
کاغذ پہ چند حرفِ نہاں چھوڑ جاؤں گا

غزلیں

آئینوں سے پہلے بھی رسمِ خود نمائی تھی
دل شکار ہوتے تھے، ایسی دلربائی تھی

پھول پھول بام و در، راستے ہیں گل پیکر
وہ اِدھر سے گزرے تھے، یا بہار آئی تھی

پاس کا مسافر بھی اُٹھ کے دور جا بیٹھا
نام پوچھ لینے میں ایسی کیا بُرائی تھی

کچھ شفق شفق عارض کچھ افق افق چہرے
آرزو نے بزم اپنی رات یوں سجائی تھی

کتنا محترم تھا میں بھولتا نہیں نجمی
بھوک جب مرے گھر میں سر جھکا کے آئی تھی

حسن نجمی سکندرپوری

اہلِ ہوس کے ہاتھوں نہ یہ کاروبار ہو
آباد ہوں ستارے، زمیں ریگسار ہو

اک شان یہ بھی جینے کی ہے جی رہے ہیں لوگ
طوفان سے لگاؤ، سمندر سے پیار ہو

حالات میں کبھی یہ توازن دکھائی دے
غم مستقل رہے نہ خوشی استوار ہو

نفرت کے سنگ ریزوں کی بارش تھمے کبھی
دیر و حرم کے بیچ سفر خوشگوار ہو

صدیوں سے گھل رہی ہے اسی فکر میں حیات
رہزن سے پاک زیست کی ہر رہگزار ہو

بادِ سموم لوٹ لے چہرے کی تازگی
اگلی صدی کی ایسی نہ فصلِ بہار ہو

نجمی جو اپنے عہد کی تاریخ بن گئے
اُن شاعروں میں کاش مرا بھی شمار ہو

ڈائرکٹریٹ آف اڈلٹ اینڈ انفارمل ایجوکیشن بہار۔ پٹنہ

تعلیم بالغان مہم یکم مئی ۸۶ء سے

طلبار اور طالبات کا رول

جہالت، غریبی اور پسماندگی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ بہار میں ۱۰۰ میں ۴۳ آدمی ناخواندہ ہیں۔ اگر ریاست کو آگے بڑھانا ہے تو جہالت کو دور کرنا ہی پڑیگا۔ گاندھی جی نے بھی کہا تھا "جہالت ہندوستان کے لیے کلنک اور لعنت ہے"۔ اس سے نجات پانی ہی ہوگی۔

جہالت کا خاتمہ پڑھے لکھے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے ایک مہم چلائی جارہی ہے جس میں نوجوانوں کا رول اہم ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا اس کام کو آسانی سے کر سکتے ہیں۔ جو طلبا نیشنل سروس اسکیم کے ممبر ہیں وہ اس کام کو پہلے سے ہی کرتے رہے ہیں۔ دیگر طلبار بھی اس کام کو کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک منظم اسکیم بنائی گئی ہے جس کے تحت نیشنل سروس اسکیم کے والنٹیرس اور دیگر طلبار ۳۵-۱۵ سال کے ...... سے نیچے تک کے بالغوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ ان بالغوں کو تعلیم دینے کے لیے سامان حکومت فراہم کریگی۔ جو یونیورسٹیوں اور کالجوں تک پہونچائے جا رہے ہیں۔

جو طلبا اس اسکیم میں حصہ لے رہے انہیں سرٹیفکیٹ اور بیج دیا جائے گا جو اُن کی ملازمت میں کام آئے گا۔ خصوصی جانکاری کے لئے نیشنل سروس اسکیم کے طلبا اپنے کنوینر اور دیگر طلبا یونیورسٹی / کالج کے اڈلٹ ایجوکیشن پروگرام کے انچارج سے رابطہ قائم کریں۔

دستخط: یو۔ ڈی۔ چوبے

ڈائرکٹر اڈلٹ اینڈ انفارمل ایجوکیشن بہار۔ پٹنہ

सू० ज० स० नि० - 63 - ब (उ- 46) 8:-86

شرون کمار ورما

اُکھڑتے قدم

جگی پلیا پر خالی سا بیٹھا تھا۔ بمبئی جانے والی
گاڑی ابھی ابھی گزری تھی۔ بلڈنگ فنڈ نہ لانے پر
پہلے تو ماسٹر نے اسے مارا تھا اور ایسی ایسی گالیاں
دی تھیں کہ اگر انھیں مصوّر کیا جاتا تو رنگین کوک شاستر
ساکار ہو جاتا۔ اُسے کان پکڑ کر مرغ بن جانے کا حکم سنا
کر اس کا بستہ اتنے زور سے اٹھا کر پھینکا تھا کہ
سرکاری کتابوں کی جلدیں اکھڑ گئی تھیں اور وہ سوچ
سوچ کر حیران ہو گیا تھا کہ جب اسکول کی بلڈنگ
ہی نہیں تھی تو بلڈنگ فنڈ کیسا! اور وہ بھی بنا
رسید کے۔ لیکن یہ سب ماسٹر صاحب یا اسکول کی
بلڈنگ کمیٹی سے کون پوچھتا۔ بچوں کو مہاتما گاندھی
پر مضمون رٹنے کے لیے کہہ کر ماسٹر جی "ترالا جوگی" کے
ساتھ تاش کے تماشے میں نکل گئے تھے۔ جگی موقع پاتے
ہی مدرسے سے کھسک گیا تھا۔

ہنڈریل کا چھوٹا سا پل اور پرے کھیت اور
درختوں کا سیلی سی ... ۔۔۔ پیچھے امرود کا
... پھر ... اور بیریاں ۔۔۔ اور
... ۔۔۔ ... پتوں پر بیٹھے
[illegible]

اس کے آنے کا یہ فلمی انداز جگی کو حیران کر دیتا۔۔۔
بیریوں کے پیچھے سے بشنا نمودار ہوا ۔۔۔ بڑے گول
شیشوں والا چشمہ، گلے میں ریشمی رومال، منہ میں
پتی والا پان، پھولدار سرخ شرٹ اور کھلی کریز کی
چست سیاہ پتلون، اور اونچی ایڑی کے نوکیلے چمکتے
جوتے ۔۔۔ جگی کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اسے
یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس لباس میں اس نے دھرمیندر کو
دیکھا تھا یا ... ۔۔۔ جب تک
کوئی فیصلہ کرے بشنا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔
کنگ سائز فلٹر والا سگریٹ سلگا کر اس نے ملکیت
کے احساس سے جگی کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی اور مسکرا کر
پوچھا۔

"بھرا! اس ماسٹر کے بچے نے تجھے آج ۔۔۔؟"

جگی چپ رہا۔

"تجھے تو نے ابھی ۔۔۔" بشنے نے ... کی
چاقو کھٹ سے کھول دیا۔ "...

جگی ڈر گیا۔ اتنا لمبا تیز چاقو
دیکھ کر اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں ...
[illegible]

مقبول شخصیت۔ سمندر کے کنارے عورتیں ننگی گھومتی ہیں، کھلے عام پیار کرتی ہیں، اور فلم والے نئے چہروں کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتے ہیں۔ ماسٹر جی نے قاتل جیسے "گھونی اور مور" اُڑ گیا۔

○

بشنا اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"دو چار دن سے ملا نہیں ——— سگریٹ لو۔ ولایتی ہے، اسرانی نے بمبئی سے بھیجا ہے۔"

نیلا، لیا، خوشبودار سگریٹ ——— اس نے کش لیا تو جیسے سارے دکھ دھواں بن کے اُڑ گئے۔ ماسٹر قلابازیاں کھاتا گم ہو گیا۔

"بلایا ہے اسرانی نے ———"

"جا رہے ہو گرد ——— ؟"

"جا! ایک اسٹار چاہیے اُسے، نئی فلم کے لئے ——— جائے گا ———"

"ہاں ———"

"پھر ان کو بھی بلا لینا ——— بمبئی سے اسرانی کے آدمی آئے ہیں۔ بول۔"

جگی نے سر جھکا لیا۔

"آ ——— میرے ساتھ ——— وہ لوگ کار میں جا رہے ہیں۔"

باغ سے دور، ایک اجاڑ جگہ پر، سرکنڈوں کی آڑ میں سیاہ رنگ کی کار کھڑی تھی۔

"بہت دیر کر دی۔" کار سے سر نکال کر ایک مضبوط آدمی نے کہا۔

"یہ اسرانی نے بلا دیا۔ میں کل فرنٹیر میل سے چلوں گا۔"

ایک آدمی نے کار سے نکل کر اُسے جیسے اٹھا کر کار میں ڈال دیا۔ کار گرد اُڑاتی چلی گئی۔

جب دھول بیٹھی تو بشنے نے دیکھا کہ جگی کا بستہ وہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ٹھوکر مار کر بستہ گندے پانی کے جوہڑ میں گرا دیا۔ ہاتھ کے نوٹوں کو چوما اور اسکول کی طرف چل دیا جہاں اس نے جگی کے ہم جماعت روشنی سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ ●●

حضرت کیف مسنہادوی (مرحوم)

رُباعیاں

جھیلو گے غم و رنج و مصیبت کب تک
کھاتے رہو گے پست ہمت کب تک
اٹھو اٹھو وطن کی اب خیر نہیں
جاگو جاگو! یہ خواب غفلت کب تک

دنیا میں وہ عیش و کامرانی نہ رہی
وہ بزم نشاط و شادمانی نہ رہی
ایسا بھی الٰہی پھر وہ دن آئے گا
جب لوگ کہیں کہ حکمرانی نہ رہی

غیروں کا کسانوں کے گھروں پر ہے اختیار
بنیوں پہ ہے کنگلوں کا بہت سوار
اگر آج نہ ٹھیک ہے تو کل ڈوبے گا
جنتا کا غدار تاجر ہیں سرمایہ دار

بابا جو موڑ آتے ہی اس کے منہ سے شراب کی گندی بو آتی ہے۔

اب رے باپ ——— مُدرگا کا ہو ہے لیکن وہ کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ وہ جُوا تو کھیلتا ہی ہے، شراب بھی پیتا ہے۔ مدرگا اس کے چنگل سے نکل بھی نہیں سکتی۔

گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے اتنی رات میں گھڑیال کی آواز کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ کسی کو نیند نہیں آتی تو پھر یکایک یہ آواز ——— دل دھڑک اٹھتا ہے۔ آس پاس کے مکان میں لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ ایک پتہ بھی نہیں کھڑک رہا ہے۔ بھاگ متی جب کھڑی ہوئی تو اس کے بدن میں عجیب لہر تھی۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا ——— اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا ——— اور اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی ——— گورکھا پہریدار کی سیٹی کی آواز دور گلی میں گونج کر دم توڑ چکی تھی۔ سامنے دروازہ سے ٹھنڈی ہوائیں اس کے بدن کو تیر کی طرح چھید رہی تھیں۔

شام سے ہی سڑک کے کنارے لکڑی کے کندے جلنے لگے تھے۔ اس کے گرد بیٹھے لوگ آگ تاپ رہے تھے۔ سردی سے مرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کے پاس تو جلانے کے لئے کوئی لکڑی بھی نہیں۔ اتنی سردی ——— اور ایک پھٹا بلاوز۔

گورکھا پہریدار کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ کیا وہ اس سے ایک گرم سویٹر کی بھیک مانگے؟ ——— نہیں نہیں ——— بھیک تو بھکاری مانگتے ہیں ——— وہ تو [illegible] نیچے درجے کی کوئی چیز ہے۔ جیسا کہ کوئی کام نہیں ——— !

"کیوں بھاگ متی! اتنی رات کو دروازہ کیوں کھولے بیٹھی ہے؟" گورکھا پہریدار نے اس کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بہت سردی معلوم ہورہی ہے۔ آج رات تو میرے ساتھ سو جا۔ اور اس کے بدلے ایک گرم سویٹر لاکر مجھے دے دینا۔"

گورکھا پہریدار بھاگ متی کی بات سن کر چونکا۔ اسے بھاگ متی کی بات ماننے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس کی اپنی جیب خود خالی تھی۔ اس نے بھاگ متی کی طرف دیکھا جو بے بسی سے اس کا انتظار کر رہی تھی ——— !

"بھاگ متی! میں بھی تو سردی سے تنگ رہتا ہے" اس نے کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ ●●

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر: مسعود منظر
مطبع: ملت پریس سلطان گنج پٹنہ
دفتر: [illegible] سائیڈ روڈ، گیا
مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ مشعل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا

مضمون نگار حضرات اپنے مسودے کی کاپی بھیجا کریں ورنہ عدم اشاعت کی صورت میں قابل توجہ نہیں ہوگی۔ (مدیر)

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
HAJI A. RAHIMKHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے۔آر۔چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجئے

Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 21573

"It is a writers" responsibility to prepare the country for the coming revolution, you should solve the problems of the people, show them the way but your message must be conveyed through art not through logic. Your message must find its way to their hearts. Art has a logic of its own. Art overwhelms man and then logic keeps on doing its job,

– Jawahar Lal Nehru

JULY - 86

Rs. 2/-

RADE JRI MARK
ANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دہ
اورمضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE·44 22 22

مودی
دھلائی کا
صابن
MODI
WASHING SOAP
مودی
پنجاب سوپ فیکٹری

چاند تارا
مارکہ
اسپیشل
گُل
ہمیشہ استعمال کیجئے
SPECIAL GUL
REGD.NO. 422955
TRADE MARK
HUSSAIN & SONS
SHIBPORE HOWRAH-2

پھیل گیا
پنی صلاحیتوں سے پوری طرح کام نہیں لیا۔ اُن کے
ے اور طنز و ظرافت سے بھرپور چٹکلے اب مزا نہیں
یے۔ آج انکی شہرت دیوانِ ظرافت ہی کی وجہ سے
جو ایک علمی کتاب ہے اور طنز و ظرافت سے عاری ہے
میر تقی میر اتنے شائستہ اور مہذب تھے کہ اُن
ے طنز نگاری کی توقع عبث ہے لیکن وہ ایک لطیفے
نکے بھی یادگار ہیں۔ ان لطیفوں میں میر کی شائستگی
ہ تفاخر نے سطحیت اور اوچھا پن نہیں آنے
یا۔ ادبیت کے اعتبار سے میر تقی میر کی ذات انتشار
کی شخصیت کے بالکل متضاد تھی۔ انکے بارے میں ایک
نقاد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بلندش نہایت بلند و پستش نہایت پست"

مرزا غالب کی نثر نے اردو کو ایک نئے قسم کی
ظرافت نگاری سے متعارف کرایا۔ ان کے خطوط مزاح
سے بھرے ہیں۔ مجروح کے نام ۱۶ ستمبر ۱۸۶۲ء کے خط میں
لکھتے ہیں کہ "مجھے برسات کا موسم بہت پسند ہے لیکن
مصیبت یہ ہے کہ مہینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹے
بھر برسے"۔ اسی طرح ۱۸۵۹ء میں دہلی میں وبا پھیلی۔
میر مہدی مجروح اس وقت تک پانی پت ہی میں
تھے۔ مرزا سے انھوں نے وبا کا حال پوچھا۔ مرزا نے
جواب دیا کہ وبا یہاں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ
لکھی ہے

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا
زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک
چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے
ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی
تھی۔ تف بریں وبا"

انیسویں صدی کی سب سے زیادہ وسیع المشرب اور
روشن خیال شخصیت ہونے کے ناطے ان کا طنز زہر سے
خالی ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھ رہے تھے
جہاں انسان واقعی انسان ہوگا۔

مرزا نے مذہبی معاملات میں بھی مزاح کا دامن نہیں
چھوڑا۔ مرزا کے سامنے کسی نے شراب کی مذمت کی۔
مرزا نے کہا کیوں آخر اس میں کیا برائی ہے۔ انھوں
نے کہا "حضرت پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا
قبول نہیں ہوتی" ـــ مرزا نے کہا ٹھیک ہے مگر ذرا
یہ تو بتاؤ کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کمبخت
کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے" ایک اور موقع پر
جب ان سے معلوم کیا گیا کہ کیا آپ مسلمان ہیں؟ تو انہوں
نے جواب دیا کہ "آدھا مسلمان ہوں"۔ وضاحت کرنے
پہ مرزا نے کہا کہ شراب پیتا ہوں، سور کا گوشت
نہیں کھاتا"۔ ـــ غالب کی نثر میں مزاح اور طبیعت
میں شگفتگی ہے۔ عبادت بریلوی اپنی کتاب "تنقیدی
زاویے" میں لکھتے ہیں:

اگرچہ اس وقت کے سماجی حالات بھی مزاح
کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہ تھے۔ لیکن
غالب کی بے پناہ شگفتگی ان پر غالب
آگئی۔ چنانچہ ان تحریروں میں اکثر جگہ ظرافت
کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جن کا سوائے
ہنسنے ہنسانے کے کچھ مطلب نہیں۔ غالب
کی اس ظرافت میں ایک طرح کی تازگی اور
بے ساختگی ہے جس کے پیدا کرنے میں کسی

شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ بات یہ کہ غالب اس مزاح کو اپنے نجی خطوط میں پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کو یہ خیال نہیں رہتا کہ ان کو کوئی ادبی حیثیت بھی حاصل ہوگی۔ وہ تو خطوط کے ذریعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں۔"

اس اثنا میں اردو صحافت میں ایک غیر متوقع انقلاب رونما ہوا اور وہ تھا انگریزی کے مزاحیہ اور قہقہہ زار "پنچ" کے طرز پر لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" کا اجرا۔ اس اخبار کے پہلے اور آخری مدیر سجاد حسین تھے۔ "اودھ پنچ" میں طنز و مزاح کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ سجاد حسین کا خاص ہتھیار خاکہ اڑانا تھا۔ سیاسی اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں کا حامی ہونے کے باوجود یہ اخبار قدامت پسندی کا ترجمان تھا۔ پھر بھی اس نے اردو افسانہ ناول کی تشکیل و تعمیر میں بہت اہم رول ادا کیا۔ اردو میں اس اخبار نے وہی کارنامہ انجام دیا۔ جو انگریزی میں Rambler، Tatler اور Spectator نے انجام دیا تھا۔

دوسرا اردو اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ ۱۸۷۸ء میں فسانۂ آزاد کے مصنف سرشار نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس اخبار میں "فسانۂ آزاد" قسط وار شائع ہوا تھا۔ جس نے اس زمانے کے لکھنوی معاشرے کی کمزوریاں، خامیاں بے نقاب کر دی تھیں۔ پروفیسر صادق سرشار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "سرشار اتنے ہنس مکھ اور نیک طبع تھے کہ وہ طنز نگار ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ مزاح نگار تھے اور اپنے زمانے کی خامیوں پر ہنستے تھے۔"

سرشار اپنے مزاحیہ کرداروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے انھیں گلے لگاتے ہیں۔ ان کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ان کی خامیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

اقبال ۱۸۷۳ تا ۱۹۲۸ء نے طنز نگاری کو ادنیٰ صنف کے رتبے سے اٹھا کر فن کی معراج تک پہنچا دیا۔ انھوں نے طنز کو خشکی و بے لطفی سے بچایا اور اس کو عقلیت و متانت سے روشناس کرایا۔ اقبال نے نظریات اور افراد کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ وہ مشرقی تہذیب و تمدن کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور انھوں نے مغربی تہذیب پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ مغربی تہذیب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہے محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس!
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" ہندوستانیوں کی نااہلیت اور وقت کا پابند نہ ہونے پر بھرپور طنز ہے۔ ان کا یہ مضمون ۱۹۲۳ء میں "نیرنگِ خیال" سے شائع ہوا۔ اور اس کے بعد بیشتر ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ سودیشی پولیس، سودیشی عدالت، اور سودیشی اسکول بھی اسی قبیل میں آتے

بہنا رہے تھے یا گھر بنا
ہیں۔ ان طنزیہ مضامین میں مضحکہ اڑانے سے زیادہ
کوشش کی ہے کہ قارئین کو قہقہہ لگانے پر مجبور کیا
جائے۔

پطرس بخاری طنز و مزاح میں ایک خاص مقام
رکھتے ہیں۔ شاید ہی ادب کا کوئی طالب علم ایسا ہو جس نے
"پطرس کے مضامین" نہ پڑھی ہو۔ اُن کی طنز نگاری اعلیٰ
فنی اقدار کی حامل ہے۔ ۱۱ مزاحیہ مضامین پر مشتمل ان
کی کتاب بےحد دلچسپ ہے۔ ان میں سے کچھ مضامین انگریزی
اور فرانسیسی مزاح نگاروں سے متاثر ہو کر لکھے گئے
ہیں۔ "سبیل اور میں" میں تبصرہ لکھنے والوں کا مذاق اڑایا
گیا ہے۔ نقادوں کو ننگا کیا گیا ہے اور رائے زنی کرنے
والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ "مسیا کا عشق" بھی
ایک میٹھی طنز ہے۔

افسوس کہ آج نصاب والوں سے ہٹ کر پطرس
کا کوئی نام لیوا نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک طنز
ہے مغربی رنگ کی یہ طنز انگریزی کے جانے کے ساتھ
ہی ختم ہو گئی۔

کنہیا لال کپور کا مزاح اپنے بیشتر ہم عصر
طنز نگاروں کے مقابلے میں کم مقصدیت اور تیکھے پن کا
حامل ہے۔ "سنگ و خشت" اور "چنگ و رباب" ان کے
مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں۔ یہ مضامین طنزیہ تحریروں
سے زیادہ مزاحیہ تصویروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا
مضمون غالب جدید شعرا کی مجلس میں جدید اردو شعرا
کے کھوکھلے پن اور ریاکاری پر ایک شاہکار تحریر
کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے
اردو پیروڈی کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے
نرم گرم، گستاخیاں اور نازک خیالیاں انکی اہم
کتابیں ہیں۔ کبھی سیر کرنے میں، لمبے سانس لینے میں،
لمبے قدم اٹھانے میں کنہیا لال کے پاس طنز و مزاح کے
فارمولے تھے۔ حالاں کہ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔
لیکن جینٹی جورن بیچارا بھی خوب جانتے تھے۔ مجمع بھی
لگاتے تھے۔ کالج کے اسٹاف روم میں بھی ہنسنے ہنسانے
کی ذمہ داری انھیں کی تھی۔ مغربی ادب سے خوب واقف
تھے لیکن آخر دم تک پنجابی کے پنجابی ہی رہے۔
شاید انھیں کو دیکھ کر سعادت حسن منٹو نے لکھا
تھا کہ جب کوئی پنجابی اردو بول رہا ہو تو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ کنہیا لال
کپور اردو کے سب سے بڑے پیروڈی نگار ہیں۔

طنز نگاری کے ضمن میں اکبر الہ آبادی کا ذکر
نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ جنھوں نے اپنی شاعری
کے ذریعے ہندوستانی معاشرہ کی مغرب زدگی کے
خلاف جہاد کیا۔ طنزیہ شاعری میں انکا مقام بوم
میرٹھی اور خواجی لق لق سے بلند رہے گا لیکن حالی
کے مقابلے میں ان کا مرتبہ یقیناً کم ہے۔ جب سیاست
پریشان کرتی ہے تو کوئی نہ کوئی اکبر ضرور پیدا ہوتا ہے
اور جگ زیب کے زمانے میں بھی مزاح پیدا کرنا اس
کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور پھر دائیں ہاتھ رہ گیا
ہے۔ دائیں ہاتھ سے اسی مزاح سے طنز پیدا کرتا
اکبر مسلمانوں کا بیربل ہے۔ ایسا استاد جس نے
اپنی قوم کو اس کے نقائص سے ہنستے ہنستے ہلکی
ہلکی تنقید کر کے آگاہ کیا۔ اکبر دراصل سوشل ورکر
جنھوں نے سارا سوشل ورک طنزیہ شاعری سے کیا

پہنچ گیا

ایسے عظیم فن کار نقادوں اور مبصروں کا اغماض
بس ناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔
طنز نگاری کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں
جائے گا۔ جب تک اس میں رشید احمد صدیقی کا
ذکر نہ ہو۔ ان کی تحریروں میں آج بھی وہی شوخی و شگفتگی
موجود ہے۔ رشید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ
دری بھلا صحبتوں کا ماتم نہیں کرتے بلکہ شدت اور
کی قوتِ اظہار سے ماضی کی محفلوں کو پھر سے آراستہ
کرتے ہیں۔ وہ اپنی یادوں کے دریچے لطف اندوز ہونے
روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے نہیں کھولتے۔
یہ یادیں ان کے تخیل کی پرواز کے لئے سہارا
بن جاتی ہیں۔ جس سے ان کے بیان میں ایک لطیف
سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے ہم مزاح نگاری
یا مزاح کہہ سکتے ہیں۔ رشید صاحب کے اندازِ مزاح
میں ایک ایسی حزنیہ کیفیت پوشیدہ ہے۔ جس میں
فغان نیم شبی کے ساتھ آہ سحرگاہی بھی موجود
ہے۔ ان کے مضامین اردو ادب میں طنز نگاری کے
بہترین نمونوں کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
کرشن چندر نے طنز کو سیاسی اور سماجی تبدیلی کے
آلے کے طور پر استعمال کیا۔ "ایک گدھے کی سرگزشت" طنز
نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس ناول کا کینوس خاصہ
وسیع ہے اور اس میں موجودہ انتظامیہ پر نہایت تیکھے
وار کئے ہیں۔ اور ایسے خود ساختہ نام نہاد مہذب
اداروں اور جماعتوں کا پردہ فاش کیا ہے جو تہذیب
تمدن کی ترقی میں کوئی کردار نہیں ادا کرتیں سائن بورڈ
ہیں۔ گدھا کو ایک اشارہ یعنی Symbol کے طور

پر استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں گدھے کا کردار
حقیقی بن گیا ہے۔ وہ گھاس بھی کھاتا ہے اور گدھی
سے عشق بھی کرتا ہے۔
کرشن چندر نے فلمی قاعدے میں "ب" سے بمبئی
عنوان سے لکھا ہے۔
"ب" سے بمبئی" جو ہندوستانی فلمی صنعت
کا مرکز ہے۔ "ب" سے ہنڈل ہے۔ جو بمبئی کے فلمی عوام
کا نعرہ ہے۔ یہ پکچر کیا؟ ہنڈل! یہ ڈائرکٹر کیا!
ہنڈل! یہ گانا کیا؟ ہنڈل! یہ ایکٹر کیا؟ ہنڈل!
الغرض جو پکچر آپ ناپسند فرمائیں وہ ہنڈل بلکہ بوگس
ہے، بکواس ہے ...... ہنڈل بازی بمبئی کی خاص زبان
ہے۔ کرشن چندر نے کچھ دنوں اسکول میں پڑھایا بھی
تھا۔ لکھتے ہیں ایک دن میں نے اپنے بچوں سے پوچھا
بمبئی کا جغرافیہ بیان کرو؟ بولے۔ بمبئی کے مشرق
میں جمہور ہے جہاں راج کپور رہتا ہے۔ مغرب میں دلیپ
کمار کا مکان ہے اور جنوب میں بے فکر کا ڈیرا۔ میں
نے اسی دن اسکول سے استعفیٰ دے دیا اور گھر چلا
آیا۔"
"بمبئی بچوں اور کاروں کا شہر ہے۔ یہاں انسان
کا رتبہ کاروں کی تعداد سے اور بچوں کی لمبائی سے
ناپا جاتا ہے۔"
اردو طنز نگاری اس وقت بڑے نازک دور
سے گزر رہی ہے اور ہندوستان میں فکر تونسوی اور
پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی اس کی بجھی ہوئی
شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے موٹے طنز نگاروں
میں رشید قریشی (ہم نے بیوی کے ساتھ شاپنگ کی)

سلیمان خطیب (کیوڑے کا بن) اور تخلص بھوپالی (بھوپال چیخ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت آوارہ نے بمبئی میں اردو طنز نگاری کو اپنی نگارشات کے ذریعے جلا بخشی ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔ موچھیں، جرثیل، اسرار بندی، بے پرکی، اور آتشیں جزیرہ۔

برگس حیدرآبادی، مجتبیٰ حسین، پاگل عادل آبادی، اجیس لکھنوی، سگار لکھنوی، مزاح نگار تو ہیں لیکن طنز نگار نہیں بن سکتے۔ پاکستان میں کرنل محمد خان نے طنز نگاری کو ایک نئی جہت دی ہے۔ لیکن پاکستان کے سب سے محترم طنز نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ انکی "خاکم بدہن" "چراغ تلے......" طنزیہ تحریروں کے بہترین نمونے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زبان کی خود اعتمادی کا اندازہ اس زبان کے طنزیہ ادب کے معیار سے کیا جاسکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے اردو پر نظر ڈالیں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ حال ہی میں نظر برنی کا طنزیہ کلام نظر سے گزرا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کتاب کا نام ہے "چیخ"

عروج احمقاں کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں
لیاقت اک حماقت ہے نہ کام آتی ہیں تدبیریں
اگر کچھ مرتبہ چاہو حلیم بھرنے کا گر سیکھو
اس فن کی بدولت تو بدل جاتی ہیں تقدیریں

اردو طنز بڑی کڑی منزل سے گزر رہی ہے۔ گہرے سیاسی شعور، اقتصادی احساس اور اخلاقی مقصد کے بغیر اس مقصد کی تخلیق ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ خاندان کے زوال کے ساتھ ہی اردو میں طنز نگاری کا آغاز ہوا اور یہ حقیقت اپنے آپ میں خاصا وزن رکھتی ہے کہ جدید ہندوستان [illegible] اردو ایک ایسی زبان ہے جس [illegible] طنز کی روایت بے حد مضبوط اور گہری ہے۔ رتن ناتھ سرشار سے فکر تونسوی تک اس روایت کی توسیع ہوتی ہے لیکن موجودہ عہد میں طنز نگار اپنے منصب سے گر گیا ہے اسے فن سے زیادہ اپنے ذاتی مفادات عزیز ہیں اس لئے وہ مصلحت کا شکار ہوگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے طنز نگار اس مصلحت سے کنارہ کشی اختیار کریں اور خوف وطمع سے گریز کرکے فن کی عظمت کو برقرار رکھنے کی سعی کریں۔ لیکن ایک نام ایسا رہ جاتا ہے جو موجودہ طنز نگاروں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتا۔ وہ ہے یوسف ناظم جو طنز کے موجودہ فیشنوں اور فارمولوں سے بے نیاز ہے۔ یوسف صاحب بمبئی میں رہتے ہیں لیکن ان کا دل حیدرآباد میں ہے۔ نو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ پہلی کتاب کا نام "کیف وکم" ہے اور نویں کا "البتہ" بیچ میں "فٹ نوٹ" "دیوار بیچ" "زیر غور" "کاک ٹیل" "سائے ہمسائے" "نقطہ" "ذکر خیر" ہیں۔ کئی [illegible] پائپ [illegible] کئی اور آئیں گے۔ یوسف ناظم خود ساختہ نام ہے۔ اصل نام سید محمد یوسف ہے۔ اور ناظم تخلص۔ ظاہر ہے کہ پہلے شاعر تھے فکر تونسوی کی طرح، بعد میں طنز کی لائن میں پڑ گئے اور ایسے پڑے کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہندوستان میں ہنسنے کا رواج ذرا کم ہی ہے، یہاں لوگ سنجیدہ ہی نہیں رہتے، دن رات منہ پھلائے رہتے ہیں۔ اس دنیا میں دل کو ٹھیس پہنچانے والے تو بہت ہیں لیکن ہنسانے والے بہت کم ہیں۔"

بار شکیل رکیا

یوسف صاحب اُردو ادب کے ... تعلق ہیں جو اُردو
نثر کا دامن ... اورنگ آباد سے حیدرآباد ہوتے
ہوئے بمبئی چلے آئے ہیں۔

عصر حاضر کے طنز نگاروں میں فکر تونسوی کا نام
سب سے اونچا ہے۔ ان کا طنز دو دھاری تلوار
کے مانند ہے۔ حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے تجاوز
کر چکی ہے لیکن وہ ایک روز نامہ اخبار میں باقاعدگی سے
ایک کالم لکھتے ہیں۔ نو آوروں کی ... آنکھیں
... غصہ ... جذبات کو ... گیا۔ وہ ایک
... ہر وقت پر امید رہتا ہے
اور اس بات کی امید کرتا ہے کہ اس ملک میں زندگی کے دوران
ہی غریبوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جانے لگے۔ مزاج
کے اعتبار سے وہ ایک سوشلسٹ ہے۔ اور سماجی ... بھی
بصیرت کے حامل ہیں۔

ان کا اسلوب نثر طبع زاد اور فرحت بخش ہے۔ ان
کی انسان دوستی نے انھیں ... پروپیگنڈہ بازی
سے محفوظ رکھا ہے۔ انھوں نے اُردو طنز کو ... اور
قابل قدر بنا دیا ہے۔ آج کل وہ "..." روزنامہ میں
"پیاز کے چھلکے" کے عنوان سے ... کالم لکھتے ہیں۔
وہ اپنا مواد عوام ... پیش آنے
والے معمولی واقعات سے اخذ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے
کہ شاعر اور سیاستداں ... اور طوائف
زیادہ ایماندار ہے ... ایسے سماج کی
تشکیل کے خواہاں ہیں جہاں پر طاقت ایماندار لوگوں
کے ہاتھ ... اور کمزور طبقے کو تحفظ حاصل ہو۔ وہ
... جہاں زندگی سادہ اور
آسان تھی۔ اور جہاں وہ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے
میں ایک چرواہے کی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے۔
اور اس زمانے میں پہاڑی دروں میں رومانیت کا راج
تھا اور اونٹوں کے قافلے "سسی پنوں" کے واقعات
کے گیت گاتے گزرتے تھے۔ اور فکر صاحب کا راجہ راج
کرتا جارہا ہے۔

اپنے طنزیہ مضامین کے ایک مجموعے کے پیش لفظ میں
اپنے سوانحی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
"فکر تونسوی ... کا فرضی نام ہے۔ اس کا اصلی نام بڑا
بیہودہ ہے۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران پیدا ہوا۔ اور
تیسری جنگ عظیم میں مارا جائے گا۔" ـــ فکر کا طنز و
مزاح محاوروں کا سہارا لیکر آگے نہیں بڑھا اور نہ ہی وہ
الفاظ کو طنز پر غالب ہونے دیتا ہے۔ اس کی طنز کا ماخذ
سماجی شعور اور اقتصادی بے انصافیاں ہیں۔ مجھے
فکر تونسوی کے "پیاز کے چھلکے" کو انشائیہ کہنے میں کوئی
گریز نہیں ہوگا۔ اور یہ تو سچ ہے کہ فکر کی طنز برسات
کی وہ ہوا ہے جو پانی میں آگ لگاتی ہے۔ فکر صاحب
کہتے ہیں کہ ایکسیڈنٹ اس واقعہ کا نام ہے جو ہمیشہ اس
وقت ہو جاتا ہے جب آپ پھونک پھونک کر قدم رکھتے
ہیں۔ ان کا طنز بھی کچھ ایسے ہی قسم کا واقعہ ہے جو
پڑھنے والوں کو اس وقت پیش آتا ہے جب وہ پھونک
پھونک کر پڑھ رہے ہوں جیسے شراب کا مارا اس شرابی
کو کہتے ہیں جو شراب پینے کے دوران بھی شراب پیتا رہا۔
فکر صاحب بھی طنز کے مارے ہوئے ہیں وہ طنز لکھنے کے
دوران بھی طنزیہ رہتے ہیں۔ فکر صاحب کے طنز کے خلاف
کسی عدالت میں کوئی ... نہیں۔ ویسے بھی وہ عدالتی

سرمہ کی برکت

ناصر اور شاکر دو بھائی تھے۔ ایک دن دونوں مدرسے سے پڑھ کر گھر آئے۔ کتابیں الماری میں رکھ اپنے ابو کے پاس بیٹھ گئے۔ ابو نے پیار سے پوچھا: "تم لوگوں نے سبق پڑھا؟" شاکر نے کہا: "ابو! ناصر بھائی رات کو سبق یاد نہیں کرتے۔ روز استاد صاحب سے مار کھاتے ہیں۔" ابو ناراض ہو کر بولے: "کیوں ناصر! آپ رات کو سبق یاد نہیں کرتے؟" ناصر منہ بنا کر بولے: "ابو! رات کو مجھے کتاب کے حروف صاف دکھائی نہیں دیتے۔" ——— ابو کچھ دیر سوچ کر بولے: "اچھا بیٹے! میں بخشی کا سرمہ نورِ نظر لا دوں گا۔ تم رات کو سوتے وقت روزانہ لگا لیا کرنا۔"

——— دوسرے دن ابو سرمہ لے آئے۔ ناصر خوش ہوئے اور روز رات کو شوق سے سرمہ لگانے لگے ...... ابھی چار روز ہی گزرے ہوں گے کہ ناصر کو صاف دکھائی دینے لگا۔ ناصر اب دل لگا کر سبق یاد کرتے۔ صبح وقت پر مدرسہ جاتے۔ استاد صاحب کو سبق ٹھیک ٹھیک سنا دیتے۔ استاد صاحب خوش ہوتے اور شاباشی دیتے۔ دن گزرتے گئے۔ ناصر شاکر سے آگے بڑھ گئے۔ اب شاکر کو فکر ہوئی کہ ناصر مجھ سے آگے کیسے بڑھ گئے؟ ایک دن شاکر نے پوچھ ہی لیا: "ناصر بھائی! آپ زیادہ سبق کس طرح یاد کر لیتے ہیں؟" ناصر نے کہا: "بات یہ ہے کہ سرمہ نورِ نظر لگانے سے مجھے رات کو صاف دکھائی دیتا ہے۔ سبق یاد کرنے میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔ جتنا بھی سبق ہو یاد ہو جاتا ہے۔" ——— رات کو جب ابو گھر آئے۔ شاکر دوڑتے ہوئے ابو کے پاس گئے۔ اور کہا: "ابو! میرے لئے بھی بخشی کا سرمہ لا دیجئے۔ اس سرمہ کے لگانے سے سبق زیادہ یاد ہوتا ہے۔" ابو ہنس کر بولے: "اچھا بیٹے! لا دوں گا!"

بی۔ جے۔ پریمی

منٹو کی دو کہانیاں

ایک اجمالی مطالعہ

منٹو کا بنیادی موضوع انسان اور اس کی فطرت ہے۔ ان کے افسانے نہ سیاسی پروپیگنڈا ہیں نہ صحافتی رپورٹنگ۔ وہ شاعری بھی نہیں کرتے نہ الفاظ کا طومار لگاتے ہیں۔ وہ انسان کی نفسیات، اس کی جبلی خواہش، اس کی محسوسات، اس کی نیکی اور بدی، ملمع چڑھائے بغیر اپنی اصلی اور فطری ہیئت میں انسان کے وجود کو بے نقاب کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کے واقعات ہوں یا فسادات کی غارت گری وہ انسان کا مطالعہ پیش کرتے ہیں اور مختلف حالات میں اس کے عمل اور ردعمل کی تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی ساری کہانیاں فنی اعتبار سے شاہکار کی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن پھر بھی ایسی کہانیوں کی تعداد کافی ہے جن کے آئینے میں انسان کی روح کے چہرے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی افسانوں میں "۱۹۱۹ء کی ایک بات" اور "سوراج کے لئے" شامل کی جا سکتی ہیں۔

"۱۹۱۹ء کی ایک بات" میں بنیادی قومیت اور وطنیت ہے۔ جلیان والا باغ کے خونیں حادثے کے پس منظر میں ایک تاریخی واقعے کو اثر انگیز افسانے کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ تاریخ وقوع پذیر واقعات کی تصویر ہے اور ادب میں ایسے واقعات کی تصویر کشی کوئی نئی بات نہیں لیکن وا ایسے ہوں جو ممکن الوقوع ہوں۔ ہندوستان کی تحریک آزا میں جلیان والا باغ کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو نے بے مثال فنی اور طباعی سے اس واقعہ اور اس سے جڑے ہوئے دوسرے واقعات کو افسانے کے قالب میں ڈ

منٹو نے اپنی بعض کہانیوں میں اپنی ذات کو بھی شامل کیا ہے اور اس طرح وہ افسانے کا ایک کردار بھی بنتا ایسی کہانیاں بیانیہ ہوتی ہیں اور ان میں منٹو کی ذات شامل ہو جانے سے ایک سوانحی انداز آ جاتا ہے۔ تکنیک کا یہ تجربہ منٹو کو پسند تھا۔ "۱۹۱۹ء کی ایک بات" بھی کہانی ہے۔ یہاں منٹو واحد متکلم کے نقطے سے سا کہانی پیش کرتا ہے۔ وہ ریل کے سفر کے دوران ایک سے باتیں کرتا جاتا ہے۔ اس کی باتوں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ واحد متکلم جذبۂ حب الوطنی سے معمور یہ تاثر وہ قارئین میں بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو ہے۔ زبان اور [illegible] کردار نگاری اور [illegible] نے اس تاریخی واقعے کو افسانہ بننے [illegible] افسانہ بیانیہ ہے لیکن اس میں کہیں کہیں منٹو نے بعض جگہ

یہ جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ افسانے کا انجام فطری
ہے۔ ایک خاص ماحول میں پلے ہوئے کرداروں کے فطری انداز
کو پیش کیا گیا ہے حالانکہ اس انجام کے لئے قاری ذہنی طور
پر تیار نہیں۔ اس کا انجام در اصل واحد متکلم کے ذہن کی
[illegible] کیوں کہ وہ اس واقعے کا عینی گواہ ہے۔ پنجاب
[illegible] ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر سیف الدین کی جلاوطنی اور اس کے بعد
انگریزی مظالم کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے جذبۂ انتقام
کی عکاسی کرتے ہوئے منٹو نے ایک طوائف زادے تھیلا
کنجر کے ردعمل کو بیان کیا ہے۔ تھیلا کنجر سماج کے بدنام طبقے
کا نمائندہ ہے۔ لیکن گوری فوج کے مظالم کے خلاف اس کا
جذبۂ انتقام ابھرتا ہے اور وہ ایک پر جوش ہجوم کی رہنمائی
کرتے ہوئے انگریز سوار فوج کے ایک دستے پہ ٹوٹ پڑتا
ہے اور انگریزوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر شہید ہو جاتا ہے۔
تھیلے کی دو بہنیں الماس اور شمشاد طوائفیں ہیں اور
گانے بجانے میں کوئی ان کا مد مقابل نہیں۔ انگریز افسر
تھیلے کا انتقام لینے کے لئے دونوں بہنوں کو ایک محفل
میں بلاتا ہے اور گانے کا حکم دیتا ہے۔ دونوں عورتیں
اپنے رنج و الم کو سمیٹے محفل میں شریک ہوتی ہیں اور ناچتی
[illegible] کے بعد کیا ہوا واحد متکلم اسے یوں بیان کرتا ہے۔

"انھوں نے اپنی زرق برق پشوازیں نوچ
ڈالیں اور الف ننگی ہوگئیں اور کہنے لگیں۔
"لو دیکھ لو ــــــ ہم تھیلے کی بہنیں ہیں۔
اس شہید کی جس کے خوب صورت جسم کو تم نے
صرف اس لئے گولیوں سے چھلنی چھلنی کیا تھا
کہ اس میں وطن سے محبت کرنے والی روح
تھی۔ ہم اس کی خوبصورت بہنیں ہیں۔ آؤ
اپنی شہوت کے گرم گرم لوہے سے ہمارا خوشبوؤں میں بسا
ہوا جسم داغدار کرو مگر ایسا کرنے سے پہلے ہمیں صرف
ایک بار اپنے منہ پر تھوک لینے دو۔"

لیکن واحد مخاطب کے کہنے پر کہ اس داستان کا انجام
خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے
وہ کہتا ہے:

"جی ہاں ـــ ان حرامزادوں نے ... گالی
دیتے دیتے رک گیا۔ انھوں نے شہید
بھائی کے نام پر بٹہ لگا دیا۔"

منٹو نے واحد متکلم کی زبان سے صرف ایک فقرہ ادا
کر کے اس عمارت کو اچانک ڈھا دیا ہے جو اس سے
پہلے تھیلا کنجر کی بہنوں کے ردعمل سے پیدا کیا تھا۔ یہ غیر معمولی
انجام قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور غور و فکر
کی نہج اچانک بدل جاتی ہے جو خانہ [illegible] نہیں بلکہ جس سے
ایک نئی سمت کھل جاتی ہے۔ کہانی میں صرف جد و جہد آزادی،
تھیلا کنجر کا رول، الماس اور شمشاد کا ردعمل جو شروع میں
بیان کیا گیا اہم نہیں ہے۔ اہمیت تو اس حصے کو بھی
حاصل ہے جو اس کے انجام میں کھلتا ہے کہ شمشاد اور الماس
بھائی کے شہید ہونے کے باوصف رقص کرنے پر مجبور ہوتی ہیں
یہاں کوئی شائستگی کوئی غیر فطری انداز نہیں ملتا۔ واحد
متکلم کا ایک فقرہ کتنا بلیغ ہے۔ اور معنی کے سمندر چھپائے
ہوئے ہے جو زبان حال سے ظلم و ستم کی اس داستان
کا اظہار کرتا ہے جب زبان پر تالے لگے ہوتے تھے
منٹو نے اپنے انداز میں افسانے کو موڑ دیا ہے اور
افسانہ عامیانہ نہیں بن پایا۔

"سورج کے لئے" بھی اسی طرح کا ایک نیم سیاسی

افسانہ ہے۔ افسانے میں ایسی فضا تیار ہوتی ملتی ہے جب
آزادیٔ وطن کے لئے ہندوستان کے بیٹے بڑی سے بڑی
قربانی کے لئے تیار ہے۔ نعرے، میلے، جلوس، بدیسی کپڑوں
کا بائیکاٹ، انقلابی سرگرمیاں، والنٹیروں، کانگریس کا
ترنگا، گرفتاریاں، لوگوں کی بے لوث قربانیاں ——
ان سب باتوں کا بڑی نفاست سے احاطہ کر لیا گیا ہے،
لیکن اسی کے ساتھ انسان کی فطرت اور انسانی زندگی
کی پیچیدگیاں بے نقاب کی گئی ہیں۔ سیاسی پس منظر بھی
جوڑ دی گئی ہے۔ کانگریس کی سیاسی تحریک کے پس منظر میں
ایک ڈکٹیٹر غلام علی اور اس کی والنٹیر محبوبہ نگار کے
عشق کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ غلام علی اپنے لیڈروں
کے اثر انتہائی جذباتی بن کر شادی کے وقت اعلان
کرتا ہے :۔

"میری اور نگار کی شادی اسی قسم کی آدرش
شادی ہوگی جب تک ہندوستان کو سوراج
نہیں ملتا۔ میرا اور نگار کا رشتہ بالکل
دوستوں جیسا ہوگا۔"

اس طرح سے غلام علی سوراج ملنے تک بچہ پیدا نہ
کرنے کی قسم کھاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر فطری
فعل کا اعلان ہے۔ اس کا احساس غلام علی کو اس وقت
ہوتا ہے جب وہ جیل سے آزاد ہو کر باہر نکلتا ہے اور قومی
تحریک میں جوش و خروش نہیں رہتا۔ اس کے سنگی ساتھی
اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے ہیں۔ غلام علی اپنی بیوی کے
ساتھ رہ کر بھی اس کے لئے غیر ہے۔ دونوں اپنے عہد
کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور اندر ہی اندر کڑھ
رہے ہیں۔ غلام علی کے ردِ عمل سے قطع نظر نگار کا ردِ عمل
مختلف ہے۔ گلی میں جب بھی کسی کے ہاں بچہ پیدا
ہے تو وہ چھپ چھپ کر آہیں بھرتی ہے۔
غلام علی مذہب کا سہارا لیکر ایک حدیث کی
میں اپنی بے حس زندگی میں حرکت محسوس کرنے لگتا۔
اور دیکھا کرتا ہے جو ایک شادی شدہ مرد کو کرنا چا
وہ دو بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ بیوی پاس ہو
کے باوجود اس کے ساتھ پیار و محبت نہ کر سکنے
غلام علی کے اعصاب میں جو تشنج پیدا ہوتا ہے
اطلاق وہ اپنے دعوے پر کرتا ہے جو اس نے جذ
انداز میں آزادیٔ وطن کے لئے کیا تھا اسے محسوس
ہے کہ یہ محض مداری پن ہے۔ فطرت کی خلاف ورز
کرنے سے آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس نفسی
گتھی کو اس افسانے میں کمالِ فن کاری سے کھو
گیا ہے۔ اپنے اعصاب کو اضطرار اور ہیجان سے نـ
دلوا کر غلام علی کے نظریئے میں تبدیلی پیدا ہو جاتی
اور وہ کہتا ہے :

"فطرت کی خلاف ورزی ہرگز ہرگز بہادری
نہیں۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں کہ تم
فاقہ کشی کرتے کرتے مرجاؤ یا زندہ رہو
...... قبر کھود کر اس میں گڑ جاؤ اور کئی
کئی دن اس کے اندر دم سادھے رہنا،
نوکیلی کیلوں کے بستر پر مہینوں لیٹے رہنا،
ایک ہاتھ برسوں اوپر اٹھائے رکھنا، حتیٰ
کہ وہ سوکھ سوکھ کر لکڑی ہو جائے۔ ایسے
مداری پن سے خدا مل سکتا ہے نہ سوراج۔
—— اور میں سمجھتا ہوں ہندوستان

کو سوراج اس لئے نہیں مل رہا ہے کہ یہاں
مداری زیادہ ہیں اور لیڈر کم۔ جو ہیں وہ قوانین
فطرت کے خلاف چل رہے ہیں۔ ایمان اور
صاف دلی کا برتہ کنٹرول کرنے کے لئے لوگوں
نے سیاست ایجاد کرلی ہے اور یہی سیاست
ہے جس نے آزادی کے رحم کا منھ بند کردیا۔"
(سوراج کے لئے)

یہ افسانہ اگرچہ ایک طرف اس جوش وخروش اور
اضطراب کی آئینہ داری کرتا ہے جو ہندوستانیوں کے
دلوں میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اور جس میں ستیا
کے ساتھ روحانیت داخل کردی گئی تھی اور روحانیت
کے راستے پر وہی لوگ گامزن ہو سکتے ہیں جو اس طرح کا
میلان طبع رکھتے ہیں۔ ایک نارمل اور عام قسم کے آدمی
سے آدمی سے ایسی باتوں کی توقع رکھنا جو روحانی نقطۂ
نظر سے اچھی ہوں تو ہوں لیکن فطرت کے تقاضوں کی نفی
کرتی ہوں۔ اس آدمی کو جنونی بنانے کے لئے کافی ہیں۔
ایسی صورتحال میں اس شخص کا ردعمل نفسیاتی لحاظ سے
غیر متوازن اور بگڑا ہوا ہوگا ــــ "سوراج کے لئے"
میں غلام علی اور نگار ان لوگوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے
ہیں جو نارمل ہوکر غیر فطری سوچوں میں الجھ کر رہ جاتے
ہیں اور نفسیاتی لحاظ سے غیر متوازن ثابت ہوتے ہیں۔
ایک نقطۂ نظر سے یہ دونوں تجزیے شکست خوردگی
کی علامت ہو سکتے ہیں لیکن منٹو کے پائے کا فن کار ان
کہانیوں کو عامیانہ بننے سے روک لیتا ہے اور وہ
کہانیاں کے فطری بہاؤ کو روکنے کے گنہگار نہیں بنتے۔
منٹو کا دل بھی جذبۂ حب الوطنی کے جذبات سے معمور
ہے۔ اس لئے وہ اپنے انداز میں اس جدوجہد سے متعلق
اظہار خیال کرتے ہیں اور عوامی جوش واضطراب کی
تصویر کھینچتے ہیں لیکن ان کی لکیریں سیدھی نہیں۔
آڑی ترچھی ہیں ان کے رنگ تیکھے ہیں۔ یہی سبب ہے
کہ یہ دونوں کہانیاں ایک انوکھی سمت میں مڑجاتی
ہیں۔ ان کا انجام ایسا نہیں کہ قاری فارمولائی کہانیوں
کی طرح فوراً ذہن کو گرفت میں لے لے بلکہ ان میں ایسا استعجاب
ہے جو ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور انسان کی بنیادی سرشت
کی تفہیم میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ اسی موڑ پر آکر منٹو
اپنے معاصرین سے امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ ▲▲

جس بے خودی اور دانش مندی اور فنکاری کا طالب ہے وہ خواتین کا حصّہ ہے۔

اردو ناول نگاری کی فنی ابتدا پریم چند کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن پریم چند کے بعد اردو افسانے کا ارتقا جن لوگوں کے ہاتھوں ہوا ان میں زیادہ تر ترقی پسند تحریک سے متعلق ہیں اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اردو افسانوں کو منظم ڈھنگ اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھانے میں ترقی پسند تحریک نے نمایاں رول ادا کیا۔ اردو افسانہ نگاری کے میدان میں بہتیرے مردوں کے ساتھ خواتین بھی ابھریں۔ اس دور کے افسانوں میں جو اصول کارفرما تھے وہ معاشیات اور نفسیات سے متعلق تھے۔ فرائیڈ ہی کی طرح اردو کے نئے افسانہ نگار مارکس اور دوسرے مارکسی مصنفین اور ان کے نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مارکسی مفکرین کی نظر میں انسان کی زندگی کے اہم ترین مسائل معاشی مسائل سے پیدا شدہ حالات اور واقعات ہیں لیکن ۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ان خیالات کو زیادہ فروغ ہوا اور اب بھی بعض افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

نئے افسانوں میں ایک اور اہم موضوع کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس سلسلے میں ماہر نفسیات فرائڈ قابل ذکر ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک انسان کا ردعمل اس کا ہر قول و فعل دراصل بنیادی جبلتوں کا نتیجہ ہوتا ہے، خاص طور پر جذبات اور بالخصوص جنسی جذبات جب دبایا جاتا ہے تو دراصل وہ دبتے نہیں بلکہ تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں اور موقع کے وقت تحت الشعور سے ابھر آتے ہیں۔ جذباتِ انسانی میں فرائڈ نے جنسی جذبات کو اس قدر اہمیت دی کہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ فرائڈ کے نزدیک اوّل زندگی جنسی زندگی ہے۔ بہر حال نئے افسانہ نگاروں نے بہت کھل کر لکھا جن میں عصمت چغتائی کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے عورتوں کی جنسی گھٹن اور جنسی بدعنوانیوں پر قلم اٹھایا اور انھیں چیزوں نے ان کے فن کو انفرادیت عطا کی، انھوں نے اپنے ماحول کو عریاں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک گھریلو اور اخلاقی سچائیاں دراصل جمالیاتی سچائیوں کا ہی عکس ہوتا ہے اور یہ بھی حق ہے کہ زندگی کے دلچسپ ترین حالات گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی پلتے ہیں۔ لیکن عصمت سے قبل اردو افسانے میں سب سے پہلا دھماکہ رشید جہاں نے پیدا کیا۔ ان کے افسانے "انگارے" (افسانوی مجموعہ) میں بھی شامل ہے۔ انھوں نے عورت کے انسانی حقوق کی جھلکیاں اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ ان دونوں خواتین کے درمیان ایک اہم نام اور نظر آتا ہے جو فرخندہ لودھی ہیں۔ جنھوں نے طوائف کی نفسیات کی بہترین عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ بہر حال خواتین افسانہ نگاروں کے درمیان ۳۶ء سے ۴۷ء تک جو مینارۂ نور ہمیں نظر آتی ہے وہ عصمت کی ذات ہے۔ انھیں کے نقش قدم پر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہاجرہ مسرور شروع میں جنسی حقیقت نگار بن کر آئیں اور آخر کار سماجی استحصال اور حقیقت نگاری کی

[illegible] کیا
طرف مائل ہو گئیں - انھوں نے افسانوں کا موضوع احتجاج
قائم کیا - خدیجہ بھی شروع میں عصمت، ہاجرہ کی طرح
اپنے افسانے اور کہانیوں کی ابتدا رحسن و عشق کے
موضوعات سے کی لیکن جلد ہی ان کا شعور عصری مسائل
کو موضوع کے شکل میں قبول کرتا نظر آتا ہے۔

شکیلہ اختر کے افسانوں میں بہار کے مسلمان گھرانوں
کے بدحال اور مظلوم افراد اپنی افسردگی کے ساتھ ابھر
نظر آتے ہیں بلکہ ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو شاید
غلط نہ ہوگا کہ شکیلہ اختر قدیم و جدید اقدار کی حسین
تصویر اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ انکے افسانوی
مجموعے سے پتہ چلتا ہے کہ جدید سے قدیم کی طرف مراجعت
کر رہی ہیں لیکن زندگی کی سچی تصویر کشی دلکش اور
خوشنما انداز میں کرتی ہیں۔

شکیلہ کے بعد ایک اہم نام تسنیم سلیم کا ہے۔
انھوں نے اپنی کہانیوں میں کوئی فنی اور تکنیکی تجربہ تو
نہیں کیا بلکہ خوش گوار زندگی کی آئینہ داری
تک ہی انکی دنیا محدود ہے۔ ان کے بعد... کے
افسانہ نگاروں نے افسانوی روایت کو آگے بڑھایا
جن میں سرلا دیوی، صدیقہ بیگم اور صالحہ عابد حسین قابل
ذکر ہیں [۱]

خواتین افسانہ نگاروں کے اس جائزے سے
پتہ چلتا ہے کہ پریم چند نے اُردو افسانے کو
جس موڑ پر چھوڑا تھا وہاں ادب میں ایک طوفانی
فضا پیدا ہو گئی تھی اور اس فضا میں مردوں کے
ساتھ خواتین بھی ابھریں۔ لیکن خواتین افسانہ نگاروں نے
دو اہم اور بنیادی چیزیں اُردو افسانے کو دی
ہیں، وہ تجسس اور اسرار پسندی کا رجحان ہے۔
یہی وہ فطری اور نسائی اندازِ نظر ہے جس کو ہم
اُردو کے افسانوی ادب میں خواتین افسانہ نگاروں
کی دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس معاملے میں یہ خواتین
مردوں سے بہت آگے نظر آتی ہیں - لہٰذا گھر اور ان
کے اندرونی مسائل، اعلیٰ اقدار کا شعور اور ان
چیزوں سے گہری رغبت اور کامیاب ترین پیش کش،
یہی وہ نسوانی اوصاف ہیں جو افسانہ نگار خواتین
کی نئی نسل کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کرتے
ہیں۔

غرض ۳۶ء سے اب تک جن رجحانات کے پیشِ نظر
افسانوی ادب کی تشکیل ہوتی رہی ہے اور اس میں
خواتین افسانہ نگاروں نے کیا کارنامہ انجام دیا
ہے اس کو اختصار سے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ
افسانوی ادب میں جو پہلا رجحان تھا ہے وہ رومانوی
رجحان ہے، لیکن رومانویت پرست افسانہ نگاروں
میں مختلف سطحیں تھیں جن میں کچھ زبان و بیان کی
مرصع کاری کی لے زیادہ تیز نظر آتی ہے۔ اور سماجی
معنویت کی چنگاری، جیسے ان میں ... دور کی

---

[۱] مذکورہ افسانہ نگاروں کے علاوہ ممتاز شیریں اور قرۃ
العین حیدر افسانے میں یہ دو نام انتہائی اہم ہیں۔ ان
دونوں کا ذکر اُردو افسانے پر مغربی افسانے کے اثرات
کے ضمن میں آ چکا ہے۔

افسانہ نگار آتی ہیں خلاف راشد الخیری اور
کے اسکول سے تعلق رکھنے والی خواتین افسانہ
اس کے بعد دوسرا رجحان حقیقت نگاری کا
میں بھی کئی سطح کے فن کار شامل تھے جنھیں
سے دلچسپی تھی تو دوسری جانب سماجی حقیقت
کا گہرا شعور کار فرما تھا۔ تیسرا رجحان
رکھتے تھے بعضوں نے صرف جنسی تلذذ کو ہی
جانا بلکہ سماجی پابندیوں کو نظر انداز کر کے
ان اور اس کے اعلیٰ صفات تک رسائی
ان کا مقصد حیات ہے۔ چوتھا رجحان
میں ملائیت اور اس کی مختلف کاوشو
ں کو گئی ہے لیکن ان تمام رجحانات سے
جیز نے اردو افسانے کو دوا حیثیت
اور عالمی ادب کے معیار کو پہنچایا۔ وہ
کے زیر اثر ہوا۔ جن میں آسٹن (J.
A) اور گاسکل سر فہرست ہیں۔ ان
تین نے انگریزی ادب میں اس وقت
جب کہ مردوں کی اجارہ داری انگریزی
۔ یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے اوائل
کہ عورت کو صرف جنسی تسکین کا ذریعہ
تا تھا۔ اور مردوں کا مقام اس وجہ کر
س کی حیثیت Bread man
بیات زندگی کی تکمیل تھی لیکن جب عورتو
لم نیا تو مردوں کی دنیا میں ہلچل رہ گئی۔
ن کے ادبی آرٹ پر سوالیہ نشان لگے
نازک کو ایسے ہنگاموں کا اندازہ نہیں

تھا چنانچہ اس کا نتیجہ نیز فائدہ یہ ہوا کہ انگریزی ادب کے قومی افسانوں میں ایک نئی سمت کا اضافہ ہوا۔ اب تک مردوں نے عورتوں کے جذبات کی جو ترجمانی کی تھی وہ غلط ثابت ہوئی۔ عورت نے اپنے معاملات کو اپنے نظریے کے تحت پیش کیا۔ ان لوگوں نے زندگی کو اعتدال کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا اور جنسیات کے معاملے میں جادۂ اعتدال کی راہ اپنائی۔ ان لوگوں نے مردوں کے کردار کے بجائے عورتانہ کردار کی تصویر کچھ اس طرح پیش کرنی شروع کی۔ جس میں Emotional اور Temperament کی جھلک نمایاں ہے۔ اور اب مردوں نے بھی اس اعتدالی نقطۂ نظر کو قابلِ تقلید سمجھا۔ آہستہ آہستہ عورتیں ادبی دنیا پر چھاتی چلی گئیں جیسے Broad WOMEN ENTEREST نے Broad MARKET کہہ کر پکارا ہے۔

بقیہ: طنز و مزاح

لطیفہ ہے، میں نے بھی کہیں سے سنا تھا آگے کر دیا۔ آپ بھی آگے کر دیں۔" عبدالغفور صاحب اردو ادب میں آگے کرنے کی رسم کو کافی آگے کیا ہے۔

اردو میں پیروڈی بھی ہے جس نے اردو طنز کو کافی پیچھے کیا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اردو میں طنز و مزاح زندہ رہے گا۔ ہماری مشترکہ کلچر کی طرح، ہماری تہذیب کی طرح۔

ڈاکٹر سراج بہادر گوہر

اختر سعید خان: اسیرِ زلفِ شب بادہ

اس غم کے دکھی ماحول میں ایک "سکونِ لمحہ" بھی بہت غنیمت ہے اور ایک "اہلِ دل" اور "روشن دماغ" شاعر اسی کی تلاش میں رہتا ہے۔ اختر سعید خان ایسے ہی ایک "سکونِ لمحہ حاصل" کی جستجو میں شعری سفر کر رہے ہیں۔ جن کے راستے میں "منزلیں ہی منزلیں" ہیں۔ وہ ایک "منزل" پہ پہنچ کر دوسری کی طرف چل پڑتے ہیں۔ "نگاہ" ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ بلکہ انتخاب ہے۔ (۱۰۸) غزلیں اس میں شامل ہیں اور ۲۸ متفرق اشعار۔ پہلی ہی نظم ایک نعت ہے۔ حج کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اور "یہاں" "درِ رسول پر" یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

مزہ تو جب ہے کہ میں تجھ سے مانگ لوں تجھ کو
پھر اپنے جذبۂ گستاخ کی سزا مانگوں

شعر چونکا دیتا ہے اور قاری کچھ گم سا ہو جاتا ہے۔ انگریزی کے ایک شاعر نے کہا تھا کہ جب خدا اپنی تخلیق کو مختلف اوصاف تقسیم کر رہا تھا، کسی کو عقل و فہم دی، کسی کو حسن دیا، کسی کو دولت و ثروت دی، ایسے میں بہ ناز کہیں باغ میں محوِ تفریح تھا۔ جب شاعر خدا کے حضور میں آیا، تب تک خدا سب کچھ بانٹ چکا تھا۔ اب اس کے پاس دینے کو سوا کچھ نہ تھا۔ مگر کچھ تو دینا ہی تھا۔ خدا نے کہا: "میرے پاس کچھ تو نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتا ہوں"۔ یہی تو وہ منزل ہے جہاں شاعر کے قلم سے نکلا ہوا کلام "تلمیذِ رحمانی" کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اختر سعید اپنے "حسنِ طلب" کو "جذبۂ گستاخ" کہہ کر اپنی معصومیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ان کے اس شعر سے ذہن ٹال کے ایک شاعر انگاوا اچگر کے اس قسم کے ایک شعر کی طرف رجوع ہوتا ہے جہاں شاعر کہتا ہے "اور خدا! میں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کر دیا اور معاوضہ میں تجھے پالیا۔ بتا ہم دونوں میں زیادہ ہشیار کون ہے؟"

اختر کے زیرِ نظر کلام میں "کانٹے" اور "شعلے"

دو شعر میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے

اختر یہ تیرے پاؤں کے کانٹے نہیں
کانٹوں سے کھیلتا ہوا چھالا عجیب ہے

اے دشتِ جنوں گواہ رہنا
کانٹے ہیں اور اک برہنہ پا ہے

یعنی آرائی تھی جس گل کا شیوہ
مژدہ راہوں میں کانٹے ہو گیا ہے

کب بادِ صبا آئی، کب گل کا پیام آیا
ٹوٹا جو کوئی چھالا کانٹوں کا سلام آیا

کانٹوں کی خلش سے ہر لحظہ پھولوں کی طلب بڑھتی ہی گئی
صحرا سے گزر کر دیوانہ نزدیکِ گلستاں آ ہی گیا

دیکھئے "کانٹے" کتنے روپ میں اختر کے کلام میں آتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں پیر کے چھالے کانٹوں سے کھیلتے ہوئے ہیں۔ کانٹوں کے وجود کی شہادت میں وہ اے دشتِ جنوں کو پیش کرتے ہیں۔ اور جنونِ عشق کے بغیر یہ سفر ممکن نہیں۔
وہ پھول جن کے ذمہ میں آرائی تھی وہی راہ میں کانٹے ہو گئے۔
پھر کانٹوں کی خلش سے پھولوں کی طلب اور بھی بڑھ جاتی ہے اور شوقِ تلاش و جستجو کے صحرا سے گزر کر منزلِ مقصود کے گلستاں کے نزدیک آ ہی گیا۔

یہاں کانٹے حوصلہ شکن نہیں بلکہ ہمت افزا بن جاتے ہیں۔
اختر "لمحوں" سے کیوں کر کھیلتے ہیں؟ ملاحظہ فرمائیے:

مبارک خضر کو لطفِ حیاتِ جاوداں اختر
محبت کی حیاتِ مختصر کچھ اور ہوتی ہے

پلک جھپکتے ہی ہر لمحہ نقشِ ماضی تھا
سکونِ لمحۂ حاصل مجھے ملا ہی نہیں

پروردگار حوصلۂ یک گناہ دے
دم گھٹ رہا ہے عشق کو توفیقِ آہ دے

اجل کے سینے میں جیسے رہا ہے خزاں کے دل میں کھٹک رہا ہے
وہ اک لمحہ اٹھا لیا ہے جو ہم نے کھلتی ہوئی کلی سے

وہ زندگی تھی آپ تھے یا کوئی خواب تھا
جو کچھ تھا ایک لمحے کو بس سامنا ہوا

وہ ایک لمحہ جو میری گرفت میں نہ آسکا
لئے حیاتِ جاوداں قریب سے گزر گیا

دیکھئے "لمحہ" اختر سعید کی فنکارانہ چابکدستی سے کیا کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ خضر کی عمرِ حیاتِ جاوداں کے مقابلہ میں محبت کا ایک لمحہ کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔ "سکونِ لمحۂ حاصل" کی آرزو کیسے کشمکشِ حصولِ تمنا کے لئے حوصلے عطا کرتی ہے۔ کلی چٹکنے کا ایک لمحہ

انداز سے اپنا لیا
موت اور غم زماں کے لیے کس قدر حوصلہ شکن
ہوتا ہے ؟
اور پھر ایک لمحے کا سامنا کس کا تھا۔ زندگی
کا محبوب کا یا پھر اللہ جانے کا کوئی سپنا تھا لیکن
یہ کیا ہر دو کو سبھی ہر ہوس کو طلب پہ بس ہوا تھا۔
اختر کے پاس غم دل اور غم جہاں ایک ہی تصویر
کے دو رخ ہیں۔ خود اپنے اصول اور اپنی کائنات
کا ایک ایسا تجزیہ ہے جہاں مجبوری سے محل کی تشکیل ہوتی
ہے اور کل عشق کی ساری کیفیات پر حاوی ہوتا ہے۔

یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غم دہر کی صورت
دل نے تصویر سے تصویر اتاری ہوگی

غم جہاں میں غم دل شمار ہو کے رہا
یہ فیصلہ بھی مگر سوئے دار ہو کے رہا

فکر و فن جاگ اٹھے لوح و قلم جاگ اٹھے
زندگی جن سے عبارت ہو وہ غم جاگ اٹھے

اسی لیے کا دارا اختر کے پاس "تمنا" ہے یہاں
ان کا فکری رشتہ غالب کے "نشاطِ آرزو"
سے مل جاتا ہے ؎

نیرنگی نشاطِ تمنا عجیب ہے
کچھ خامشی سے تفسیر آیا تو عجیب ہے
ہر خواب التفات نگاہ سے جو ہے
دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے

اک مدت تک حسرتِ آرزو کرتے رہے
کچھ زمانے کی کچھ اپنی گفتگو کرتے رہے

چند ذرے دل کے رقصاں ہیں فضاؤں میں ابھی
لاؤ ان ذروں میں حشرِ آرزو برپا کریں

اگر شاعر "قفس" کو اپنا "مقدر" مان لے اور
قنوطیت کا شکار ہو جائے۔ اور یہی قنوطیت زندگی
کی طرف اس کا رویہ بن جائے تو وہ "فانی" ہوگا۔
اگر اسے (۳) "قفس" کی تیلیوں سے کچھ امید کا
نور جھلکتا نظر آئے اور اس کے اندر حسرت پیدا ہو جاگ
اٹھے تو وہ فراق کی منزل میں داخل ہوگا۔
اور اگر شاعر نے قفس میں جو "طرز فغاں" ایجاد
کی ہے وہ باہر کی دنیا میں مصروف انسانوں کا ہم آہنگ
سا ہنگ بن جائے تو پھر وہ فیض کی سرحدوں میں پہنچ
جائیگا۔
اختر فراق سے شروع ہوتے ہیں اور فیض کے
دور میں اپنے شعری شباب پر پہنچتے ہیں۔ اس
لئے ان کے تیور یوں لکھے ہیں ؎

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی
رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی

یہ شمع رہ گزر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں
تو وہاں نہیں رکتے چراغِ فکر و فن اختر
پھر کیوں نہ ہوا کے جلو دیتا
شمعِ سرِ راہ گزار دیا ہم نے!

چمن پہ جسم بٹھا لیا تھا سکوں لینے کو
مگر پھولوں نے ہنس ہنس کر بدل ڈالا زمانے کو

بلائے تیرہ شبی کا جواب لے آئے
بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے

میں وہ رہرو ہوں کہ ہر موڑ پہ منزل کی طرف
پہلے میں بڑھتا ہوں اور راہنما میرے بعد

[و]قت کے سنگین پہرے سے اک عزم جواں ٹکرا ہی گیا
[ع]مر کے بالآخر انساں کو جینے کا سلیقہ آ ہی گیا

"ملک آزاد تو ہوا لیکن وہ سکونِ قلب حاصل" [جس] کی تلاش تھی ابھی نظروں سے اوجھل ہے اختر [ک]ہتے ہیں ؎

میں نے سنا تھا سورج نکلے ڈھل جاتی ہے رات
میں نے دیکھا صبح بھی نکلی رات کی پہرے دار

یہ دن بھی صبحِ حشر سے نہیں ہے کم کسی طرح
مگر جو ہم نے کاٹ دیا وہ بات کچھ اور تھی

سحر ہوئی تو حاصل یہ تھا شبِ امید کا
جو اعتبار تھا گیا جو انتظار تھا رہا

نشاطِ حوصلہ مند ہے ؎

اندھیاروں کے تیور ہر موڑ پہ گو کمیں تھے لیکن
کلیوں نے چٹکنا سیکھ لیا پھولوں کو مہکنا آ ہی گیا

ادھر سے بھی گزر جا اے بہارِ زندگی یکدن
دیارِ ہند میں آباد ویرانے ہزاروں ہیں

جب کبھی بڑھتا ہے اندھیرا سوئے دل
یہ چراغ اور بھی لَو دیتا ہے

ہمسفرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

یہ زمانہ مجھے جب زخم نیا دیتا ہے
اک چراغ اور بھی سینے میں جلا دیتا ہے
حوصلے دل کے بہت عشق بڑھا دیتا ہے
جو بھی غم دیتا ہے وہ قوت سے سوا دیتا ہے

یہ "منزلِ عشق" نہیں "عشقِ منزل" ہے جو انسان کو سکونِ ممکن الحصول کی طرف بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔
اختر دیکھتے ہیں کہ ان کے ہم وطن کچھ سوئے سوئے سے ہیں۔ کہیں وہ ایسی منزل پہ تو نہیں جہاں وہ غمِ دنیا آسودگی کے عادی ہو گئے ہیں جہاں افلاس کی ٹھوکروں نے انھیں گراوٹ کی اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں پریم چند کی کہانی "کفن" کے کردار پہنچ گئے تھے۔
پھر اختر کے سینے میں نشاطِ آرزو انگڑائی لیتی ہے اور وہ اپنے عزیز وطن سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

تو گلشنِ خوابیدہ ہے ویرانہ نہیں ہے

بلندی سے ہماری قامت دیکھنے والو!
بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں

اختر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی زبان میں عصری حقیقتوں کو فنکارانہ انداز سے بیان کرنے کے گر سے واقف ہیں اور غزل کو یہی تو ترقی پسند دور کی دین ہے۔

پھر بھی غزل کے اپنے رومانی تیور بھی ہیں جو غزل کو ایک روایتی عظمت دیتے ہیں یہاں بھی اختر اپنا مقام رکھتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے ؎

آثار اچھے نہیں شب ہجر
دل کو کچھ کچھ قرار سا ہے

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمہاری یاد ہے سائے ہیں یا تم ہو

پتہ ایسا تو مشکل سے کبھی ملتا ہے موسم کا
جنوں دیوانے سے ملتی ہے خبر کچھ دور ہوتی ہے

ہوئی جب بات تو اشکوں سے جگمگا اٹھی
جو آئی شام تو یادوں سے مشکبار آئی

کسی کے ہاتھوں بک جائے لیکن دام ہی معلوم نہیں
دل کی قیمت دونوں عالم دل کی قیمت ایک نظر

مدت سے لاپتہ ہے خدا جانے کیا ہوا
پھرتا تھا ایک شخص تمہیں پوچھتا ہوا

شاید چمن میں جی نہ لگے لوٹ آؤں میں
صیاد رکھ قفس کا ابھی در کھلا ہوا

ہوئے جب وہ پرسانِ غم سو گئے ہم
جہاں جاگنا تھا وہیں سو گئے ہم

کچھ تیرے ساتھ زندگی گزری
کچھ تیری یاد میں گزاری ہے

بچا بھی لائیں ہم جلوہ گاہِ جاناں سے
یہ چوٹ کھائی ہوئی زندگی کہاں کرنے

غرض یہ ہیں اختر سعید خاں، بھوپال کی جان اور اردو کی آبرو — ہر وہ رنگ جو حسین ہے وہ انکی تصویر میں محفوظ ہے۔

رنگِ غم، رنگِ تباں، رنگِ جبینِ محنت
جو حسیں رنگ ہے شامل مری تصویر میں ہے

پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج۔ پٹنہ ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ۔ گیا سے شائع کیا

ترقی اور خوشحالی کا نیا آیام

پچھلے ایک سال کی مدت میں ترقی اور خوش حالی کی طرف بہار تیز رفتار سے گامزن ہوا ہے۔ یہ ہیں کچھ ٹھوس حقائق: سینچائی: بڑی کروں، پمپ سیٹوں اور سینچائی یوجناؤں کے ذریعے ۱،۰۷،۹۷۱ ہیکٹر میں اضافی سینچائی کا انتظام کیا گیا ہے۔ بجلی: ۳۲۲۷.۶۰ ملین یونٹ بجلی پیدا کیا گیا۔ ۲،۲۷ گاؤں کو ملی ہوئی بجلی۔ ۳۲،۴۹۰ پمپ سیٹوں کو بجلی سے جوڑنے کا کام پورا کیا گیا۔ گاؤں کی ترقی: سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت ۳،۲۲،۴۳۰ خاندان کو فائدہ پہنچایا گیا۔

ملحق گرامین نیوجن پروگرام کے تحت ۳۸۳.۰۹ لاکھ اور گرامین بھومی ہین نیوجن گارنٹی پروگرام کے تحت ۱۴۴.۰۰ لاکھ شرم دیوس کی منظوری دی گئی ہے۔ صنعتی ترقی: سنگل ونڈو سسٹم کی منظوری دی گئی تاکہ صنعت کاروں کے مسائل کا حل ایک ہی جگہ پر ہو سکے۔ تعلیم: ۲،۳۴۰ آنگن باڑی مراکز اور یسلی کا قیام عمل میں آیا۔ ۶ لاکھ ۵۲ ہزار بچوں کا نام لکھایا گیا۔ ۸ ہزار ٹرینڈ ٹیچروں کی بحالی کی گئی۔ ہیلتھ: ۳،۶۱،۶۱۱ لوگوں نے پریوار کلیان یوجنا کے تحت بندھیاکرن کروایا۔ کوآپریٹو: الگ کالین، مصری کالین اور دیگر کالین پرجناؤں کے مل میں ۲ کروڑ روپیے کی رقم تقسیم کی گئی۔ گاؤں میں پانی کی سپلائی: ۸۳۰۲ گاؤں میں پینے کے پانی کا انتظام کیا گیا۔ سپلائی اور جن وترن: صوبے کے پہاڑی اور آدی باسی علاقوں میں ۳۰ چلتی پھرتی دکانیں کھولی گئیں۔ بھومی سدھار: الپ سنکھیک جاتی، انوسوچت جن جاتی اور کمزور طبقے کے لوگوں کے بیچ ۱۹۲۰۷۱ ایکڑ زمین بانٹی گئی۔ جنگل وکاس: ۱۵.۲۳ کروڑ پودے لگائے گئے اور ۱۳۳۱۸ بایو گیس پلانٹ لگایا گیا۔ سماجی اور بال کلیان: ۱۲،۵۱۳ آنگن باڑی مرکزوں کے ذریعے ۴۰۰،۹۹،۹ بچوں اور ۲،۲۷،۷۰۰ عورتوں کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ سڑکوں کی تعمیر: ۵۰۰ سے زیادہ کی آبادی والے ۲۵۰ گاؤں اور ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ کی آبادی والے ۲ گاؤں پکی سڑکوں سے جوڑ دیے گئے ہیں۔

محکمہ تعلقات عامہ بہار

[illegible] 114 [illegible] (85) 86-87

آج ہم نے بہت ارتقا اور سائنسی ترقی کی باتیں
کرتے ہیں عجیب عجیب پیچیدہ آلات و ایجادات
سے متاثر ہیں۔ ریڈیو اور راکٹ کو موضوع بنا
رہے ہیں لیکن سماجی زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی
سچائیوں کو بھولتے جا رہے ہیں جو ہماری نجی اور اجتماعی
زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جناب اور مسز ارمان
کی کہانیوں میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی لیکن اہم سچائیاں
ہیں۔ وہ چونکہ دلِ درد مند کے مالک ہیں اس لئے
بالعموم انہوں نے ادارتی مجبوریاں، استحصال اور
شکست و ریخت کو موضوعِ فن بنایا۔ ... ان کی
کہانیاں ضمیر فروش، محنت و عبادت، انسان کا
دل، نیم حکیم، اور مسز ارمان بہت سی کہانیاں جذبۂ
محبت و مؤانست اور ... کو ابھارتی
ہیں۔ گویا ارمان ہمیں وہ دولت دینا چاہتے ہیں
جس کی اس وقت انسانی برادری کو سب سے
زیادہ ضرورت ہے۔ ان کے افسانوں کا Text-
ure سادہ اور اپنے موضوع کے مطابق ہے
یعنی جس سادہ اور حقیقی زندگی کے پہلوؤں کو
وہ اجاگر کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ان کا اسلوب
بھی ان کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔

ارمان کی زبان کرداروں اور ان کے ماحول
کی زبان ہے اور کہانی کے فن میں اس باریکی کو
(حالانکہ یہ کوئی ایسی باریکی کی بات بھی نہیں ہے
بلکہ سامنے کی بات ہے) ہمارے اکثر فن کار
بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنی زبان استعمال کرتے
ہیں۔ ارمان کی کہانیاں ہمیں اس حقیقت سے
بھی اپنے نزدیک کرتی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے جناب ارمان کا فن انسان
اور اخلاقی اقدار کی خوبصورت تعبیر ہے۔ آرٹ
کو زندگی سے کتنا قریب ہونا چاہئے اور کتنا دور
۔۔۔ اس کا صحیح تناسب تو نہیں نکالا جا سکتا
اس لئے کہ اس کا تعلق treatment سے بھی
خاص ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب اور
مسز ارمان آرٹ اور زندگی کی اکائی پر یقین
رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے سامنے قاری کے فقدان
کا مسئلہ بھی نہیں اٹھ سکتا۔

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
HAJI A. RAHIMKHAN & SONS
HOWRAH
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے۔آر۔ چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجئے

Regd. P. & T. Gay-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 21573

و

" Good literature cannot be produced 'to order.' But we aim at creating those conditions for our writers which help them in their work. Through mutual criticism and just appreciation, by inducing our writers to study closely the life of our people a suitable milieu is to be created for the new literature of India to grow and to flourish."

— Sajjad Zaheer

TRADE JRI MARK
JANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اورمضبُوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE·44 22 22
JANTA RUBBER INDUSTRIES
66 H/4 TILJALA MASJID BARI LANE CAL

جی ہاں! آنکھوں کی حفاظت کے لئے سرمہ سب سے اچھی چیز ہے۔ لیکن جب ضامن ہو حفاظت کا۔ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں دو اعلیٰ قسم کے ایکرڈ فائنڈ سرمے
سرمہ نور علی نور
آنکھ مارکہ
۵۰۰
سرمہ اصلی ممیرہ
گینڈا مارکہ
۲۰۰
REGD
REGD
آنکھوں سے پانی گرنا۔ دھندلاپن۔ کچا موتیا بند۔ رتوندھی۔ جالا۔ ماڑا۔ پھولا کے لئے جادو اثر
ہر جگہ دستیاب ہے
تیار کردہ: حکیمان محمد اسرائیل محمد علی صاحبان
فینسی مراد آبادی مین اسٹورس
۱۳۵/ پارک اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱۶

جگمگاتی سفیدی کیلئے
موڈی
دھلائی کا صابن
MODI
WASHING SOAP
موڈی
پنجاب سوپ فیکٹری

آزادی کی ۳۹ ویں سالگرہ؟

آزاد ہندوستان کے ۳۹ سال گذر گئے۔ یہ کوئی چھوٹی مدت نہیں ہے۔ اس لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو جن لوگوں نے انگریزوں کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور حاصل کی تھی ان سے جواب طلب کیا جانا چاہئے۔ ان سے پوچھا جانا چاہئے کہ شہروں کی تو ترقی ہوئی ہے لیکن گاؤں میں اب تک اندھیرا کیوں ہے؟ ان شہروں میں بھی عالی شان جگمگاتی عمارتوں کے پیچھے اندھیری گندی بستیاں کیوں ہیں؟ اجارہ داروں اور سرمایہ داروں کی جائیداد میں سینکڑوں گنا اضافہ ہوا مگر آدھی آبادی غریبی کی سطح سے نیچے کیوں ہے؟ صنعتی ترقی میں ہمارا ملک اونچے پوزیشن پر پہونچ تو ضرور گیا ہے لیکن کل کارخانوں کی بندی اور بیماری سے بے روزگار لاکھوں مزدوروں اور ان کے بال بچوں کے لئے بھوک سے تڑپنے کے لئے چھوڑ کیوں دیا گیا ہے؟ سائنس دانوں اور ٹیکنیشینوں کی تعداد میں تو ہمارا ملک دنیا میں سوویت روس اور امریکہ کے بعد تیسری جگہ پر پہونچ گیا ہے لیکن ہمارا اگریکلچر بیل اور موسم کی مہربانی پر منحصر کیوں ہے؟

ایسا کیوں ہے کہ ملک کی دو تہائی آبادی آج بھی جاہل ہے جبکہ آئین کے مطابق پندرہ سال کے اندر جہالت ختم کرنی تھی۔ ایسا کیوں ہے کہ گاؤں میں غریبوں اور مزدوروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹا جاتا ہے؟ ان کی بہو بیٹیوں کی عزت کھلے عام لوٹی جاتی ہے۔ ان کی بستیوں کو جلا کر خاک کر دیا جاتا ہے۔ کرپشن کا بول بالا کیوں ہے؟ غنڈوں کی الگ حکومت کیوں ہے؟ بہوئیں کیوں جلائی جاتی ہیں؟

کون دے گا ان سوالوں کا جواب؟

اگر یہی آزادی ہے تو اس سے ہزار گنا بہتر ہم غلام تھے۔

—— جمیل مظفر سنبھلوی

[illegible]
[illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد کی انشائیہ نگاری

مولانا آزاد کا تخلیقی جوہر ہمہ جہت ہے۔ ان کا نثری اسلوب کئی صنفی شعبوں پر محیط ہے۔ ان کے یہاں انشا کی کھلی اور آزاد ترنگ بھی ملتی ہے، جو کیف و سرشاری کا پیدا کرتی ہے۔ ان کے اسلوب کا یہ رنگ اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں ان کا مد مقابل کوئی نہیں۔ وہ خیالات کی اڑن طشتری پر نادیدہ دنیاؤں کی سیاحت کرواتے ہیں اور ان کے قارئین ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔ مولانا کی نثری تحریروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی شخصیت کئی [illegible] میں بٹی ہوئی ہے۔ انہوں نے مقالے، مضامین لکھے، انشائیہ پردازی کے جوہر بھی دکھائے۔ اور انشائیہ کی طرز کے [illegible] جو اگرچہ ایک ہی پیڑ سے پھوٹے ہیں، لیکن ان کی شاخیں الگ ہیں اور رنگ الگ۔

بیسویں صدی کے دوران اردو میں جو انشائیے سامنے آئے ہیں ان میں مولانا آزاد کی تصنیف "غبار خاطر" اہم ہے۔ اکثر ناقدین کی رائے ہے کہ غبار خاطر کے بیشتر مضامین انشائیہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ جن میں [illegible] ذات کے ساتھ ساتھ اسلوب کی ندرت کاری کا عمل ہر سطر سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "غبار خاطر" کا مصنف کھلی فضا میں نکل کر اپنی داخلی واردات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک قسم کی خود کلامی ملتی ہے۔ لیکن خود کلامی کے عالم میں بھی مولانا اپنے قارئین کو نادیدہ جہانوں کی سیر کراتے ہیں جن کا قاری کو کبھی خیال تک نہیں گذرا ہو۔ مولانا آزاد اس میں اپنے داخلی واردات کا اظہار نہایت ہی شگفتہ اور ہلکے پھلکے انداز میں کرتے ہیں۔ جس میں ذات کا احساس شکست بھی ہے اور خود شناسی بھی۔ یہاں مولانا اپنے محسوسات صاف و شفاف آئینے دکھا کر اپنے قارئین کے چہرے پر ہنسی اور خوشی کے ساتھ ساتھ رنج و غم کی لہریں بکھیر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ لگا رہتا ہے کہ قاری بھی ان کے محسوسات کے بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اور ان کے مخفی گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ "غبار خاطر" کو مکاتیب کہا گیا ہے۔ جس سے گمان گذرتا ہے کہ یہ محض خطوط کا [illegible] ہے۔ لیکن غبار خاطر کے غائر مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس تصنیف کو [illegible]

[illegible] پہنا گیا

کے زمرے میں شامل کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ یہاں مولانا کے آداب والقاب بجائے نام معلوم ہوتے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ اس میں مکتوب الیہ کے علاوہ ایک جہان محفل نظر آتا ہے اور یہ جہان محفل زندگی کی ہمہ رنگی پر مشتمل ہے جو متنوع احساسات کے اتار چڑھاؤ کو پیش کرتا ہے۔ جس میں مولانا کے خاص و عام [illegible] کو یکساں رسائی ملتی ہے

موضوعات کے اعتبار سے بھی "غبار خاطر" انشائیہ کے قریب تر ہے۔ کیونکہ اس میں موضوع کی قید و بند کا گزر ہی نہیں۔ بلکہ جس طرف انہوں نے رخ کرنا چاہا اس طرف کی سیاحت لاشعوری طور پر کی۔ اور متنوع رنگوں کے پھولوں کو اپنے منفرد اسلوب بیان میں پیش کیا ہے۔ جس میں بے تکلفانہ بات کا رس، شگفتگی اور رعنائی ہر قدم پر ملتی ہے دراصل مولانا کے [illegible] خیالات ان کی داخلیت سے گہرا رشتہ قائم کر لیتے ہیں جس کی بدولت انہیں اپنے احساسات کو زبان دینے کے لئے کوئی موضوع تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ وہ محسوسات کے مبادیات سے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ جو ادب کے میکانکی عمل سے بالاتر ہے۔

"غبار خاطر" پر مکاتیب کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی تحریریں مولانا کے شعور اور لاشعور کی تمام توانائیوں کے ساتھ معرض وجود میں آئی ہیں۔ جب وہ علم اور فراست فلسفہ اور دین اور اس طرح کے باریک رموز بیان کرتے ہیں۔ تو ان کے قلم میں شعور کا تمام بانکپن کھل اٹھتا ہے۔ اور جب وہ جمال، حسن، لطافت اور نزاکت کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ تو وہ عجیب و غریب دنیاؤں کی سیاحت کرواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے۔ اور وہ اپنے الفاظ کے موتیوں سے جو دنیا آباد کرتے ہیں وہاں ان کا قاری تحیر اور استعجاب سے دم بخود ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لاشعور میں بکھرے ہوئے جذبات کا ایک طوفان ہے۔ جو امڈا چلا آتا ہے۔ ایسے نازک لمحات میں مولانا کے سامنے رسمی خط و کتابت کی تمام دیواریں ڈھ جاتی ہیں۔ اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ پس اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ "غبار خاطر" کی ساری کی ساری تحریریں نثری حسن اتفاق کا نتیجہ ہیں۔ اور نہ ان میں مکتوب الیہ کی شخصیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے جبکہ مولانا خود کلامی کے عالم میں اپنی ان تحریروں کو مکتوب الیہ تک پہونچانا بھی محال تصور کرتے ہیں۔ غبار خاطر میں مولانا اس بات کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

"قید خانے سے باہر کی دنیا کے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات بھی مکتوب الیہ تک پہونچ بھی سکیں گے یا نہیں؟ تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح مستعد ہو گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا تو پھر رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی ہوا کے جھونکے سے، میرے حصے میں عنقا آیا[1]"

---

[1] غبار خاطر، مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۳۳

غبارِ خاطر کی تحریروں میں کے تناظر میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران فرصت کے لمحات پا کر ان کے دل کو اپنے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی کی یاد ستاتی ہوگی۔ محبت یا رشتۂ سخن کا کوئی جذبہ عود آیا ہوگا ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے محسوسات کو تحریری رنگ دینا چاہتے تھے۔ جن حالات اور واقعات کا موثر عمل تھا جس سے انہیں قید سے باہر اور قید کے اندر سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جیل کی تنہائی میں انہیں صرف اپنی شخصی درد و کرب پر خامہ فرسائی کرنا مطلوب تھی۔

قید و بند کی زندگی میں مولانا کو اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ان کے خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اسی شعور نے ان کی فکری اڑان کے نئے راہیں ہموار کی ہوں گی۔ البتہ خطوط کے القاب تحریر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں مکتوب الیہ کا تصور تو اس طرف لے آتا ہے لیکن بعد میں اس کا خیال خود بخود مٹ جاتا ہے۔ اور ان کا ذہن فوراً ان حادثات اور واقعات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن کے رد عمل پر وہ اپنا قلم اٹھا لیتے ہیں۔ یہی معاملات زندگی مولانا کی شخصیت کے جزو لاینفک نظر آتے ہیں جن کا طرز اظہار ہزار لو علیس اختیار کر گیا ہے۔ لیکن ہر صورت میں ان کا یہ طرز اظہار ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ غبار خاطر میں مولانا آزاد ایک بزم بے تکلف کا اہتمام کرتے ہیں۔ جہاں وہ بات چیت کا غیر رسمی طور طریقہ اپناتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس بزم بے تکلف میں مرکزی کردار مولانا کی خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ جس کے سامنے مکتوب الیہ کا تصور بس یوں ہی ہوتا ہے۔ اور ساری توجہ اپنے احساسات اور جذبات پر مرکوز ہوتی ہے۔ انکشاف ذات کا یہی عمل "غبار خاطر" کو خط سے زیادہ انشائیہ کے قریب لے آتا ہے۔ انکشاف ذات کے تعلق سے غبار خاطر کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"میں نے سیاسی زندگی کو نہیں ڈھونڈا بلکہ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا ہے"

انشائیہ نگار بنیادی طور پر فنکار ہوتا ہے۔ جو حیات اور کائنات کے متعلق اپنا نظریہ رکھتا ہے۔ غبار خاطر کی بیشتر تحریروں سے مولانا کا تصور حیات سامنے آتا ہے۔ جو بے شک ان کی شخصیت کی طرح تہہ دار اور پیچ دار ہے۔ ان تحریروں سے ان کے تجربات و مشاہدات کا علم اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ معمولی سی بات میں بھی انشائیہ کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے ہیں۔ اور اس کا اظہار شخصی انداز ایسے کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہم ہیں۔ اور یہ تمام حقیقتیں ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ لیکن ان پر کبھی ایک لمحہ بھی ہم نے غور نہیں کیا اور ہماری زندگی کا یہ مانوس پہلو ہم سے نظر انداز ہوا ہے۔ اور اس کا ذاتی عمل غیر شعوری طور پر ہماری فکر کا ایک اہم پہلو رہا ہے۔ جس طرح مولانا اپنی شخصیت کے تناظر میں وہ فلسفۂ حیات ہمارے سامنے رکھتے ہیں جو ہماری

...ردوں سے وابستہ تھا۔ مولانا کا یہ تصورِ حیات ملاحظہ کیجئے:

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برسوں کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیوں کر کٹے گی، گزرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔"[1]

مولانا اپنے تصورِ حیات میں ایسے فلسفیانہ مسائل چھیڑتے ہیں جن سے حقائق اس طرح منکشف ہو جاتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں بیچ کے پردے خود بخود ہٹ جاتے ہیں۔ اور زندگی کے ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقائق کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ بقول وائٹ ہیڈ حقیقتوں کا عرفان ہونے لگتا ہے جو نئی روشنی کی صورت میں ہمیں حاصل ہو جاتا ہے۔ مولانا غبارِ خاطر میں حقیقتوں کے عرفان ہی سے ہمارے دل و دماغ کی گرہیں کھول دیتے ہیں۔ اور زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ زندگی کی "نئی روشنی" کے ضمن میں مولانا کا یہ اقتباس غور طلب ہے، لکھتے ہیں:

"غور کیجئے وہ زندگی ہی کیا ہوئی جس کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے، وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو۔"[2]

مجموعی طور پر غبارِ خاطر میں مولانا کی حیثیت ایک مکتوب نگار سے کم اور ایک انشائیہ نگار سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ غبارِ خاطر ایک موضوع پر اظہارِ خیال نہیں بلکہ اس میں ایسی تحریریں ملتی ہیں جنھیں ذہنی اڑان کہا جا سکتا ہے۔ مولانا کا قلم جیل کی تنہائی میں خود بخود اس رنگ تحریر میں ڈھل کر نکھرا ہے۔ اردو میں انشائیہ نگاری سے مقابلتاً ایک کم سن صنف ہے۔ اس وقت تک اردو انشائیہ کے بنیادی خد و خال واضح نہیں تھے۔ مولانا نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور اپنے خیالات و احساسات کا مکاتیب کی شکل اس طرح اظہار کیا ہے کہ انشائیہ کے بنیادی خد و خال ابھر گئے ہیں۔ ہیئتی اعتبار سے ان مکاتیب کو شاید ہی انشائیہ کہا جا سکے۔ لیکن مواد و اسلوب کے لحاظ سے ان کو انشائیہ کہنا موزوں ہوگا۔

———— ٭ ————

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۶ سے چھپا کر دفتر ماہنامہ سہیل
باری روڈ گیا سے شائع کیا۔

[1] غبارِ خاطر۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ ص: ۳۴۳
[2] ایضاً ص: ۴۲

پرکھ و معانی [illegible]

ندا فاضلی کے گیت

گیت ہندی شاعری کی دین ہے اردو شاعری میں جس طرح کی گداختگی، اضطراب، صداقت، نرمائیت اور شیرینی کا احساس غزل میں ملتا ہے۔ ہندی گیت ایسی ہی چند خصوصیات کا حامل ہے۔ اردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں کیسے اور کب ہوا؟ یہ ہماری بحث سے اس وقت خارج ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں گیت ہندی کے اثر سے پیدا ہوا۔ بعض لوگ اردو گیت کے ڈانڈے ولی سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک مختلف شاعروں کے کلام سے ملاتے ہیں۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں کہ ہندی گیتوں کی لے پہلی بار اردو میں نظیر اکبر آبادی کے یہاں سنائی دیتی ہے [1] مجھے ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں گیت کے واضح نقوش پہلی بار امانت لکھنوی کے ڈرامہ اندر سبھا میں ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ن۔ م راشد، میراجی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، مقبول احمد پوری، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطانپوری، جمیل الناہی، تاج سعید، مجید امجد، تنویر نقوی، اکرم انگار وغیرہ نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، کرشن موہن، بمل کرشن اشک، وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے۔ اور اس صنف کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔ ان ہی گیت کاروں میں ندا فاضلی کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ندا فاضلی شروعات سے ہی ایک شاعرانہ ذہن لے کر آئے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ خار زاروں سے گذرے ہیں۔ اور زندگی کے تلخ تجربوں کا مقابلہ مسلسل کرتے آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کے کلام میں عجیب گداختگی، درد اور تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی رنج و الم کے شدید احساس کا ردعمل ہے کہ انہوں نے

---

[1] ماہنامہ استفسار پٹنہ ص ۵۔

گیتوں کی طرف رجوع کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ زندگی سے لڑنے کا سب سے آسان اور دلکش طریقہ شاعری ہے[1]
ندا فاضلی گاؤں کی فضا میں پلے بڑھے ہیں۔ اور اس کے ماحول اور زندگی سے واقف ہیں۔ اس کے بعد جب وہ
شہر کی مشینی زندگی سے متصادم ہوئے تو ان کے ذہن نے عجیب انتشار کا تجربہ حاصل کیا۔ اسی لئے ان کی
شاعری میں جہاں ایک طرف اپنی گمشدہ شناخت کی بے معنی تلاش کا کرب ملتا ہے وہاں دوسری طرف مشینی
زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے بھی وہ خوابوں میں چھپے ہوئے شاداب و سرسبز گاؤں کی حسین یادوں میں
پناہ لینا چاہتے۔ ان کے خواب بکھر بکھر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع انسانی تناؤ ہے جو مشینی
قوتوں کے دباؤ اور خاص طور پر جنسی زندگی کی گھٹن سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے طبقے کے لوگوں کے دبے ہوئے
جنسی اور نفسیاتی کیفیات کے پیش کرنے کے روا ہیں۔ ان کا موضوع جنس رہا ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں
عام طور پر اسی کیفیت کی بازیافت ملتی ہے جنس کو دراصل وہ ایک علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور
ساتھ ساتھ زندگی کے دبے ہوئے ناسوروں اور مجروح خوابوں کو جنس کا موضوع بنا کر سامنے رکھتے ہیں۔ ندا
فاضلی کامیاب رومانی شاعر ہیں۔ وہ جنسی مسائل پر بھی نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ اور اس کو کامیابی کے
ساتھ اپنے گیتوں میں اس طرح برتتے ہیں کہ اس کا زیر و بم اور لے کی نرماہٹ روح کو گرماتی ہے مثلاً ؎

پتھر پتھر پانی چھڑکے،
ریت بنی جل دھارا
گونگے بہرے سنائے
میں چیخ چیخ کر ہارا
اتر، دکھن، پورب پچھم
ہوا کرے من مانی
پانی دے او پانی

—— : میاں ——

سمے بڑا ہرجائی،
سمے سے کون لڑے بھائی
راجہ بیلے کر گھومے ٹکڑ ٹکڑ ہو آئے
جس ماٹی کو جیتے موتی اس میں ہی کھو جائے
نہ آئے کام کوئی چترائی
سمے سے کون لڑے بھائی

---

[1] ندا فاضلی کا ایک خط راقم الحروف کے نام۔

ندا فاضلی کے گیتوں میں زمینی تشبیہات، ارضی کیفیات، اور عہد آمیز امیجری ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ جیسے تمام پیچ رہیں خود بخود کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہم عصر شعرا میں ایسی تشبیہات و استعارات بھی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں مصوری کرتے ہیں۔ ان کے گیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خود بخود کی پیاس بجھ رہی ہو۔ بیلوں کی شیشہ آنکھیں، دھرتی کی چھاتی، جل دھارا، گونگے بہرے سنہانے بن جل دھارا، آنگن آگن جلتی جوالا، ننگے سارے بول، وغیرہ جیسی ترکیبات استعمال کر کے معنی کی نیا آباد کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاق و سباق میں ان تراکیب کا استعمال اس قدر مصورانہ ہے کہ حسین کے آمیزش سے بنی ہوئی خوب صورت اور پر شکوہ تصویریں گھومتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ صیت اردو کے بہت کم گیتوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً ؎

بیلوں کی شیشہ آنکھوں میں
بنجر بنجر بادل
کٹی پھٹی دھرتی کی چھاتی
دور دور تک جنگل

پربت پربت وادی وادی
ویرانی ویرانی
پیاس بڑی دیوانی

؎ لوہا لوہا ـــــ لوہے کو پیٹے
کے ہتھوڑا من پہ
بڑھی بیچارہ ـــــ لکڑی چیرے
میں دیکھوں اٹھا اٹھا کر
نئی مراقی میں بھی پا لکھے
ندیا جیسا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو

ندا فاضلی نے اردو گیت کو ایک نئے آہنگ اور معنویت سے آشنا کیا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ تا میں مشینی دور سے لی گئی زبان اور لہجے کا کام لیتے ہیں۔ ان کا لہجہ نرم، کومل اور احساسات سے بھرپور۔ اس لہجے سے وہ اکثر جگہوں پر نازک اور انسلاکاتی مفاہیم کو چھپاتے ہیں۔ ان کی زبان فارسیت کے اثر سے۔ وہ سادہ آسان اور روزمرہ بولی جانے والی زبان کو تخلیقی حسن عطا کرتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ سب سے جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں عمل اور رد عمل دونوں کیفیات ملتی ہیں۔ ندا فاضلی

ندا فاضلی کی شاعری میں رومانیت کے عنصر کے علاوہ غم کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات اور کٹھنائیوں کا سامنا کر کے دریا دلی کا ثبوت دیا ہے یہ غم کچھ تو شاعر کے ذاتی کرب سے پیدا ہوا ہے اور کچھ معاشرے کی ڈوبتی ہوئی نیا کے دکھ سے۔ اس بات کا اعتراف ندا بھی اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔

"۱۹۶۴ء میں گوالیار میں گھر فسادات کی نذر ہو گیا تب سے اکیلا ہوں"[1]

اس فساد میں ندا فاضلی سے رول کو کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ ایک طرف ان کا گھر، محبت، مال و جائداد فسادات کی نذر ہو گیا اور دوسری طرف معصوم بچوں کی مسکراہٹیں، بے گناہ عورتوں کی جوانی مکھی کی طرح تباہ ہوتی جاتی اور بے قصور مردوں کے جواں خواب پارہ پارہ ہو گئے تھے سارے علاقے کے لوگوں کی خواب اور نیند چھین لئے گئے تھے، اس تباہ کاری نے ندا فاضلی کے دل پر گہرے اثرات مرتسم کرنا شروع کر دئے تھے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں ان تمام واقعات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے دل کی ان ہی ویرانیوں کا مرثیہ حسن فنکاری سے لکھا ہے وہ ان ہی کا کارنامہ ہے۔ ندا فاضلی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کے گیت دلوں کو مسرور کرتے ہیں، ان کی محبت پاؤں کی جھنکار اور گھنگروؤں کی آواز بھی ہے۔ ان کے علاوہ زندگی کا نیا پیام، عمل و عزم کا سبق اور روح کی گہرائیوں کا عکس بھی ملتا ہے۔ الفاظ بالکل جانے پہچانے ہیں۔ جن سے صداقت کی بے حجابی جھلکتی ہے اس جادو جگانے والے اسلوب سے جو محسوسات اور جذبات ابھرتے ہیں۔ ان میں ہمارے کرب، ہمارے معاشرے کا کرب رچ بس کر ٹپک آتا ہے مثلاً:-

جانے پہچانے ——— انجانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی جوالا
سڑک سڑک
پتھراؤ
شبدوں کے سب جیسے زخمی
ننگے سارے بول

——— پیام

جیت گئی رات، گھلی نیا کے پاؤں میں پہلی کرن
الٹی سے طرح نے پھینکے [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible])

[1] ندا فاضلی کا ایک خط راقم الحروف کے نام

انگلی سے دودھ پہ سانجھ سکارے
پیپل کی ٹونٹی سے گرتے ستارے

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں مرصع کاری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ہندی کا اسلوب اپنا کر ماضی کے دھندلکے کو درخشاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ ہے کہ ان پر [illegible]زی اور ہندی شاعری کا بھی براہ راست اثر ہے۔ ندا کے گیت سریلے، صاف اور خوشنما ہیں۔ ان کے گیتوں میں اثر انگیزی، تحیر، کشش، آرزومندی، ترنم اور غنائیت یہ سب کچھ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے گیت کو [illegible] دینے میں جو نئی تراکیب، نئے تجربے اور علامتی اسلوب اپنایا ہے وہ ان ہی کا کام ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی گیت کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ محبت سے بھری عقیدت، بے یقینی کا عالم، اجتماعیت، [illegible]دم اور رحم کی تلخی ندا فاضلی کے شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ موضوعات شدت سے محسوس کئے جاتے ہیں۔

۱۵ اگست
یوم آزادی
ملکی و ملی اتحاد و استحکام کے لئے
ایک یادگار دن
تندرستی
خوبصورتی
بینائی
عید الاضحی مبارک

تشنگی

فریدہ [illegible]

عشق عجیب جنون شباب کی ڈگر

اک تشنہ لبی مسلسل
اک تمام ہستی مسلسل
عجیب ہے بند آنکھوں کا نگر
شعلہ تپاں وجود سراب جیسا
تڑپتی روح جستہ جستہ شاداب
پیاسی نگاہوں میں لہراتا ساغر
بند ہتھیلیوں سے چھلکتا ہوا جام
الجھتی سانسوں میں
اک خیال احساس کی سرگوشی
کتنا بھاتا ہے شوخ و چنچل
رومان پرور شاعری کوئی رنگین غزل
لیکن —
آگہی کی جلتی دھوپ
احساس کا مقتل
احساس کا پیام مرگ
پھر وہی تشنگی کا ادراک
پھر وہی تشنہ لبی کا احساس
نہ ساغر نہ جام
بس ایک درد بے نام
تشنگی کا تقاضا لئے
تشنہ لبی کا جھاگ لئے

میں بولتی ہوں؟

شہناز مستر

انہوں نے مربی سے میرے
شکایت یہ کی ہے
کہ میں بولتی ہوں
....
مربی نے حیرت کے لہجے میں
پوچھا ہے مجھ سے
کہ شہناز!
کیا بولتی ہو؟
....
یہ سچ ہے
کہ میں بولتی ہوں
کہ جذبات میرے بھی ہیں کچھ
کہ کچھ خواہشیں ہیں
تمنا ہے!
کہ جو ستم ہے!!
انہیں بھی سمجھنے کی کوشش کرو
جو جائز طلب ہے
انہیں بھی تو پوری کرو —!

یہ ظلم و ستم کا
جو بیوپار صدیوں سے جاری ہے
اب ختم ہو
جو رحم و کرم کا تصور ہے
بیدار ہو!
خلوص و محبت
اور انسانیت کا
فسوں ہر طرف پھیل جائے
تو کیا یہ برا ہے؟
....
یہی بولتی ہوں
برابر یہی بولتی ہوں
اگر بولنا میرا
جرم و خطا ہے
تو میں بولتی ہوں
برابر یہی بولتی ہی رہوں گی!

حسین الحق

کانٹا اندر اندر

شیمی نے بڑی گھبرائی گھبرائی بے حد تھکی ہوئی نگاہوں سے وقار کی جانب دیکھا اور دھوپ سے بچنے کے لئے ادھر ادھر سایہ تلاش کرنے لگی

"تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا" وقار چلچلاتی دھوپ میں کھڑا تھا۔

"میں..... میں کیا جواب دوں؟ تم نے عجیب سی بات ہی پوچھی ہے"

شیمی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کھڑی کھڑی جھک کر ایک پودے کو جڑ سے اکھاڑنے لگی۔ مگر پودے کی جڑیں شاید اندر اندر بہت دور تک پھیل چکی تھیں۔ شیمی نے جھک کر آسمان کی طرف دیکھا..... کھلے صاف و شفاف چلچلاتے آسمان کی طرف..... جہاں چھتنار جیسی دھوپ سایہ فگن تھی..... جہاں ایک تنہا پرندہ آسمان کی بلندیوں میں اڑتا ہوا جانے کدھر چلا جا رہا تھا

"یہ پرندہ کہاں جائے گا؟" شیمی نے دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر پرندے کی طرف دیکھا، اور وقار کی جانب دیکھے بغیر آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

"اس کی کوئی منزل نہیں ہے" وقار آہستہ سے بولا "یہ تمام دن اسی طرح مارا مارا پھرے گا۔ اور جب چاروں طرف اندھیرا چھا جائے گا تو یہ کہیں بھی اتر پڑے گا

...... تھک جائے گا۔ اور پھر اگلی صبح ....

اور پھر اگلی صبح ......

اپنے گھونسلے ہی میں نا جائے گا۔

گھونسلا ہوگا تب نا۔

"ہر پرندے کا آشیانہ تو ہوتا ہی ہے" شیمی کی آواز بہت مدھم تھی۔

وقار چپ رہا، کچھ بولا نہیں۔ حالانکہ اسے کچھ یاد آگیا تھا۔ ایسا کچھ جو شیمی کو بھی سنایا جا سکتا تھا۔ اس پرندے کی کہانی جو بہت دلائیہ...... ہاں شاید پرندہ نہیں برس پہلے، بلندیوں کی تلاش میں گھر سے نکلا اور پستیوں میں کھو گیا۔ وقار نے شیمی کی طرف دیکھا، یہ جیالا آفتاب، عروج فن، یہ سربلندی تخلیق، اب کیا؟..... اب کیا ....؟ ہاں اب کیا حاصل؟"

شیمی نے وقار کی طرف دیکھا۔ وقار کے سپاٹ چہرے میں جانے وہ کیا تلاش کرنے لگی۔ اسے اس کے چہرے پر پرچھائیوں کے رقص کا احساس ہوا۔ کہیں سے بادل کا ایک ٹکڑا سا اڑتا چلا آیا سورج کے عین سامنے

لو سے تپاتے تھے۔ اس لئے جیسی ہیں پائے ۔۔۔
وہ اندر ہی اندر گھٹ کر اور گھٹتے رہے۔ وہ لوگ جو
دیکھتے ہی سلام کرنے حاضر ہوتے تھے اب انجان ہو کر
گذر جاتے ہیں۔ ان ساری تبدیلیوں نے زندگی کو کہاں
سے کہاں پہنچا دیا ۔۔۔ اسی انقلاب نے انہیں ذہنی
طور پر مفلوج کر دیا ہے۔"

اماں خاموش ہو گئیں اور میں سوچ کے دلدل میں
دھنستا چلا گیا اور پھر ان کی آواز ابھری۔

"اب تو کہیں آنا جانا بھی نہیں کرتے۔ دیوان خانے
کے اندر یا پھر سہ پہر میں پھلواری میں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں
کبھی کبھار مجھے بلا لیتے ہیں یا پھر سلامت سے گھنٹوں
گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہی ایک عمر کا رفیق رہ
گیا ہے۔"

یہ سب سن کر میں بھی کھو گیا۔ سوچنے لگا
زندگی تو اسی طرح پل پل رنگ بدلتی رہتی ہے
نہ تو اسے اپنی مٹھی میں قید کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی
بھاگتے ہوئے وقت کو روکا جا سکتا ہے۔ ابا جس
زندگی کی تمنا میں جئے تھے وہ تو انقلاب کی نذر ہو گئی
انہیں صرف یہ پرچھائیاں ملیں۔ اور وہ اسے قبول نہ
کر سکے اس لئے وہ ٹوٹ گئے۔

میری چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ میں لوٹنا چاہ رہا
تھا مگر ابا نے روک لیا۔

"رک جاؤ بیٹے! دو چار دن اور ٹھہر جاؤ۔
دسویں محرم قریب ہے اب چلے جانا۔"

دسویں محرم کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں
انگنت رنگ بکھر گئے۔ میرے جیسے [illegible] محرم کی
دسویں [illegible] خوب شاندار اہتمام ہوتا تھا

دادا ابا کے زمانے میں بھی ایک بار یہ دھوم دھڑاکہ دیکھنے
کا موقع ملا تھا۔ اس دن حویلی میں خوب چہل پہل ہوتی۔
منتیں تقسیم کی جاتیں۔ پورے گاؤں کی شاندار طریقے
سے ضیافت کی جاتی۔ ہزاروں خرچ کئے جاتے اور غریبوں
میں خیرات بانٹے جاتے۔ اور ایک عرصہ تک اس دعوت کے
تذکرے ہوا کرتے۔

یہ سلسلہ ایک زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ دادا
اور ان کے دادا، اور ان کے دادا ۔۔۔ نہ جانے کب
سے ۔۔۔ مگر یہ طے تھا کہ یہ سلسلہ اسی آن بان سے
قائم تھا اور ابا نے اس میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

دادا کے زمانے میں کسی شے کی کمی تو تھی نہیں۔ یہ
سب کچھ گھر کا ہوتا تھا۔ نفیس چاول، شاندار گھی، چینی
بھی سب گھر کا ہوتا۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا۔

جوں جوں دسویں محرم قریب آ رہا تھا۔ ابا کے
چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جب وجہ دریافت
کی تو انہوں نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور گویا ہوئے۔

"تم سے کیا چھپاؤں بیٹے! دسویں محرم کی نذر
کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کے اہتمام میں فرق
بھی نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ باپ دادا کے وقار کا
سوال ہے۔ ان کے بھرم کو قائم رکھنے کے لئے وہی سب
انتظام کرنا ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔ اور پھر پانچ سال
بعد میں خود اس موقع پر حاضر ہوں اس لئے کسی شے
کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔"

وہ چپ ہو گئے اور پھر شکست بھرے لہجے میں
بولے ۔۔۔

"انتظام کے نام پر کچھ بھی نہیں ہو سکا ہے ایک
روپیہ کہیں سے آنے کی بھی امید نہیں [illegible] فکر مند ہو رہا ہوں۔

گھر کی حالت اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر وقار کو ٹھیس بھی نہیں پہنچ سکتا ——— اسی ادھیڑ بن میں مبتلا ہوں۔ اور وقت کا سوال سوا نیزے پر آ پہنچا ہے۔"

ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہمارا ایک پڑوسی سلطان آ پہنچا وہ میرا ہم عمر تھا۔ آتے ہی ادب سے سلام کیا اور نگاہیں نیچی کر کے بولا۔

"سرکار دسویں محرم قریب ہے، ظاہر آپ اس بار بہ نفس نفیس اس موقع پر حاضر ہیں۔ اور انتظام میں مشغول ہوں گے۔ ابا مرحوم آپ کے دوستوں میں تھے۔ اس لئے مجھ پر بھی کچھ فرض عائد ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اس کار خیر میں ہاتھ بٹاؤں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور روپیہ کی گڈی نکالتے ہوئے وہ بولا۔

"میری طرف سے اگر یہ تین ہزار کی رقم قبول کر لیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی ابا نے کہا۔

"بیٹے میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ رقم کا انتظام تو کب کا ہو چکا ہے عزیزم اس لئے تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ مگر اس کے اندر کا جو سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کہا سے کہا

"ابا! ابھی تو آپ کو رقم کی ضرورت تھی۔ آپ اس سے قرض مانگنے بھی نہیں گئے۔ وہ تو خود ہی پیش کر رہا تھا آپ کو رکھ لینا چاہئے تھا۔ بعد میں واپس کر دیتے۔"

"تم اسے نہیں سمجھو گے بیٹے!" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"میں تو بس باپ دادا کی عزت دھو رہا ہوں۔ پتہ نہیں تم اسے کہاں تک نباہ پاؤ گے ——— تم کہتے ہو میں اس سے رقم لے لیتا جبکہ ———"

وہ چپ ہو گئے اور ماضی میں جھانکتے ہوئے بولے ———

"ایک بار جبکہ تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اس زمانے کا واقعہ ہے میں صبح سویرے گھوڑے پر سوار سیر کو نکلا تھا۔ راستے میں اسی سلطان کے باپ نے روکا۔ اور اپنی مجبوری بیان کر کے پانچ سو روپے قرض مانگا۔ اور مجھ سے کہا"

"اگر آپ کی عنایت ہو تو میں گھر آ کر آپ سے رقم حاصل کروں۔ آپ کی مہربانی سے میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا ———" میں نے اس سے کہا تھا

"رقم تو تم اس وقت بھی لے سکتے ہو۔" پھر میں نے اپنی جیب سے رقم نکالتے ہوئے اس سے کہا تھا

"ہاں گھر آنے کی ضرورت نہیں اور اس کی خبر کسی کو بھی نہ ہونے پائے"

اس زمانے میں پانچ سو روپے کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ یوں سمجھو کہ آج کے بیس پچیس ہزار ہوں گے۔ اور اتنی رقم جیب میں کر کوئی نہیں چلتا تھا۔ اور میں تو چلتے اتنی رقم سے کسی کی مدد کر سکتا تھا۔

وہ ماضی میں گم تھے ——— پھر حال کے رنگ پہ اترتے ہوئے بولے

"اب بتائیے! میں نے جس کی مدد کی ہو

سکے بیٹھنے کا انداز قبول کر لیتیں۔ خاندانی وقار مجروح
ہوتا۔ اللہ پھر میری خود داری کیسے قبول کر لیتی۔
وہ خاموش ہو گئے اور میں سوچتا رہ گیا۔
ابا جس طرح اپنے ماضی سے گہری وابستگی رکھتے
تھے وہ وابستگی میرے ساتھ نہ تھی۔ اس لئے میرا
ذہن ان باتوں کو اچھی طرح قبول نہیں کر رہا تھا۔ پھر بھی
سب مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ خاندانی بھرم کے اس
بوجھ کو آخر کوئی کب تک اپنے ناتواں کندھوں
پر ڈھو سکتا تھا۔

اس دعوت کا انتظام شاندار طریقے سے
ہوا۔ سارے روپیہ کا انتظام گھر کے ملازم سلامت نے
کیا تھا۔ جس کے عوض کھیت کا ایک حصہ انہیں دیدیا
تھا۔

اس زمانے کو ایک عرصہ گذر چکا ہے۔ میں نے
ابا کی جگہ سنبھال لی ہے۔ مگر میں نے خاندانی بھرم کا بوجھ
وراثت میں لینا قبول نہیں کیا۔ آج اپنے گاؤں سے
ہزاروں میل دور گیا کی اس کوٹھری میں بستر پر پڑا سوچ
رہا ہوں۔

مجھ سے کوئی یہ کیوں نہیں کہتا کہ اب آپ آرام
کریں — اور — نہیں شاید نہیں — کوئی اگر آپ یہ نہیں
کہے گا۔ اب تو اپنی صلیب اپنے کندھوں پر ہی ڈھونی
ہوگی۔ اور اب اسی روایت کو زندہ رکھنا ہوگا — اور
ماضی کی یادوں میں گم میں یہ سوچ رہا ہوں۔
زندگی کے کتنے روپ ہیں۔
یہ کس کس رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔
اور اس کا اصل رنگ کون سا ہے۔

بہار میں سینچائی

بڑے اور متوسط سینچائی کے تحت ۸۶-۸۵ سال میں ۵۷ ہزار ہیکٹر زمین میں زائد سینچائی صلاحیت کی پیداوار کا نشانہ پلاننگ کمیشن کے ذریعہ مقرر کیا گیا۔ سینچائی صلاحیت کے استعمال کا نشانہ زائد ۸۰ ہزار ہیکٹر رکھا گیا جن میں پہلے سے کی گئی سینچائی طاقت کے استعمال کا بھی پروگرام شامل تھا۔ سینچائی پری یوجناؤں پر ۸۶-۸۵ء میں ۲۲۰٫۳۰ کروڑ کے طے شدہ منصوبہ آدمی بیما کے مقابلے ۳۱ مئی ۸۶ء تک ۲۲۰٫۳۱ کروڑ روپے کا انتظام کیا گیا۔

محکمہ آبپاشی کے اہم منصوبے یہ ہیں

(۱) سون ادھونی کی کرن پری یوجنا (۲) اتری کوئل پری یوجنا، جو ۱۹۹۰ء تک پوری ہوجائیگی اور (۳) سورن ریکھا پری یوجنا جو ۸ویں پنجسالہ یوجنا میں پوری ہوگی

۸۷-۱۹۸۶ء میں مائنر اریگیشن کے تحت ڈھائی لاکھ ہیکٹر زمین میں زائد آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کا نشانہ ہے۔

جاری کردہ۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

सू० ज० स० नि० 161 ए (सू० 107) 86-87

دھیرے دھیرے سرک رہی ہے۔ اماں کے بال بھی دھوپ کی طرح پک گئے ہیں۔ وہ پیر پھیلائے بیٹھی ہیں۔ اور منہ تکے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ جیسے کوئی بچہ دیکھتا ہے۔ کچھ دیر بعد میں چلا جاؤں گا۔ پھر وہ تنہا رہ جائیں گی۔ اس پیڑ کی طرح جس کی پتیاں سوکھ کر الگ ہو گئی ہوں۔

مجھے اس دن کی بات یاد آتی ہے ——

اماں آنگن میں لیٹی ہیں۔ شام اپنے منحوس پروں کو پھیلائے بڑھی چلی آ رہی ہے۔ آسمان کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے ہلکے ہلکے بادل کسی ناگہانی موسم کا پتہ دے رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگی ہیں۔ اماں چلا رہی ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اشارے سے کہہ رہی ہیں —— مجھے اندر لے چلو۔ میں بھیگ رہی ہوں۔ نوشاد ان کی بات سن رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی اماں کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن دونوں اس طرح انجان بنے ہیں۔ جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہے ہیں اماں بھیگ جاتی ہیں۔ بعد میں میری بہن شبانہ آتی ہے۔ اور انہیں اٹھا کر اندر لے جاتی ہے۔

میں اماں سے کہتا ہوں —— تمہیں نوشاد کی اتنی فکر رہتی ہے۔ لیکن اسے بھی تو کچھ سوچنا چاہئے۔ وہ تمہارے سامنے سے گذر جاتا ہے لیکن تمہاری طرف نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ جب اس کی چھٹی رہتی ہے کسی دن بھی وہ اپنا سارا وقت اپنے دوستوں میں گزار دیتا ہے۔ کیا اس کے پاس تمہارے لئے ایک پل بھی نہیں۔ لیکن اماں کو میری بات کب سمجھ میں آتی ہے وہ تو نوشاد کے لئے مرتی ہیں۔ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر تکنے لگتی ہیں۔ نوشاد —— میرا نوشاد ——

[illegible] کیا ماں کا پیار [illegible]

دیا ہے۔ بیلی اماں کو ایک ٹک دیکھ رہی ہے۔ کمرے سے نکل کر نوشاد کی بیوی بھی آنگن میں آتی ہے۔ اماں اپنی چھوٹی بہو کو دیکھ رہی ہیں۔ اماں اسے ہمیشہ چھوٹی بہو ہی کہتی ہیں لیکن وہ اپنے کو چھوٹی بہو کہاں سمجھتی ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں

—— !

"اماں تم نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ وہ بڑی بہو بنتی جا رہی ہے۔"

"میں بھلا کسی کو کیا بگاڑ دوں گی۔ اللہ نے جیسے بنا دیا ہے اسے کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

اپنے پوپلے منہ سے اماں سیب کھا رہی ہیں۔

"سیب کیسے ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔

"اچھے ہیں!"

اماں اپنے بچپن میں لوٹ آتی ہیں۔ کیسا جلدی جلدی سیب کھا رہی ہیں۔ مجھے پوچھ بھی نہیں رہی ہیں آج وہ خود بچہ ہیں۔ بیلی جہاں کھڑی ہے۔ گڈو، عارفہ اور فضلو بھی آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور سب اماں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ گڈو تو سیب کی لالچ میں اماں کے کچھ قریب آ گیا ہے۔ اماں کے کھانے کی رفتار مدھم ہو گئی ہے ان کا ہاتھ جیسے رک رہا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے سیب کھا رہی ہیں۔ جیسے وہ ان کے گلے میں اٹک رہا ہے

تم چلاتی رہتی ہو اور فضلو تمہارے سامنے سے نکل جاتا ہے۔ اور یہ عارفہ —— تم نے اسے بھی تو پکارا ہوگا —— لیکن اس نے کب تمہاری سنی ہے؟ بیلی نے ابھی تمہیں چارپائی سے نہیں اٹھایا اور تمہیں اس کی فکر لگ رہی ہے۔

"دھیرے سے بولو، کہیں ان کی ماں کمرے سے سن نہ لے

...سکی تو ـــــ ؟"

...کو "وہ" لگ جائے گا"

"لگ جائے۔ مجھے ڈر نہیں"

...اماں میرے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہیں ـــــ

"چپ رہ "وہ" لگ جائے گا"

اماں اپنے پوتے پوتیوں کو ایک ٹک دیکھ رہی ہیں۔ اور زبان کا کام آنکھوں سے لے رہی ہیں ـــــ

ـــــ آ ـــــ کھا جا ـــــ کھا جا ـــــ

...دو وہ کھانے کے لئے کٹرے ہیں۔ سیب کو یا اماں کو ؟

میری آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ "اماں! میں سیب اس لئے لاتا ہوں کہ تم چارپائی سے اپنے سے اٹھ سکو۔ اپنے سے پانی پی سکو۔ اور جب چلنے کے لئے سوچو تو چل بھی سکو۔ تمہارے اندر طاقت آجائے اور تم ......"

اماں بچہ سیب کھانے لگتی ہیں۔ لیکن وہ سیب کھا رہی ہیں ـــــ؟ سیب تو ان کو کھا رہا ہے ـــــ

مجھ سے اماں کا چہرہ نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ میں سامنے کھیت کی طرف دیکھنے لگتا ہوں جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور اماں کے دل کی طرح ہرے بھرے ہیں ـــــ

میں ان کی ہریالی میں چھپ جانا چاہتا ہوں۔ اور اماں میری نظر بچا کر سیب کی ایک ایک قاشیں بچوں کو دے دیتی ہیں ●●

تبصرہ

نام کتاب : پریم چند اور تصانیف پریم چند
مصنف : مانک ٹالہ
صنف : تحقیق
ضخامت : ۲۲۴، قیمت : ۴۵/-
پتہ :- موڈرن پبلی شینگ ہاؤس ۹ گولا مارکٹ نئی دہلی۔

جناب مانک ٹالا اردو کے کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہیں۔ تحقیق ان کی ادبی شخصیت کا ایک دوسرا گوشہ ہے۔ لیکن پیش نظر کتاب "پریم چند اور تصانیف پریم چند" کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا مضبوط تر پہلو افسانہ نگاری ہے یا تحقیق۔ اس لئے کہ اس کتاب میں انہوں نے پریم چند کے متعلق کئی اہم سوالات کے تحقیق کے نقطۂ نظر سے تشفی بخش جوابات دئے ہیں۔

ابتدائے کتاب میں جناب مالک رام نے "پیش گفتار" ڈاکٹر بابا چرن رستوگی نے "گذارش احوال" اور جناب کالی داس گپتا رضا نے "حرف چند" کے تحت مانک ٹالا کی کوششوں کو سراہا ہے۔ اور اس بات کی ستائش کی ہے کہ مصنف کتاب نے پریم چند کے سلسلے میں کئی غلط فہمیاں دور کی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن کے بعض ان گوشوں کو روشنی میں لے آئے ہیں۔ جو آنکھوں سے اوجھل تھے۔ پریم چند کے بعض افسانوں اور ان کے چند کرداروں اور کچھ مکالمات کی بنا پر ایک طبقہ انہیں رجعت پرست اور متعصب سمجھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ پریم چند کے فن میں اس قدر پھیلاؤ ہے۔ کہ معاشرہ کے متعدد کردار اور اشخاص اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ جب کرداروں کا اتنا بڑا ہجوم ہو تو ظاہر ہے کہ اس میں ہر میلان و رجحان کے لوگ سامنے آئیں گے۔ لہذا پریم چند کے فن میں متعصب ہندو اور متعصب مسلمان دونوں نظر آتے ہیں۔ اب جو بات بطور خاص دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند نے ان تعصب زدہ کرداروں کو کس طرح برتا ہے۔ اور اپنے فن کے ذریعہ کن جذبات و میلانات کو تقویت پہونچائی ہے۔ جناب مانک ٹالا نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تحریروں اور مکاتیب کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا نے موصوف بھی پریم چند کو غیر متعصب سمجھتے تھے۔ اور ان کے افسانوں میں پیش کردہ خیالات کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔

پریم چند ہندی کے ادیب تھے یا اردو کے؟
اس سوال پر خاصی گرما گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ میں جناب مانک ٹالا کی اس موقف کی تائید کرتا ہوں کہ ہندی والوں نے پریم چند کو محض اس بنیاد پر DISOWN نہیں کیا کہ پریم چند اردو میں بھی لکھتے تھے۔ بلکہ اولاً اردو میں ہی لکھتے

رہے تھے) اس لحاظ سے اردو والے تعصب پھیلنے کے شکار
ہو جاتے ہیں [illegible] ادبا و شعرا شرکت پسند نہیں کرتے
یہی وجہ ہے کہ اردو نے چند اہم اہل قلم کو اپنے آپ سے
جدا کر کے زبردستی ہندی کی طرف دھکیل دیا۔ یہ ہندی
والوں کی وسعت ذہنی ہے کہ انہوں نے ان ادبا و شعرا
کو اپنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تشکیلی دور میں ہندی
زبان وادب کے جتنے متنوع SHADES نظر آتے
ہیں اس قدر اردو میں موجود نہیں ہیں۔ اردو زبان وادب
کی تاریخ میں DEVELOPEMENTAL
STAGES کو سرسری طور پر گذار دیا گیا ہے۔ اور اس
کی بنیاد کو DEEP ROOTED بنا کر پیش نہیں
کیا گیا ہے۔ اردو والوں کا بس چلتا تو نظیر اکبرآبادی کو
بھی غیر ثقہ شاعر کہہ کر اپنے قبیلہ سے نکال دیتے۔ کچھ
لوگوں نے تو اس کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ تو کہیے کہ چند
روشن خیال اردو والوں نے نظیر کے انخلا کی مخالفت
کی۔ اور وہ جلتے جاتے رہ گئے۔

جناب مالک رام نے اپنی تحقیقات سے
"سوز وطن" اور "سمر یاترا" کی ضبطی کا مسئلہ بھی حل کر
دیا ہے۔ اور اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہ دونوں
نگارشات ان معنوں میں ضبط نہیں کی گئی تھی جن معنوں
میں اردو اور ہندی کی کچھ منظومات ضبط شدہ تھیں۔
پریم چند کی ہلکی سی تنبیہ کی گئی تھی اور بس۔ ان غلط
فہمیوں کا دور ہونا بھی ضروری تھا۔

جناب مالک رام نے اپنے موضوع کے سلسلہ
میں تمام ضروری مواد و ماخذ کا مطالعہ کیا ہے۔ "زمانہ
کانپور" کی فائیلوں سے ان کی بہت سی مشکلیں دور
ہوئی ہیں۔ وہ مختلف حوالہ جات سے صحیح نتائج بھی
اخذ کرتے ہیں۔ وہ اس امر کا پتہ بھی لگا لیتے ہیں کہ پریم
چند کے محققین سے کیا کیا غلطیاں ہوئی ہیں۔ اور ان تمام
غلطیوں کے اسباب کیا ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر جعفر
رضا کی ان غلطیوں کی بھی نشان دہی کی ہے جو "گپت
دھن" اور "بلیشم" کے معاملات میں ان سے سرزد
ہوئی ہیں۔

غرض کہ جناب مالک رام نے اپنے موضوع کا
حق ادا کیا ہے۔ اور پریم چند کے توسط سے اٹھائے
جانے والے متعدد سوالات کے تشفی بخش جواب دیئے
ہیں۔ ان کی اس خوبی کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا
کہ تحقیق جیسے خشک موضوع کو انہوں نے دلچسپ بنا
کر پیش کیا ہے۔ غالباً یہ انداز نگارش ان کی افسانہ
نگاری کی دین ہے۔

—————: ڈاکٹر علیم اللہ حالی

قارئین

شہرِ خیال

اپریل ۸۶ء کا سہیل ملا۔ اپنے معیار و روایت کے
مطابق سہیل اردو ادب کی بھرپور خدمت کر رہا ہے اور آپ
کی محنتیں قابلِ قدر ہیں۔ ہماری نیک خواہشات قبول کیجئے۔
دور جنوری ۸۶ء سے سہیل کے معیار اور مزاج میں بہت سی
تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج کے دور میں یہ لازمی بھی ہے۔ آپ نے
پہلے ہی اس جانب پہل تو کیا۔ اپریل کے شمارے میں
دو" کے تحت آپ نے فرقہ واریت پہ بھرپور لکھا ہے۔
ہندوستان کی بائیں بازو والی پارٹیوں کے لئے ایک
فکر ہے۔ شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات کے
مصداق؟ میرا خیال ہے کہ آپ کے بیشتر ادارئیے بالکل
سیاسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور ایک ادبی رسالے کے مدیر
لئے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے
کبھی خالص ادبی گفتگو کیا کیجئے۔ بائیں بازو کی سیاسی
یوں کی طرح بائیں بائیں بازو کی ادب اور ادیب بھی
ضح ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس پہ لکھنا لازمی ہے۔ شاید
ہ آپ کچھ لکھیں۔

قیصر زماں تپش کا مقالہ "اردو کی خواتین افسانہ
" یقینی طور پہ توجہ کا مستحق ہے۔ شاید اس کی ایک
آپ نے ستمبر یا اکتوبر ۸۵ء کے شمارے میں شائع
ا۔ اس لئے قسط کے متعلق وضاحت ضروری تھا۔
سے قارئین کو سہولت ہوتی ہے۔ خواتین افسانہ
نگاروں کا BACK GROUND کو جس
انداز میں مقالہ نگار نے برتا ہے اس سے قارئین کو سہولت
ہوتی ہے۔ اس جانب توجہ کی ضرورت بھی تھی۔ اس سے
خواتین افسانہ نگاروں کے متعلق واضح تصویر اور ترقی کی
صورت حال کا صحیح نقش سامنے آتا ہے۔ امید ہے کہ اور
دوسرے اہلِ قلم حضرت بھی اس جانب توجہ فرمائیں گے۔
اور مذکورہ مقالہ تحریک کا باعث ہوگا۔ موصوف نے
خواتین افسانہ نگاروں کے عہد بہ عہد ترقی اور رجحانات کو
مختصراً مگر محنت سے سجایا ہے۔ بقیہ قسطیں ہوں تو مسلسل
شائع کیجئے۔ GAP سے تاثر نہیں بن پاتا۔ میرے جانب
سے انہیں مبارکباد پہنچا دیجئے۔ مشمولات میں بقیہ چیزیں
بھی اچھی ہیں۔ سازینہ کی نظم 'دامو' نے متاثر کیا۔ دونوں
کہانیاں بس ٹھیک ہیں۔ کہانیوں اور غزلوں کا اور بھی بہتر
انتخاب ہونا چاہیئے۔

کتابت اور طباعت توجہ چاہتی ہے۔ سہیل کے
معیار کو بلند کرنے کے لئے اس جانب فوری توجہ دیجئے!
چونکہ جمالیاتی حسن ہر لٹریچر کا لازمہ ہے اور خوب صورت
طباعت و کتابت جمالیاتی حسن کو بیدار کرنے میں اہم
رول ادا کرتے ہیں۔ بہرحال اس دور میں اردو کی خدمت
جس خلوص سے آپ کر رہے ہیں وہ آپ کی جانفشانی کی
مثال ہے۔ ——— محمد عاصم مجبور جہوری

سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ!
پرچہ ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ مشتاق شبنم کی نظمیں خوب صورت ہیں۔ غزلیں بھی سب معیاری ہیں۔ راہی صاحب کے مضمون پر ماونسے تنگ کا قبضہ ہے۔ ایک بات کھٹکتی ہے۔ نیوز پرنٹ پر سیاہی پھیل گئی ہے اور اس طرح قاری کو پڑھنے میں کسی حد تک دشواری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ادھر توجہ دینے کا مطلب ہے پیسہ خرچ کرنا اور ادبی جرائد تو پہلے ہی گھاٹے کے سودا ہیں۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ پرچہ خوبصورت کتابت طباعت اور گیٹ اپ کے حامل ہوں۔ کیا اردو میں ٹائپ رائج نہیں کیے جا سکتی۔ (کاتب صاحب سے معذرت کے ساتھ) میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ٹائپ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔ پنجاب میں حالات بدستور تناو پورن میں، گو کنٹرول میں ہیں"

——— : شروَن کمار ورما امرت سر

سہیل کا مئی جون کا مشترکہ شمارہ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے تنقیدی نظام پر شعیب راہی کا مضمون فکر انگیز ہے۔ حسن نجمی کی غزلیں پسند آئیں۔

——— : نسیم بن آسی، مغل سرائے

اس بار مضامین کافی ہیں۔ اور کافی لمبے بھی۔ ڈاکٹر شعیب راہی کا مضمون گیارہ صفحوں پر پھیلا ہے اور صرف حوالہ سے پُر ہے۔ اگر اس سے حوالے خارج کر دیئے جائیں تو وہ مشکل سے دو صفحہ بلکہ ڈیڑھ صفحہ میں سمٹ جائے گا۔ پتہ نہیں کیوں ان دنوں صرف دوسروں کی کہی گئی باتوں کے سہارے آگے بڑھنے کا چلن نکل گیا ہے۔ جس طرح کلیم الدین احمد کے مضامین کے جواب میں عبدالمغنی صاحب ایک کتاب لکھ سکتے ہیں اسی طرح ڈاکٹر راہی بھی کر سکتے تھے۔ مگر لگتا ہے انہیں اپنے قلم پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے صرف دوسروں پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ مغنی کو رد کرنا چاہ رہے ہیں۔ مانک ٹالہ نے واقعی محنت کی ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب بھی آ چکی ہے۔

کہانیاں مایوس کرتی ہیں۔ صرف شروَن کمار ورما کی کہانی غنیمت ہے۔ آپ انتخاب سخت کیوں نہیں کرتے؟ اتنی محنت سے رسالہ نکالتے ہیں۔ تو ذرا سی محنت اور کریں اور اس کے معیار کو بس ذرا سا اور اٹھا دیں۔ پھر یہ خود بخود اونچا اٹھتا جائے گا۔

——— : مشتاق احمد نوری، سمستی پور

سہیل کا تازہ شمارہ (مئی و جون ۸۶ء) نظر سے گذرا۔ تازہ شمارہ پسند آیا۔ تمام تخلیقات اچھی لگیں۔ لیکن خلوص دل سے ایک گذارش ہے کہ کتابت پر بھرپور توجہ دیجئے۔ اور آپ کے لئے یہ کام زیادہ مشکل نہیں۔

حسن نجمی صاحب کی غزل کے مطلع کا قافیہ جو دراصل ریگزار ہے پڑھا نہیں جاتا۔ ویسے ہی موصوف کی دوسری غزل کے مطلع میں بھی مصرع ثانی کا قافیہ جو "دلربائی" پڑھا نہیں جاتا۔

——— : گوہر شیخپوری۔ ہرمو ستیا باغ بہار

سہیل ملا۔ یادآوری کے لئے بے حد مشکور ہوں۔ زیر نظر شمارے میں تقریباً سبھی مضامین بہت اچھے ہیں۔ خصوصاً پریم چند سے متعلق مضمون پریم چند کے سوانحی مضامین اپنی نوعیت کا منفرد اور بے حد معلوماتی ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ سبھی افسانے، نظمیں اور غزلیں عمدہ رہیں۔ البتہ سروجنی نائیڈو کی نظم

INDIAN WEAVERS کا ترجمہ کوئی تاثر نہ چھوڑ سکا۔ جو لطف سروجنی نائیڈو کی نظم پڑھ کر آتا ہے۔ اس ترجمہ میں بالکل نہ آسکا۔ بہرحال یہ میری ناقص رائے ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ و دیگر قارئین بھی میری اس رائے سے متفق ہوں۔ شہر خیال میں منصور اعجاز صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ نے گذشتہ کسی شمارے میں شاہ جلال کیس سے متعلق کوئی مضمون رقم کیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مذکورہ بالا شمارہ مجھے مل جاتا۔ اور جبکہ یہ کہانی اپنے اختتام کو پہونچ چکی ہے اس وقت آپ کے نظریات و تاثرات سے مجھے آگاہی ہوتی۔

———— : عائشہ علوی، مظفر نگر

سہیل کا تازہ شمارہ نظر سے گذرا۔ مواد کا انتخاب قارئین کے ذوق تسکین پہ پورا اترتا ہے سہیل دن بدن نکھرتا ہوا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ کرے سہیل دن دونی ترقی کرے، آمین

———— : شیریں سحر، دھنباد

محترمی جمیل صاحب! خلوص و عقیدت

شمارہ مئی و جون سہیل ہم دست ہوا۔ ڈاکٹر شعیب راہی نے " اقبال اور عالمی ادب " کے عنوان سے بہت ہی اہم باتیں لکھی ہیں۔ مانک ٹالہ کا مضمون بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مشتاق شبنم کی جدید نظمیں متاثر کئے بنا نہیں رہ سکتیں۔ تا ودادیب نفا ابن فیضی اور حسن نجمی کی غزلیں خوب رہیں۔ اور کہانیوں کا حصہ تو اپنی مثال آپ ہے۔ گویا یہ شمارہ بہت خوب رہا۔

———— : ناقد نظمی، جمشید پور

محترمی جمیل منظر صاحب! آداب

ایک مدت کے انتظار کے بعد ہی، مئی و جون ۲۰۰۰ء کے سہیل میں آپ نے میرا مضمون " جالب " مکمل طور پر شائع فرمایا۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ مضمون میں کتابت کی جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تصحیح کے لئے آپ مہربانی فرما کر یہ مکتوب شائع کر دیں۔

مضمون میں صفحہ ۳۲ کالم ۲ سطر ۱۲ اور صفحہ ۳۹ کالم ۲ سطر ۲ میں مڈل بجائے میڈل چھپ گیا ہے اسی طرح صفحہ ۳۳ کالم ۲ سطر ۱۰ پہ نکالا بجائے " نکلا " صفحہ ۳۴ کالم ۱ سطر ۳ پہ (اشتراک لغت اور مستند شاعر کے استعمال کر کے رکھ دیا) بجائے اشتراک لغت اور مستند شاعر کے استعمال سے ثابت کر کے رکھ دیا۔ صفحہ ۳۵، کالم ۲ سطر ۱۹ میں کم سو بجائے کم سواد، صفحہ ۳۶ کالم ۱ سطر ۶ میں بجائے تکیلے بجائے تیکھے، کالم ۲ سطر ۲۴ میں سرمایہ ناز نہیں ہیں بجائے سرمایۂ ناز نہیں ہے اسی صفحہ پہ اسی کالم میں سطر ۸ میں سینکڑوں بجائے سیکڑوں صفحہ ۳۸ کالم ۱ سطر ۱۱ میں ان کے اخلاص و کردار کی تعمیر بجائے ان کے اخلاق و کردار کی تشکیل، کالم ۲ سطر ۲۵ میں نقش سے تعمیر بجائے نقش سے تعبیر صفحہ ۳۹ کالم ۱ سطر ۱۶ میں ترجیحاً بجائے ترجیح، کالم ۲ سطر ۶ میں سینکڑوں بجائے سیکڑوں ص ۴۱، کالم ۱ سطر ۲ اعتراف کم ہی کیا جبکہ بجائے اعتراف کم ہی کیا بلکہ سطر ۲۲ میں ناقابل بجائے ناقابل فہم کالم ۲ سطر کرہ ارضی بجائے کرۂ ارض صفحہ کالم ۲ سطر ۱۷ میں کم نویسی کم نویسی چھپ گیا ہے۔ ان ساری صورتوں میں جو خیال کر صحیح ہیں امداد اللہ کر کتابت کی غلطیوں کا [illegible]

———— : اسیم کاویانی، [illegible]

ہم ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی ایک فرقے کا ملک ہے ، نہ کسی خاص مذہب کا ۔ یہ سبھی فرقوں ، زبانوں ، مذہبوں اور کلچر کا ملک ہے ہندو ، مسلم ، سکھ ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے ۔ شاعر رویندرا اور قاضی نذر الاسلام یا ذکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں ۔ تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے سبھی گھروں میں گائے جاتے ہیں ۔ نانک کی وانی آج بھی ہندوں کے گھروں کو پاک کرتی ہیں ۔ مختلفتا میں ایکتا ہی ہماری خصوصیت ہے یہ آج کی نہیں صدیوں کی بنی روایت ہے ، یہی ہماری مریادا ہے آئیے ! ہم سبھی مل کر اس قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
RAHIMKHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال

Regd., R. N. I. July-4 R. N. I. Regd. No. 3520/57
The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
47 years of Publication Phone : 21573

ادریس سنسہاروی مرحوم

IDRIS SONSEHARVI NUMBER

ایک شمارہ

اِدریس سَنہاروی مرحوم

کے نام

—— ترتیب: ——
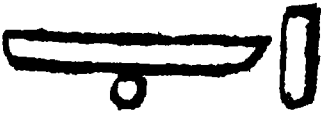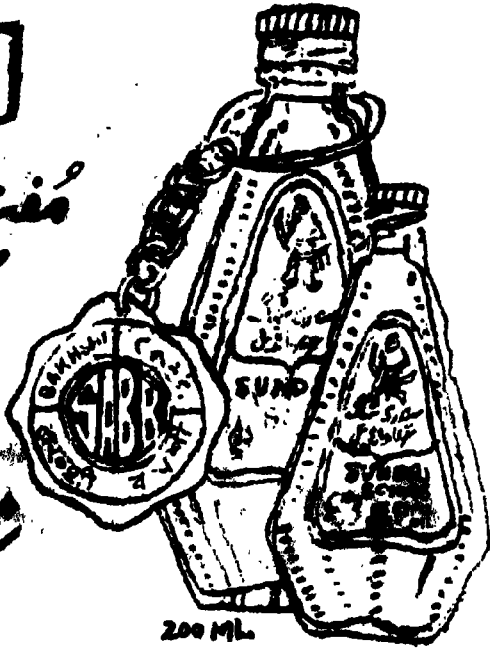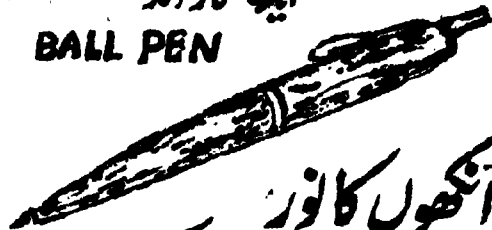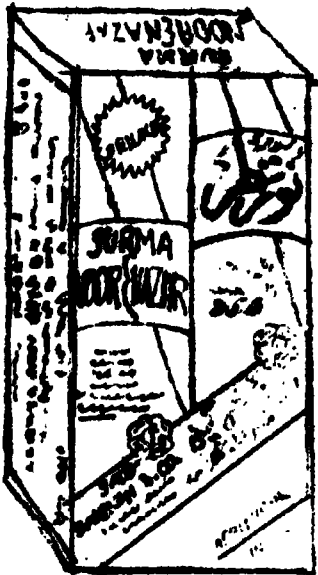
جمیل منظر سنہاروی

انتساب

اپنی والدہ مرحومہ اختر النساء بیگم کے نام
جن سے ہم لوگوں نے راہ اور روشنی پائی

"اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا"

انیس، مسعود، جمیل و نہال

عرضِ مُرتّب

۲۵ اگست ۱۹۸۸ء کو میرے والد محترم اور مدیر سہیل جناب ادریس سنہاروی کا انتقال ہوا تھا۔

ادریس سنہاروی مرحوم نے اپنی زندگی میں اردو کی کیا خدمتیں انجام دیں اور ان کی رحلت سے اردو کو کیا نقصان ہوا۔ اس کی نشاندہی میرے لئے مناسب نہیں بلکہ یہ کام تو صاحب فکر و نظر کا ہے۔

بہار اردو اکاڈمی نے موصوف کو بعد المرگ ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں اس سال مبلغ ۲۰ ہزار روپے کے خصوصی ایوارڈ سے بھی نوازا ہے اس کے لئے ادارۂ سہیل بہار اردو اکاڈمی کا بے حد ممنون و مشکور ہے۔

ہم اپنے قارئین سے اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ ادریس صاحب زندگی بھر جن نظریات کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ ہم بھی اسی نظریات کے قائل ہیں اور اسی نظریات کی پیروی کرتے ہوئے سہیل کو جاری رکھیں گے۔

میں ان دانشوروں کا بے حد شکرگذار ہوں جنھوں نے اپنے اظہار خیال سے نواز کر پسماندگان کو ممنون احسان بنایا ہے۔ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ ادریس سنہاروی مرحوم کے صحافتی خدمات کا تجزیہ ایک مختصر سے خصوصی نمبر کے ذریعہ ممکن نہیں۔ پھر بھی خصوصی شمارہ اپنی استطاعت کے مطابق موصوف کی دوسری برسی کے موقع پر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اداریوں کا انتخاب بہت مختصر ہے کیونکہ سہیل کی پرانی فائل دستیاب نہیں ہو سکی۔ خدا کرے ہماری پیش کش قابل قبول ہو۔

ہم قارئین کی رائے اور مفید مشوروں کا احترام کریں گے۔

برادرم حافظ محمد ادریس صاحب کی وفات پر تاریخی جملے

از حضرت شاکر گیاوی (جمشیدپور)

اے گیا ــــ آہ حافظ محمد ادریس

۱۴۰۴ھ

وائے گیا۔ حافظ محمد ادریس

۱۴۰۴ھ

آہ مواد غنب حافظ محمد ادریس صاحب

۱۹۸۴ء

آہ مدیر دلبند ماہنامہ سہیل گیا حافظ محمد ادریس

۱۹۸۴ء

حافظ محمد ادریس جنتی اقدس

۱۹۸۴ء

جی حافظ محمد ادریس صاحب سنہاروی بھی چل بسے

۱۹۸۴ء

جناب حافظ محمد ادریس صاحب سنہاروی اب کہاں

۱۹۸۴

کہاں ہے جناب حافظ محمد ادریس صاحب سنہاروی بس

۱۹۸۴

اُف سنہاروی کے حافظ محمد ادریس بھی آپ چل بسے آہ!

۱۹۸۴

وفات لائق حافظ محمد ادریس

۱۹۸۴

برادرم جناب حافظ محمد ادریس سنہاروی کی وفات پر

قطعۂ تاریخ

(از شاکر گیاوی (جمشید پور))

بے خبر کوئی ہو یا باخبر اخبار نویس
موت سے کس کو مفر ہے یہ مرے مانوس انیس

وقت معلوم نہیں گرچہ وہ لے آئیگی
موت وہ موت کہ جس کی کوئی قیمت ہی نہیں

کون رہنے کو ہمیشہ کے لئے آیا ہے
دیکھئے گورِ غریباں تو نِزائے ہوئے سیس

صرف انساں ہی نہیں بلکہ ہر فانی مخلوق
ہونگے معدوم یہ روشن مہ و مہر و برجیس

کیجئے گا نہ کبھی زیست پہ اپنی تکیہ
خام ہے خام ہے دُنیائے دنی کی تاسیس

ماہنامہ جو گیا کا ہے مسمّٰی بہ سہیل
اس نے غمناک خبر دی یہ بہ الفاظ سلیس

چل بسے اسکے مدیر آہ بدورانِ اگست
سہ پہر شنبہ کے دن اور بتاریخ پچیس ۲۵

منھ کو آتا ہے کلیجہ جو وہ یاد آتے ہیں
اب کہاں ویسے ملیں گے ہمیں ہمدرد جلیس

اُن میں خوش ذوقی، خوش طبعی و خوش خلقی جو تھی
ساتھ سب لیتے گئے چھوڑ کے تحریر نفیس

وہ نہ تھے گرچہ نظر آئے تھے لیکن ایسے
ہمنشینوں میں کہ جیسے کوئی بیٹھا ہو رئیس

وہ ملے جب بھی تو ملے ہم سے بصد شانِ خلوص
ان میں دیکھا نہ گیا گاہے کوئی امرِ خسیس

وہ گئے ہیں جو "حنفی مذہب" کی وصیت کرکے
چاہیئے انکو کہ وہ بھی ہوں عدوئے ابلیس

لغزشیں انکی معاف اے مرے مولا کردے
بخش دے انکے کبھی اعمال خلافِ تقدیس

سوچا جب ہم نے کہ انکا سنِ رحلت لکھیں
دل میں اک درد اٹھا ایسا کہ جیسے ہو ٹیس

عیسوی سن نے بہ اندوہ کہا شاکر سے
حافظ و اہلِ شرف آہ محمد ادریس

۱۹ ۶ ۸۲

قیوم خضر

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا تیرے بعد

میاں محمود [illegible] کے نام

یہ چند سطریں
جن میں تسلی نہ تشفی
نہ دعائے سکون نہ اظہارِ تعزیت
صرف دعائے عزم و استقلال کا نذرانۂ پُرخلوص!

خبر ملی
پچیس اگست ۱۹۸۴ء کو
جب کہ اندرا گاندھی کی جابرانہ اور آمرانہ
سیاسی پالیسیوں کے خلاف
تمام مخالف پارٹیوں نے
ہڑتال کر رکھی تھی
اُسی روز اودسینؔ اشتراکی جماعت کا ایک ممبر
ظلم و تشدد کے خلاف
اس دُنیا کی بھری اسمبلی سے احتجاجاً "واک آؤٹ" کر گیا
اور احتجاج بھی اس عزم کے ساتھ
کہ اب وہ پھر کبھی ایسی دشمنِ انصاف اسمبلی میں
لوٹ کر نہیں آئے گا
سلام تجھ پر اے غیور و خوددار، رِند پاک طینت!
سلام تجھ پر کہ تو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر تھا!

تیری موت پر
غم و درد سے میری آنکھوں کے پیالے چھلک چھلک گئے
اور
ضربِ غم سے شیشۂ دل چھنک چھنک گیا ●●

غریب بدایونی

رباعیات و قطعات

حضرت ادریس سنسہاروی کی رحلت پر

○

سنا ہے آج یاروں کو بڑی تکلیف پہونچی ہے
وفا کے دل فگاروں کو بڑی تکلیف پہونچی ہے
کوئی رویا ہے پہروں حیف انجام محبت پر
فلک کے چاند تاروں کو بڑی تکلیف پہونچی ہے

○

○

کرتا تھا زمانہ تجھے جھک جھک کے سلام
ہوتا تھا ہر اک بزم میں تیرا احترام
غمگین و پریشاں تو رہا بھی تو کیا
اخلاص تھا تجھ میں ہوا وہی خوش انجام

○

○

کب راتوں کو نغمۂ ساز سنا کرتے ہیں
سرشارِ وفا کی آواز سنا کرتے ہیں
افسوس کہ اک ایک قدم پر اکثر
ہم گریۂ شہباز سنا کرتے ہیں

○

○

دے مرے دل کو دلاسا آسماں
پیار کا میں بھی ہوں پیاسا آسماں
کر تصوّر سایۂ ادریسؔ کی طرح
ہے اگر میرا شناسا آسماں

○

اندازہ ہو رہا ہے چمن کے وقار سے
پیچھے نہیں ہیں دور نگاہِ بہار سے
ہے آج ادریسؔ میری نگاہوں کے سامنے
کیسے غریب دور رہے اپنے یار سے

○

یک سپنا دوست سپنا سپنا
ے نام پہ یہ اپنا مالا جپنا
کیا غریب کہ اب تو
ب بھی اپنا خیال بھی اپنا

○

جس سے دنیا کے لوگ خوش ہو جائیں
ایسی خدمت کا کوئی ذوق نہیں
غم ادریسؔ کا ہے ہر وقت
کسی خوشی کا مجھ کو شوق نہیں

○

ی ہے یہ دل کو ڈس رہی ہے روشنی
کو ہجرِ ادریسؔ میں جھلس رہی ہے روشنی
ے کٹتا جا رہا ہوں کیا کروں
ے غریب تیر سی برس رہی ہے روشنی

○

غم میں بےہوش ہو گئے ہیں ہم
ایک غفلت سی مجھ پہ طاری ہے
چھوڑ کر تم چلے گئے ہو کیوں
یہ زندگی اب مجھ پہ بھاری ہے

○

دیوانہ ہوں نہ روک اے دنیا مجھے
دنیا سے اور دنیا والوں سے کام کیا مجھے
میں جا رہا ہوں چھوڑ کر دنیا کو آج
کہ ادریسؔ نے جنت سے دی ہے صدا مجھے

○

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقے کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا، یہ سبھی مذہبوں، زبانوں، فرقوں اور کلچر کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے یہ ملک بنا ہے۔ شاعر رویندر اور قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھوں نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت آج بھی اس ملک کے سبھی گھروں میں گائے جاتے ہیں۔ نانک کی وانی آج بھی ہندوؤں کے گھروں کو پاک کرتی ہے۔ مختلفتا میں ایکتا ہی ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی بنی روایت ہے۔

...یہی ہماری مریادا ہے

آیئے، ہم سب مل کر اس روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

[illegible] 237-[illegible] ([illegible]-162) / 86 - 87

بہزاد فاطمی

حق مغفرت کرے

ادریس مرحوم سے پہلی بار کب تعارف ہوا۔
یہ تو صحیح طور پر کہنا مشکل ہے البتہ ان کے والد بزرگوار
حضرت بسمل سمنباروی سے غائبانہ تعارف رسالہ
سہیل کے اجرا کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوا۔ پھر تو جب بھی کسی
ادبی تقریب میں شرکت کی غرض سے یا کچھ اور نجی کاموں
سے گیا جانے کا اتفاق ہوتا تو میں سہیل کے دفتر میں حاضری
دینا اپنا فرض سمجھتا۔ جہاں حضرت بسمل سمنباروی اور
دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں۔ حضرت [illegible] سے
بھی یہیں ملاقات پہلی بار ہوئی۔ اکثر شعر و شاعری کی
صحبتیں بھی ہوا کرتیں۔ ادریس مرحوم سے [illegible]
سلسلہ میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے سن میں
چھوٹے تھے اور کم سخن بھی۔ لہٰذا بے تکلف ہونے میں دیر
لگی۔ بے تکلفی اس وقت بڑھی جب ان کے بے تکلف
دوست اختر پیامی (مقیم پاکستان) اور سید محمد علی
پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ سٹی میرے ہم زلف
ہوئے۔ اس کے بعد تو ملاقاتوں کا سلسلہ برابر جاری رہا
جس میں علمی و ادبی تذکرے ہوتے، سیاسی حالات
پر تبادلہ خیال ہوتا۔ [illegible]

کاموں سے فارغ ہوتے تو سیر و تفریح کا پروگرام بنتا۔
[illegible]ء میں ملازمت ملی تو اختر پیامی اور سید
علی اپنی تعلیم کے سلسلہ میں ادھر ادھر ہو گئے تو یہ شیرازہ
بکھر گیا۔ شیرازہ تو بکھر گیا لیکن ادریس مرحوم اپنی وضع
داری پہ قائم رہے۔ وہ اس طرح کہ دوران ملازمت
جہاں بھی رہا رسالہ سہیل پابندی سے بھیجتے اور خطوں
سے نوازتے رہے۔ ایک دفعہ میری بچی کے حکیمی علاج
کے سلسلہ میں متعلقین کو گیا جانا پڑا۔ میں اپنی ملازمت
کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکا۔ میرے گھر کے لوگ ادریس
سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور انہیں ہمارے اور ان
کے درمیان تعلقات کا علم بھی تھا۔ لہٰذا بے تکلف انہیں کے
مکان میں ٹھہرے۔ ادریس اور ان کے متعلقین جس
خلوص اور ہمدردی سے پیش آئے اور ان کی وجہ سے
جو سہولتیں میسر آئیں ان کی یاد اب بھی میرے افراد خانہ
کے ذہنوں میں تازہ ہے۔

سہیل کے جمیل مظہری نمبر کے لئے مضمون کی
فرمائش مجھ سے بھی کی گئی تھی۔ ملازمت میں مصروفیت
[illegible]

ہ سکا اور رسالے کی کتابت شروع ہو گئی۔ اتفاق
ے انہیں دنوں مجھے اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں گیا
لنے کا اتفاق ہوا۔ کام ختم ہونے کے بعد مجھے اسی دن
لیس ہونا تھا۔ واپسی کے ٹرین ملنے میں چند گھنٹوں کا
قفہ تھا۔ اس وقفہ میں سہیل کے دفتر پہونچا۔ تو ادریس
صت زیادہ مشغول پایا۔ حسبِ معمول تمام کاموں کو
ہوڑ کر میری جانب متوجہ ہوئے اور ایک سخت گیر مہاجن
ی طرح مضمون کا تقاضہ کیا۔ میں نے عذر پیش کیا۔
ابل سماعت نہ سمجھا اور کمرہ بند کر کے کاغذ و قلم مجھے
مالے کیا۔ مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ اور راہ فرار مسدود
ی نہ کسی طرح دو گھنٹے سے بھی قلیل مدت میں یہ مضمون

تیار ہو گیا۔ معاوضہ کے طور پر ایک پُر تکلف ناشتہ
ملا جس کی لذت پر ان کے خلوص کا غلبہ تھا۔ شکریہ
کے طور پر اسٹیشن تک پہونچانے تشریف لائے۔

ادریس کے بے پناہ خلوص اور ان کی
شخصیت کا یہ ایک شاندار پہلو ہے۔ حقیقت امر
یہ ہے کہ مرحوم ان لوگوں میں سے جنھیں نہ تو ستائش
کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلہ کی پرواہ۔ خاموشی سے اور
بغیر کسی نمود و نمائش کے عمر بھر علمی و ادبی خدمت
کرتے رہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں کیا۔ اپنا خون جگر دیکر
سہیل کو زندہ اور تابندہ رکھا۔ ایسے لوگ اگر معدوم
نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

گلے برفت کہ نہ آید بعد بہارِ دگر

۲۵ اگست ۸۴ء کو ساڑھے تین بجے دن میں برادرم ... واصل بحق ہوئے مگر مجھے یہ روح فرسا خبر بہار اردو اکیڈمی کے خبر نامہ جو مجھے ۱۳ اکتوبر ۸۴ء کو موصول ہوا، ملی۔ یکے بعد دیگرے لوح دل پر ثبت نقوش ابھرنے لگے۔ نیز آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اور جسیم مرحوم سے میرا غائبانہ تعارف سہیل بھائی (سہیل عظیم آبادی مرحوم) کے توسط سے ہوا تھا۔ اور انہوں نے ہی کاذ پر میرے مضمون کو دیکھ کر مشورہ دیا کہ مضمون ہذا کو سہیل گیا کو دیا جائے۔ اسی زمانے سے ہماری مراسلت شروع ہوئی جو اس مکتوب گرامی پر اختتام پذیر ہوگئی جو ۱۵/ جولائی ۸۴ء میں لکھا اور انہوں نے سرکار جعفری کے ذریعہ ترتیب خصوصی شمارے کیلئے میرے پیش کردہ مضمون کے بارے میں مجھے لکھا تھا۔ انہیں میرا مضمون بہت اچھا معلوم ہوا اور انہوں نے منجملہ دیگر امور یہ بھی لکھا کہ آپ عالمی اردو سیمینار میں شرکت کے لئے سرینگر جا رہے ہیں اپنا مضمون ساتھ لیتے جائیں اور جناب جگن ناتھ آزاد اور جناب آل احمد سرور کو ضرور دکھائیں۔ ان کا میرے لئے اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ خط ان کا میرے نام آخری خط تھا، لہٰذا اس کی یاد دل میں ٹیس بن کر کروٹ لیتی ہے۔

جب سہیل کا شمارہ اگست ۸۴ء موصول ہوا۔ غالباً اکتوبر کے اواخر میں، تو سرورق پر ان کی تصویر کو دیکھ کر خیالات دائرہ در دائرہ دورِ گزشتہ کی طرف برق رفتاری بلکہ ذہن رفتاری سے ۱۹۳۶/۱۹۳۷ء تک پہنچ گئے۔ اسے میں غائبانہ تعارف کہتا آیا ہوں۔ اور یہ تعلیم تو اس شخص کی ہے جس سے مجھے دو بار شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ ہمارا تعارف تو سہیل بھائی نے کروایا تھا۔ لہٰذا نظریاتی اعتبار سے ہم سب ہم خیال تھے۔ اور "ہم دلی از ہم زبانی بہتر است"۔ کاش! تجدیدِ ملاقات کر لیا گیا ہوتا۔ میری عمر کے اشخاص جو بیسویں صدی کا قریب ۲/۳ حصہ اور وقت کے اس بڑے حصے سے متعلق تاریخی واقعات کو دیکھ چکے ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ اس برصغیر کی سیاسی فضا ۱۹۳۶

ہنا مہ سہیل ہو گیا
ہیں کہاں تک کدورت و سموم ہو چکی تھی۔ فرقہ واریت
کا دریا انگریز حکمرانوں کے احکام بجا لانے والے
اشخاص کی سازش سے کروٹ سے بہنے لگا تھا۔
کروٹ بہتے ہوئے اس دریا کو تعصبات کے بند
کے دروازے وا کر کے اور زہریلا پانی چھوڑ کر
سیلاب زدہ کیا جا رہا تھا۔ فلک شگاف
نعرے اثر انداز ہو رہے تھے "لیکے رہیں گے پاکستان"
"اکھنڈ بھارت" "ہندی ہندو ہندوستان"
"نعرۂ تکبیر، غلبۂ اسلام" "جے جے بجرنگ ولی"
"ہر ہر مہادیو"۔ جو بلند خیالات اشخاص تھے وہ
بستی کی جانب رواں دواں ہونے سے لوگوں
کو روک رہے تھے ۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا،
مسلم لیگ، جماعتِ اسلامی، بلیجہ پارٹی، اتحاد
المسلمین، جیسے مولوی یا بابائی استعماریت نے نمک
حلال، ہندوستان کو صدیوں پیچھے رکھنے کے
درپے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزی حکومت
ہی پر وقت کی سوئی رکی رہے۔ ترقی پسند
عناصر کو بری طرح کچلا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی
پر پابندی لگی ہوئی تھی مگر چاہے بایں ہمہ
معروفِ جدوجہد تھے۔ کامریڈ جوشی، کامریڈ
ڈانگے، بنے بھائی، سردار جعفری، کیفی اعظمی
جیسے روشن دل و دماغ لوگ بھی تھے، اور ادریس

سنبھالا روزی نو عمر ہوتے ہوئے بھی ادارے کے
فرض میں کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔

ہندوستان منقسم ہو گیا، دائرہ در
دائرہ نئے مسائل لاحق ہو گئے۔ ادریس مرحوم
جو کئی جرائد سے وابستہ رہے تھے۔ اپنی تمام تر
توجہات "سہیل" ماہنامے پر صرف کرنے لگے اس
کو رسالہ ہذا کا مدیر مؤسس ہی کہا جا سکتا
ہے۔

ادریس مرحوم کے سپرد قلم کئے ہوئے اداریے
ہمیشہ مسائل اور مشکلات پر مرتکز ہوا کرتے
تھے۔ سہیل کا اداریہ "نمود" عنوان کے تحت
نکلتا ہے۔ اور اپنی نوعیت اور اہمیت کے
اعتبار سے اسکو کبھی "نمود بے نمو" نہیں
کہا جا سکتا۔

سہیل عظیم آبادی نمبر، جمیل مظہری نمبر،
کیفی اعظمی نمبر، کلیم الدین احمد نمبر وغیرہ جن کی
ترتیب و تہذیب ادریس صاحب ہی کے
ہاتھوں ہوئی، اردو ادبی صحافت میں کس مقام
و مرتبہ کے حامل وہ خصوصی شمارے ثابت
ہوئے اس کو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ صد حیف!
"سردار جعفری نمبر" جسکی پر بہت محنت کر
رہے تھے ان کی حیات میں نہ نکل سکا۔ ہنوز
زیر ترتیب ہے۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔
ان کے انتقال پر ملال پر تعزیتی خطوط ملک
کے گوشے گوشے سے موصول ہونے لگے۔ جن میں

...ہنامہ سہیل، گیا
...سے کچھ اس شمارے میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ ان
...زیتی مراسلوں میں مرحوم کی ذات و صفات سے متعلق
...بو نقوش ابھرتے ہیں کاش ان کو مزید تابندگی و
...رخشانی رسالہ سہیل سے ملتی رہے ۔

خاک شد فطرت بہ پستی لیک مژگاں [illegible]

ور نہ انا تا بہ بام آسماں یک زینہ بود

(بیدل)

مرحوم ایک عمر ترقی پسند تحریک سے وابستہ
...ہے۔ [illegible] انسانی فلاح و بہبود کی
...ار کو پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا
...می ۔

تعزیت گزاروں میں بنگال لیجسلیٹو اسمبلی کے
...پٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس، ریاست
...ریانہ کے گورنر اعلیٰ حضرت سید مظفر حسین برنی،
...، انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کمیٹی گیا کے شری برہنند،
بہار منشیات محکمہ کے معتمد جناب سید رضا امام [illegible]وی،
ہندی روزنامہ "جن شکتی" کے نامہ نگار، اعظم گڑھ
کے جناب علی حماد عباسی، اخوان الصفا ٹرسٹ گیا
کے جناب اصغر علی انجینیئر، علی سردار جعفری، بہار
اردو اکاڈمی کے جناب شہاب الدین دسنوی،
صدر انجمن ترقی اردو بہار، سالک لکھنوی،
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سید محمد محسن
وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ادریس سنہاروی اردو زبان و ثقافت
کے بے لوث و خاموش خدمت گزار تھے۔ ترقی پسند
تحریک سے ان کی وابستگی اور اسے فروغ دینے
کے لئے ان کی مساعی جمیلہ کی یاد ہمیشہ تازہ
رہے گی ۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی

اِدریس سَنبھاروی مرحوم: ایک تاثر

کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے، میں گیا میں نیا نیا آیا تھا اور عارضی طور پر مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی رہائش گاہ پہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں کانگریسی مسلمانوں کا ایک جلسہ پٹنہ میں منعقد ہوا تھا جس میں آپسی اختلاف کی وجہ سے مار پیٹ تک کی نوبت آگئی تھی۔ کچھ سرکردہ سیاسی لوگ زخمی ہوگئے تھے اور بعض معروف شخصیتوں (ایک وزیر بھی شامل تھے) کے لڑکوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ ہر طرف رنجش اور تلخی کا ماحول تھا۔

میں نے اپنے ایک دوست کو صحیح حالات جاننے کے لئے ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے ٹیلی فون پر تفصیل کے ساتھ بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لئے فوراً ملنے آگئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ کھدر کے کرتہ اور پائجامہ میں ملبوس، چوڑے فریم کا چشمہ لگائے، بھاری بھرکم شخصیت کا مالک۔ بات چیت کے دوران زیادہ تر خاموش بیٹھے رہے۔ میرے دوست نے تعارف کروایا تو پتہ چلا کہ سہیل کے مدیر جناب ادریس سنبھاروی ہیں۔ یہ تھی ادریس مرحوم سے میری پہلی ملاقات۔ اس وقت انھوں نے جس سنجیدگی اور متانت کا نقش میرے ذہن پر چھوڑا تھا وہ آج تک باقی ہے۔

اس کے بعد تو ان سے ملاقاتوں کا ایک لمبا سلسلہ رہا۔ اور زندگی کے آخری لمحہ تک انھوں نے اپنے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کو قائم رکھا۔ جس محبت اور خلوص کے ساتھ وہ شروع میں ملے اسی انداز سے آخر تک ملتے رہے۔ ملنے جلنے میں یہ وضعداری اور ہموار ی گنتی کے لوگوں کی بات ہے۔ آگے آنے والی پیڑھی کی بات تو چھوڑیئے خود ہماری پیڑھی میں یہ ذاتی جوہر اب جنس کمیاب ہو کر رہ گیا ہے۔

ادریس صاحب اشتراکی ذہن رکھتے تھے اور ایک عرصہ تک بنے بھائی (سجاد ظہیر) کی ادارت میں بمبئی سے نکلنے والے کمیونسٹ ہفتہ وار "قومی جنگ" سے منسلک رہے۔ ادب اور صحافت کا شوق اُن کو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد حضرت بسمل سنبھاروی مرحوم ایک بلند پایہ شاعر اور اہم صحافی تھے جن کا بیّن ثبوت سہیل کی قدیم فائلوں میں جا بجا ملتا ہے۔

ادبی اور صحافتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ادریس صاحب نے سیاست کے میدان میں عملی طور پر بھی کام کیا چنانچہ ۱۹۵۲ء کے عام چناؤ میں کمیونسٹ امیدوار کی حیثیت سے انھوں نے حصّہ بھی لیا۔ بدقسمتی سے کامیاب نہ ہو سکے اور پھر وہ سہیل کی جانب سے زیادہ جوش وخروش سے راغب ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے ان کا اصل میدان بھی یہی تھا۔ انھوں نے سہیل کے کچھ خاص نمبر بھی شائع کئے جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ "جمیل مظہری نمبر" جو پہلی بار دو حصّوں میں کلام حیدری کے تعاون سے شائع ہوا تھا۔ آج بھی اس موضوع پر یہ منفرد کارنامہ ہے۔ دوسری بار "جمیل مظہری نمبر" مرتب کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر یہ کام انھوں نے کر دکھایا۔ اور دوسری دفعہ جو نمبر ہمارے سامنے آیا وہ خاصا وقیع ہے۔ اس کے علاوہ "پریم چند نمبر" "بھاگلپور نمبر" اور "کیفی اعظمی نمبر" وغیرہ بھی ایک اہم جگہ رکھتے ہیں۔

ادریس مرحوم بڑے خوددار انسان تھے۔ ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ زندگی کے تمام معاملات میں بھی ان کے وقار کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ایک بار وہ "آستانہ" کے مدیر پیرزادہ محسن فاروقی (مرحوم) سے ملنے دہلی گئے کہ علامہ جمیل مظہری (مرحوم) کی ایک نظم کے سلسلہ میں کچھ لوگوں نے مذہبی قسم کی تکرار (Controversy) پیدا کر دی تھی۔ پیرزادہ بھی اس سے متاثر تھے۔ ادریس صاحب نے جیسے ہی ان کو سہیل کا پرچہ پیش کیا انھوں نے نہایت حقارت کے ساتھ اسے ایک طرف پھینک دیا۔ اتنے میں اندر سے چائے بن کر آگئی۔ فاروقی صاحب نے چائے بناکر ٹرے ادریس صاحب کے آگے بڑھایا۔ انھوں نے پورا ٹرے اٹھاکر اسی انداز میں ایک طرف پھینک دیا جس انداز میں فاروقی صاحب نے پرچہ پھینک دیا تھا۔ ادریس صاحب چلے آئے۔ اور فاروقی صاحب ان کا منھ دیکھتے رہ گئے۔ اتنے خوددار تھے ادریس صاحب۔

آخر میں "سہیل" کو نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع کرنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے بھی انھوں نے خطوط لکھے اور پرچہ کو قلمی تعاون کی طرف توجہ دلاتے رہے لیکن صحت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ اور اتنی توجہ نہ دے سکے جتنی وہ دینا چاہتے تھے۔ اپنے بیٹوں کو انھوں نے فکری اور ذہنی طور پر اس درجہ متاثر ضرور کیا تھا کہ ان کی زندگی ہی میں سہیل کی اشاعت کی ذمہ داری ان لوگوں نے سنبھال لی تھی اور بڑے بیٹے نے گیا کی سیاسی زندگی میں ایک اہم جگہ بنالی تھی۔ ایک سہیل کی ادارت اور ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں میں فعال ثابت ہوا تو دوسرا کمیونسٹ پارٹی کا ایک باشعور اور پرجوش کارکن بن کر ابھرا۔ یہ دونوں چیزیں انھیں بیحد عزیز تھیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے بیٹوں کو ان میدانوں میں کامیاب دیکھ کر

انھیں کتنا سکون ملتا ہوگا۔ قلب کے مریض تو تھے ہی،
ایک دن اپنے بہت سے دوستوں، عزیزوں اور
ساتھیوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ
ہو گئے۔ لیکن جب تک سہیل زندہ ہے اور ترقی پسند
تحریک زندہ ہے اُن کا نام بھی زندہ رہے گا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ادریس سنہاروی اپنے اداریوں کے آئینہ میں

خیر مقدم کریں گے۔ سہیل غلط اور بھونڈے تجربہ کی
ہمت افزائی کسی حال میں نہیں کریگا اس لئے کہ
یہ ساری باتیں انسانی سماج کے لئے زہر ہیں۔
ادب کو جامِ حیات ہونا چاہیئے،
زہر کا پیالہ نہیں۔"
("سہیل" ستمبر ۱۹۷۰ء)

مذکورہ بالا اقتباس اس امر کی دلالت کرتا
ہے کہ ادریس صاحب تجربات کا استقبال کرتے
ہیں مگر انہیں معاشرے کی افادیت کا تلازمہ قرار
دیتے ہیں۔ اپنے اداریوں میں ادریس صاحب کی
شخصیت مکمل طور پر منعکس ہے۔ سیاست، سماج
ادب، زبان، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اقتصادی
استحکام کے سلسلہ میں ادریس صاحب کا رویہ
نہایت مفکرانہ اور مدبرانہ رہا ہے۔ انھوں نے
سہیل کے اداریوں کے ذریعہ ہندوستانی
معاشرہ میں صحت مند انقلاب لانے کی کوشش
کی ہے اور یہ صحت مند انقلاب آج نہیں تو کل
ضرور آئے گا۔

ادریس سنہاروی

اردو سے متعلق ادریس سنہاروی صاحب کی تجاویز
ان کے منصوبے اور مطالبے بھی "سہیل" کے صفحات
میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔

ادریس سنہاروی بنیادی طور پر خاموش
طبع تھے لیکن اُن میں کام کرنے کا غیر معمولی جذبہ تھا۔
جس بات کو وہ عام انسانوں کے لئے مفید سمجھتے
تھے اس میں مکمل طور پر دلچسپی لینے لگتے تھے۔
آج کے تاجرانہ ماحول میں انھوں نے
سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر انسان اور انسانیت
کی خاطر اپنے محدود وسائل میں جو اقدامات کئے
ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

بہار میں اقلیتوں کے مفاد میں سرکار کے ذریعہ اٹھائے گئے قدم

حکومت بہار صوبہ کے اقلیتی فرقے کے لوگوں کی ترقی اور کلیان کے لئے کمربستہ ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی رہنمائی میں صوبائی حکومت ایسی کئی یوجنائیں سختی سے عمل میں لا رہی ہے جن سے ان اقلیتوں کو نیشنل مین اسٹریم سے جوڑنے میں مدد ملے گی۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے، مدرسوں اور اردو ٹیچروں کو آسانیاں دینے، بنگلہ، زبانی وغیرہ زبانوں کی ترقی کے لئے مختلف اکاڈمیاں قائم کرنے، اردو روزناموں کے لئے ٹیلی پرنٹر لگانے کے لئے کل خرچ کی آدھی رقم مدد کی شکل میں دینے اور پٹنہ میں اردو کا مکس قائم کرنے جیسی اہم سعی کے علاوہ سرکار کے ذریعے مندرجہ ذیل کام کئے جا رہے ہیں۔

(۱) خاص فساد مخالف پولس بل میں ۲۰ فیصد کو چھوڑ کر اقلیتی فرقے کے لوگ سے ہی بحالی۔

(۲) اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے لئے سرکار کے ذریعے۔ ۱ کروڑ روپے کی حصہ پونجی سے بہار اسٹیٹ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ یہ کارپوریشن مکرشیل انتظام کے لئے مذہبی اقلیتوں کے ایسے نمائندوں کو جن کے خاندان کی سالانہ آمدنی (کھیتی سے ہونے والی آمدنی کے ساتھ) ۱۲ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہو، معاشی اور پیشہ ور کاموں کے لئے ۴۰ فیصد (زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے) قرض کے طور پر صرف ۵/ روپے سالانہ سیکڑہ سود کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ یوجنا لاگت کا باقی ۶۰ فیصد قرض کی شکل میں دوسرے بینکوں سے فراہمی کا انتظام کرایا گیا ہے۔ قرض کے لئے درخواست ضلع ادھیکاری اپنے ذریعے لیں گے اور اس کی جانچ پڑتال اور اپنی سفارش کے ساتھ قرض کے لئے درخواست کو بینکوں کے افسران کو بھیجیں گے۔

صوبائی حکومت کے ذریعہ انوسوچیت ذات اور جن ذات لوگوں کے اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے ایسے کارپوریشنوں کا قیام پہلے ہی عمل میں آچکا ہے۔

وزیر اعلیٰ شری بندیشوری دوبے کی مضبوط قیادت میں صوبائی حکومت اقلیتوں کو پوری طرح تحفظ دینے کے لئے پیری بدھ ہے۔ سرکار امید کرتی ہے کہ سبھی ورگوں کے لوگ بڑی محنت سے بنائے اتحاد اور ایکتا کے ماحول کو بنائے رکھنے میں ہر ضروری مدد دیں گے

محکمۂ تعلقات عامّہ

सू० ज० सं० वि०-287-बी(क्र-162)/86-87

علیم اللہ حالی

ادریس سنبھاروی مرحوم

(میرے تاثرات میرا مطالعہ)

بڑے لوگ کون ہوتے ہیں۔ انسان میں عظمت کے آثار کیوں کر پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا کوئی ایسا معروضی جواب نہیں ہو سکتا جو تسلی بخش بھی ہو۔ اس لئے کہ مختلف لوگ عظمت کے لئے مختلف علامات متعین کرتے ہیں۔ میرا معاملہ کچھ عجیب ہے اس سلسلہ میں میرا بہت سے لوگوں سے اختلاف ہے۔ میں دولت و ثروت کو بڑائی اور عظمت نہیں سمجھتا۔ صرف علم بھی بڑائی نہیں ہے، شہرت و مقبولیت بھی نہیں، جاہ و منصب بھی نہیں، حسن و سخاوت بھی وجہ عظمت نہیں سکتی۔ میرے سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عظمت کے لئے کوئی ایک آدھ خصوصیات کا اکٹھا ہو جانا کافی نہیں۔ اس لئے کہ بسا اوقات کچھ خصوصیات کسی فرد میں تو ہوتی ہیں مگر کچھ ایسی خامیاں بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ شخص عظیم انسان نہیں بن سکتا۔ مثبت اور منفی خصائص کا یہ تال میل اور تناسب توازن بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ایک شخص صاحب ثروت تو ہے مگر حد درجہ بخیل، اور یہ بخل اس کی شخصیت کی اس خوبی کو یکسر مفقود کر دیتا ہے۔ لہذا خوشگوار اور مستحسن خصائص اس وقت اپنے جوہر دکھاتے ہیں جب ان کے مقابلے میں قابل مذمت نقوش نہ ہوں یا کم سے کم ہوں۔ علم کے ساتھ کبر و نخوت مل جائے، عمل کے ساتھ خود غرضی اور نفس پرستی آ جائے، بہترین صلاحیت کے ساتھ ساتھ احساس برتری کی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جائیں ——— تو سارے کا سارا معاملہ ہی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ خوبیاں تو چھپ کر اور دب کر کہیں رہ جاتی ہیں اور شخصیت کے منفی نقوش واضح ہو کر انسان کو بدنما بنانے لگتے ہیں۔

ان تمہیدی سطور کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جناب ادریس سنبھاروی صاحب کی شخصیت میں مجھے عظمت اور بڑائی کے متعدد نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ ملک کے شہرت یافتہ اہل قلم بھی نہیں تھے۔ ان کے پاس دولت و ثروت کا خزانہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی اونچے منصب پر بھی فائز نہیں رہے۔ ان کی پشت پر خاندانی وجاہت اور بزرگوں کی ناموری کا سنہرا لیبل بھی نہیں لگا ہوا تھا ——— لیکن اس کے باوجود میں جیسے جیسے ان کے قریب ہوتا گیا مجھے ان

کی عظمت کا احساس ہوتا گیا۔ تجزیہ کرتا ہوں تو اس نتیجہ تک پہونچتا ہوں کہ اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں NEGATIVE TRAITS نہیں تھے۔

میں نے انہیں سب سے پہلے غالباً ۱۹۶۵ء میں دیکھا تھا، اس وقت بس ایک آدھ ملاقات ہوئی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۷ء تک یعنی تقریباً دس سال کے عرصہ میں ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی ۱۹۷۷ء میں جب میں دوبارہ ملازمت کے سلسلہ میں گیا آیا تو کبھی کبھار ان سے ملاقات ہوتی رہتی لیکن یہ ملاقاتیں اکثر و بیشتر مختصر رہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ شاید ایک آدھ بار ہی کسی مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ہو سکی ہے۔ وہ ہمیشہ بزرگانہ شفقت اور غائت محبت کے ساتھ ملے۔ دو تین ملاقاتیں ان کے دولت کدہ پر ہوئیں۔ اور بیشتر ملاقاتیں چھتہ مسجد حکیم سعد اللہ ظہیر صاحب کے مطب میں جہاں وہ قریب قریب پابندی سے جایا کرتے تھے۔ شام کا حصہ وہ وہیں گذارتے تھے۔ اور مطب میں اسی طرح بیٹھے رہتے تھے کہ کسی نئے آدمی کے لئے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ادریس صاحب اور سعد اللہ ظہیر صاحب میں صاحب مطب کون ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب سے ان کے کتنے دیرینہ اور کتنے گہرے تعلقات تھے۔

ادریس صاحب کے حالات زندگی سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہار میں بالخصوص شہر گیا میں اشتراکی تحریک کو تقویت پہونچانے میں انہوں نے اہم اور بنیادی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ تو اس زمانے کی بات تھی جب کمیونزم کا آندھی زور و شور سے چل رہی تھی۔ لیکن جب باد مخالف چلنے لگی تو انہیں ہوش آیا کہ یہ تو گھاٹے کا سودا ہے۔ اور ایسے بہت سے لوگوں نے توبہ تلا کر کے ایسے کاموں میں لگ گئے جو ان کے لئے فائدہ بخش ہو سکتے تھے۔

ادریس صاحب نے ترقی پسندی کو نہ شہرت کے لئے اپنایا تھا اور نہ فیشن کے طور پر، اور نہ انہیں اس سے کسی ذاتی فائدہ کی امید تھی۔ دراصل بنیادی طور پر وہ انسان دوست تھے اور جو شخص تمام انسانوں کا دوست ہوتا ہے وہ جمہور کی فلاح و مسرت کے بارے میں سوچتا ہے۔ اشتراکیت سے ان کی دلچسپی عام انسان دوستی کی وجہ سے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا عالم معاشرہ پیدا ہو جائے جہاں بندہ و آقا کی یہ تمیز نہ رہے، جہاں استحصال اور انسانیت کشی نہ ہو، جہاں طبقاتی خلیج حائل نہ ہو سکے۔ جہاں غریبوں اور ناداروں کی دادرسی ہو سکے۔ جہاں سانس لیتے ہوئے عام آدمی بھی انبساط و فراغ محسوس کرے، ظاہر ہے کہ ہر انسان دوست کو یہ سب کچھ سوچنا چاہیئے۔ ادریس صاحب نے عملی سیاست میں بھی دلچسپی لی ہے۔ تنظیم و تحریک میں بھی ساتھ رہے ہیں۔ تحریر و تقریر سے بھی اپنے مقاصد کا اظہار کیا ہے۔ مگر خاص بات یہ ہے کہ یہاں بھی انہوں نے جوش و جذبہ کا وہ ابال نہیں دکھایا ہے جو شخصیت کی دلآویزی چھین لیتا ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات اور اصول حیات کو سنجیدگی، وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

چند ہی ملاقاتوں کے بعد میں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ نجی ملاقاتوں میں دوسری شخصیتوں کا ذکر بھی ہوتا رہتا

ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایسے مواقع پر
گفتگو میں نہایت اختصار سے کام لیتے تھے۔ جہاں
کسی کی شکایت کا کوئی پہلو ہو وہ اسے تضیع اوقات
سمجھتے تھے۔ کسی شخص کے اچھے اور خوشگوار اثرات
کو دیر تک بیان کرتے تھے۔ عیب کا کوئی حقیقی پہلو
بھی ہو تو اس کے بیان سے گریز کرتے تھے یہ ایسی یگانہ
صفت ہے جس سے آج کے بہت سے بزرگ حضرات
ناآشنا ہیں۔

میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ ترقی
پسند تحریک سے میرا باقاعدہ کبھی لگاؤ نہیں رہا۔ ہاں
یہ ضرور ہے کہ ادب اور زندگی کے باہمی رشتہ کے
سلسلے میں میرا راستہ ترقی پسند کے ساتھ ساتھ
بہت دور تک جاتا ہے۔ میں نے شعر و ادب کی غائت
پر غور کرتے ہوئے اشتراکی ادیبوں کی جزوی حمایت
بھی کی ہے۔ اور مردہ، بے روح، فیشن زدہ ترقی پسندی
کی مخالفت بھی کی ہے۔ میرے اس نظریات سے جناب
اولیس سنبھلدی واقف تھے۔ وہ اتنے مرنجاں
مرنج اور وسیع الذہن آدمی تھے کہ انہوں نے بھی ان
مسائل پر بحث کر کے اصلاح کرنے کی کوشش نہیں
کی ______ بلکہ اپنی محبت و شفقت سے
یکساں طور پر ہمیں نوازتے رہے۔ ایک بار ملاقات
ہوئی تو بغیر کسی تمہید کے انہوں نے کہا کہ "ماہنامہ
سہیل کو سنبھال دیجئے اور اس کی ادارت کی ذمہ
داری لے لیجئے" ان دنوں سہیل کی اشاعت میں
غیر معمولی تاخیر ہو جاتی تھی۔ مشتملات بھی یوں ہی سے
ہو کر رہ گئے تھے۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی خاصا
گر گیا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ سب سے پہلے تو
مجھے یہ بات خوشگوار لگتی ہے کہ سہیل کی پیشانی پر
"ترقی پسند ادب کا ترجمان" لکھا رہتا ہے۔ دوسری
بات یہ ہے کہ اگر میں ادارہ میں رہوں گا تو پھر مجھے یہ بھی
دیکھنا ہوگا کہ میں کن حضرات کے ساتھ رہوں گا ہو سکتا
ہے کہ میری موجودگی کی وجہ سے ناموں کے اس SET
میں کچھ تبدیلی کرنی پڑے جو اب تک موجود ہے میں
نے ان سے وعدہ کیا کہ نام کی شمولیت کے بغیر بھی میں
سہیل کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے
یہ عرض کیا کہ اہل قلم حضرات اور قاری میں صحیح ترقی
پسندی کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آج جب
ہم رسالے کے سرنامہ پر "ترقی پسند ادب کا ترجمان"
کا اضافہ کرتے ہیں تو قاری کے ایک بڑے حصے سے
اپنا ناتا توڑ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ سبھی
لوگ ہمیں ان نظریات کا علم بردار سمجھنے لگتے ہیں جنہیں
بہت سے لوگوں نے غلط انداز سے پیش کر کے نامقبول
بنا دیا ہے۔ ہمیں اس کے نام سے نہیں بلکہ اس کے کام
سے تعلق رکھنا چاہئے۔ اگر ہم اس CAPTION
کے بغیر ایسی تحریریں پیش کریں جن سے ترقی پسندی
مقبول ہو سکے تو اس میں ہماری فتح ہے کسی نظریہ سے
COMMITMENT کی سب سے موثر صورت
وہ ہوتی ہے جو داخلی ہو جو ہماری تحریروں اور ہماری
مشتملات سے ظاہر ہو۔ اعلان و اشتہار سے ہم ترقی
پسندی کا بھلا تو کیا کریں گے بلکہ بہت سے قارئین کو
کھو دیں گے۔

میرے اس جواب کے بعد وہ خاموش ہو گئے
[illegible]

ہو گئی ۔

بات یہ ہے کہ ادریس سنہاروی صاحب پرانی وابستگیوں سے ایک جذباتی تعلق رکھتے تھے ۔ وہ جس آئیڈیالوجی کے قائل تھے اسے دوسروں پر تھوپنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن خود بھی اسے اپنے برابر ہٹنے کو تیار نہیں تھے ۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم، قیصر عثمانی، کلام حیدری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ذکی انور اور دوسرے ہم خیال اور ہم مسلک لوگوں سے ایک انداز سے نبھاتے رہنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے ۔ نبھانے کے اس مقدس فریضہ میں ان کا انہماک کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ اس عرصہ میں کس کس کے خیالات میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہیں ۔ کون کتنا بدل گیا ہے ۔ دراصل وہ ان سارے لوگوں کو ان کے ساتھ نظریات اور تعلقات کی وجہ سے ایک بار قریب کر چکے تھے ——

اور یہ بات طے تھی کہ وہ جس کو جتنا قریب کر لیتے تھے کبھی اپنے آپ سے زیادہ دور ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے —— اور حالات اور مواقع کے ساتھ ساتھ بدلنے والے لوگ شاید یہ محسوس بھی نہیں کر سکے تھے کہ محبت و موانست اور قربت و تعلق کے سلسلہ میں اٹل رہنے والے ادریس سنہاروی کو اس وقت کیا تکلیف ہو پہنچتی ہو گی جب وہ انہیں رخ پھیرتے ہوئے دیکھ لیتے ہوں گے ۔

سادگی و بے ریائی، خدمت و محبت، کم سخنی و خوش دلی، وضع داری و عزت نفسی، صبر و استقامت اور ثابت قدمی کی منفرد خصوصیات سے ادریس سنہاروی کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے ۔ آہ اس دور میں اپنے بعد دولت و ثروت کا اثاثہ چھوڑ جانے والے نام و نمود پیدا کرنے والے، تخلیقی و فنی کارنامے بخشنے والے لوگ تو بہت ہیں لیکن ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جانے کے لائق ہیں جن سے انسانی اور اخلاقی اقدار کی یہ روایت زندہ رہتی ہے ۔ ادریس سنہاروی صاحب نے ہمارے لئے یہی سرمایہ چھوڑا ہے ۔ اور سچ مچ یہ کتنا عظیم اثاثہ ہے ۔

بقیہ ادریس بھائی صفحہ کا

جاگیریں نہیں تک یہ اوپر سے اوڑھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھیں ۔ بلکہ ان کی پوری شخصیت ان خصائص سے یکسر ہم آہنگ ہو چکی تھی ۔ آج کے اس ناموافق دور میں ادریس بھائی کی کمی بے حد محسوس ہوتی ہے ۔ وہ ہمارے درمیان تو نہ رہے لیکن انکی بتائی ہوئی باتیں مشعل راہ کا آج بھی کام کرتی رہیں ۔

معین شاہد

میرے ادریس بھائی

ادریس بھائی کو صحافتی اور ادبی دنیا ادریس سہنا روی کے نام سے جانتی ہے لیکن میں انہیں صرف "ادریس بھائی" کے نام سے ہی ان کی زندگی میں پکارتا رہا ہوں۔ اور آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اور ان کی وفات کو ٹھیک ایک سال ہو گیا ہے ادریس بھائی کے نام سے ہی انہیں یاد کر کے ماضی کے بچھڑے ان لمحات کو کھنگال رہا ہوں جو ان سے وابستہ ہیں۔

ادریس اور بھائی یہ دو الفاظ آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادریس بھائی کے نام سے ہی وہ جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ جب کسی بھی محفل میں ادریس بھائی کا نام لیا جاتا تو اس سے محبت بھری وہ شخصیت فوراً ابھر کر سامنے آ جاتی جس سے ہمارے ادریس بھائی ہی مراد لئے جاتے۔ صرف ادریس بھائی کہا شہر کے بہت سارے طالب علم اشخاص کے درمیان ادریس بھائی نے اپنی ایک خاص شناخت بنائی تھی۔

بغیر کسی تامل کے کسی مصیبت میں کام آنے والے ادریس بھائی۔

ادریس بھائی۔ جو مایوسی میں ڈھارس بندھانے والے اور جینے کا حوصلہ بخشنے والے۔

ادریس بھائی۔ اندھیرے میں ایک چراغ کی لو کا نام۔

ادریس بھائی۔ ڈوبتی ہوئی کشتی امید کے کھیون ہار۔

ادریس بھائی وہ، جو فن کتابت اور فن صحافت کا درس دینے والے۔

اور وہی ادریس بھائی، جنہوں نے بہتوں کو قلم پکڑنا سکھلایا اور ادب و سیاست کا شعور بخشا۔

ادریس بھائی کی ۶۲ سال کی حیات مستعار کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی زندگی میں انسانی اقدار کے کئی ڈوبتے اور روشن پہلو گردش کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ ایک ایڈیٹر، ایک سیاست داں، ایک حافظ قرآن اور ایک خوشنویس تھے۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو جناب سجاد ظہیر مرحوم کے ساتھ مل کر ایک نیا موڑ دیا۔ ایک بیان

ماہنامہ سہیل لیا۔
افروز اور حیات آموز جادے سے سرفراز کیا۔

شاید ۱۹۴۵ء کا وہ سال تھا جب وہ گیا سے بمبئی تشریف لے گئے۔ اس وقت بمبئی سے سجاد ظہیر مرحوم "قومی جنگ" نکال رہے تھے۔ سجاد ظہیر مرحوم نے ادریس بھائی کو اپنے ادارے میں شریک کیا۔ وہ قومی جنگ میں کتابت سے لے کر اس کی ترتیب و تدوین میں ان کی مدد کیا کرتے۔

یہاں پر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ادریس بھائی کا جو گھرانہ تھا وہ علم و فضل میں یکتا اور یگانہ تھا ان کے والد بزرگوار حافظ عبدالرحمٰن صاحب بسمل سنہاروی گیا میں ۱۹۱۳ء میں اردو ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں مدرس تھے۔ بسمل سنہاروی صاحب کا شمار گیا کے اساتذہ اور اہل فن میں ہوتا تھا۔ آپ حضرت عشرت لکھنوی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ ان کے ہم عصروں میں حضرت انجم مانپوری، حضرت کشتہ گیاوی، وغیرہم تھے۔ اس وقت گیا میں حضرت ہرشی گیاوی، حضرت فتنی عادپوری، حضرت کوثر خیرآبادی، حضرت اصغر گیاوی، حضرت فضل حق آزاد، حضرت سید عبدالعزیز، شاہ بیگم پوری عشرت گیاوی جیسے استاد فن کا طوطی بول رہا تھا اور ان کے ہم عصر حضرت شمس گیاوی، حضرت علامہ سریر کابری تھے۔ گیا میں بہت ہی شاندار ادبی شعری ماحول تھا۔ اسی ماحول میں ادریس بھائی نے آنکھیں کھولیں اور بسمل صاحب جیسے باکمال استاد فن شعر گوئی کے آغوش میں تربیت پائی۔ اس وقت گیا کے مشہور حضرت انجم مانپوری مرحوم نے ۱۹۳۱ء میں مشہور رسالہ ماہنامہ "ندیم" کا اجرا کیا تھا۔ ماہنامہ ندیم جناب شکیل ندوی صاحب کے زیر اہتمام ہوتی

پریس، سبزی باغ بانکی پور پٹنہ سے شائع ہوتا تھا۔ اور اس کا دفتر انجم صاحب کی رہائش گاہ میں تھا جو پھلگو ندی کے کنارے محلہ مورا یا گھاٹ گیا میں واقع تھا۔ ۱۹۳۶ء میں بسمل صاحب نے محلہ گھسیارٹولہ گیا میں لیتھو پریس قائم کیا جو شمسی پریس کے نام سے مشہور تھا۔ اس پریس سے انہوں نے ماہنامہ "سہیل" ۱۹۳۹ء میں اجرا کیا۔ اور اس کی ادارت بسمل صاحب نے اپنے منجھلے بیٹے جناب عارف سنہاروی کو سونپی۔ وہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے بعد لاہور چلے گئے۔ ماہنامہ سہیل کے ابتدائی دور میں اس وقت گیا میں کتابت و طباعت کی سہولتیں فراہم نہ تھیں۔ اور چھپائی کا بہت ہی پرانا طریقہ اس وقت ایجاد تھا۔ شمسی پریس ایک ہینڈ لیتھو پریس تھا۔ جو بجلی سے نہیں چلتا تھا۔ بلکہ اسے دو تین مزدور ہاتھ سے چلاتے تھے۔ اور دن بھر میں مشکل سے ایک ہزار پرنٹ نکلا کرتا تھا۔ پتھر پر کاپیاں جمتی تھیں۔ پلیٹ کا رواج نہ تھا۔ کتابت و طباعت کے ایسے پرآشوب اور کٹھن دور میں بسمل صاحب نے شمسی پریس قائم کیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اسی پریس کے مختلف کاموں میں لگایا۔ بسمل صاحب کے بڑے صاحبزادے یعنی ادریس بھائی کے بڑے بھائی جناب [illegible] سنہاروی مرحوم نے پریس کا کام سنبھالا۔ اور وہ اس کام میں کافی ماہر ہو گئے۔ جلی حروف کی کتابت جو وہ کیا کرتے تھے اس پر لکھنؤ اور دہلی کے کاتب حضرات بھی رشک کرتے تھے۔ فن خطاطی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ [illegible]
جو وہ کتابت کیا کرتے تھے اس کی چھپائی بیرون شہر

میں ہوا کرتی تھی۔ خط نستعلیق اور عربی حروف کی کتابت کرنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ خط معکوس خط گلزار اور ظغری لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ میں نے ان کے قلمدان میں عجیب و غریب قسم کے موٹے منہ والے قلم دیکھے ہیں۔ وہ بانسواڑی سے پکی ہوئی ہر سائز کے بانس منگواتے اور انہیں چھیل اور تراش کر کے قلم بناتے۔ اور ان پر حسب ضرورت قط لگاتے۔ ہم نے ان کو بلیڈ کی موٹی نب بھی بناتے دیکھا ہے۔ ڈیڑھ انچ تک کے قط والے قلم ان کے پاس ہوتے۔ جب زینو بھائی نے شمسی پریس کے بعد تاج پریس قائم کیا تو وہاں پریس میں پتھر کے عوض پلیٹیں کام آنے لگیں۔ طباعت بھی وہ کئی خوش رنگوں میں کیا کرتے تھے ــــ شمسی پریس ادب و صحافت کا گویا ایک مرکز تھا۔ فن کتابت کے سیکھنے والے کئی حضرات یہاں آیا کرتے تھے۔ اور اپنا دامن مراد بھر کر جایا کرتے تھے۔

ادریس بھائی نے شمسی پریس میں رہ کر اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں کتابت سیکھی اور ادب اور صحافت گویا ان کی گھٹی میں پڑی۔

وہ بچپن ہی میں سجاد ظہیر مرحوم کی ترقی پسند اور مارکسسٹ نظریات سے متاثر ہوئے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے روابط قائم ہوئے جو ان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم رہے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے کسی مصلحت اندیشی اور سیاسی مطلب پرستی کو راہ نہیں دی۔ ان کو حکومت وقت کی طرف سے سزا بھی ملی۔ وہ حکومت کی نظر میں مشتبہ رہے۔ سہیل کی ادارت جب انہوں نے ۱۹۵۰ء میں سنبھالی تو سہیل کو ترقی پسند ادب کے ترجمان کی حیثیت دی۔ پابندی وقت سے نکلنے والا ماہنامہ کئی سالوں تک حکومت وقت کی بلیک لسٹ میں شامل رہا اور اسے حکومت نے سرکاری اشتہارات کے لئے منظوری نہیں دی۔ جب کانگریسی وزارت نے اپنے رویہ میں کچھ لچک پیدا کی اور آزادی تحریک کے پیش نظر اپنی جمہوری پالیسی پر نظر ثانی کی تو سہیل کو ۱۹۶۷ء میں جنتا وزارت میں بہار سرکار اور مرکزی سرکار نے سرکاری اشتہارات کی اشاعت کے لئے منظور کر لیا۔ غالباً ۱۹۶۸ء میں سہیل کو بہار سرکار نے سرکاری اشتہارات کے لئے منظور شدہ اخبارات کی فہرست میں شامل کیا۔

ہمارے ادریس بھائی نے زندگی میں بہت سارے نشیب و فراز دیکھے۔ انہوں نے اپنی فارغ البالی کا بھی زمانہ دیکھا۔ اور تنگ دستی کا بھی۔ لیکن کبھی بھی ہجوم افکار کو ان کی پیشانی پر شکن ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی وہ ہر حال میں خوش نظر آتے اور حالات کا مقابلہ کرتے۔

ایک زمانہ تھا جب ان کے پاس کافی پیسے تھے اس وقت انہوں نے بمبئی اور دہلی سے آکر پٹنہ سے ہفتہ وار زمین نکالا۔ جس کی ادارت میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی شامل تھے۔ ادریس بھائی ان دنوں پٹنہ ہی میں رہا کرتے تھے یہ ان کے شاہانہ زندگی کا دور تھا۔ چھوٹے بڑے ترقی پسند ادیب و شاعران کی گرد جمگھٹ لگایا کرتے تھے۔ ادریس بھائی سب کو کھلاتے پلاتے۔ سبزی باغ کے رحمانیہ ہوٹل میں محفل یارانہ ہوتی اور چائے کا دور چلتا رہتا ــــ یہ ۱۹۵۵ء سے قبل کی بات ہے۔ اس کے بعد مستقل

ماہنامہ سہیل گیا۔

گیا آگئے۔ اور سہیل نکالنے لگے۔

بہار میں ندیم اور سہیل نے ادب کی جو خدمت کی ہے وہ شاید کسی رسالہ یا اخبار نے کی ہو۔ ان دونوں جرائد نے صحیح معنوں میں بہار میں اعلیٰ ادبی صحافت کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں اداروں کو ادب و صحافت میں مرکزیت حاصل تھی۔ ان دونوں رسائل نے ہندوستان میں بڑے بڑے ادیب و شاعر پیدا کئے۔ جن کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔

ندیم اور سہیل کے صفحات میں جن مشاہیر ادب کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ادیب الملک حضرت خیال، نواب نصیر حسین خیال، حضرت سید سلیمان ندوی، حضرت سید وصی احمد بلگرامی، حضرت خواجہ عشرت لکھنوی، حضرت شاد عظیم آبادی، حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی، حضرت علامہ فضل حق آزاد، حضرت شفق عماد پوری، مولانا سید عبدالماجد، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، رونش صدیقی، فراق گورکھپوری، سید ریاست علی ندوی۔ نوح ناروی، علامہ جمیل مظہری، کرشن چندر، اختر قادری، اختر اورینوی، مبارک عظیم آبادی، صادق الخیری، علامہ سر یکا بری، رضا نقوی، مرزا یگانہ لکھنوی، وحشت کلکتوی، سہیل عظیم آبادی، تمنی جان، قمر گیاوی، نواب امداد امام اثر، شاہ عبدالعزیز آزاد پیر بیگھوی، وغیرہم۔

ادریس صاحب کی ادارت میں سہیل نے سب سے پہلے بہار میں لفظ ادیبوں اور شاعروں

کے خاص نمبر نکالے۔ انہوں نے علامہ جمیل مظہری کی زندگی ہی میں ۱۹۵۱ء میں جمیل مظہری نمبر نکالا۔ جو کافی مقبول ہوا اور اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے مندرجہ ذیل نمبر نکالے۔

سہاگل پور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر ۱۹۶۹ء

منشی پریم چند نمبر ——— ۱۹۸۰ء

سہیل عظیم آبادی نمبر ——— ۱۹۸۱ء

جمیل مظہری نمبر (دوسرا جدید ایڈیشن) ۱۹۸۳ء

کیفی اعظمی نمبر ——— ۱۹۸۴ء

اس کے علاوہ انہوں نے مندرجہ ذیل ادبا و شعراء پر سہیل کا خاص "گوشہ" نکالا۔ اور ان کے فن کا جائزہ لیا۔

جناب کالی داس گپتا رضا، پروفیسر عنوان چشتی، شفیع مشہدی، مولانا علیم اللہ حالی، عبید قمر

ادریس صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت بسمل سنساروی کی کلیات بسمل بھی ۱۹۸۱ء میں مرتب کر کے شائع کی۔

ادریس صاحب کو ایک پرانے صحافی کی حیثیت سے بہار اسٹیٹ ایکریڈیٹیڈ پریس کارسپونڈنٹس کانفرنس منعقدہ یکم مارچ ۱۹۸۲ء میں اعزازات سے نوازا گیا۔ اور بہار اردو اکیڈمی نے بعد از مرگ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تین ہزار روپے کا انعام کا اعلان کیا۔

ادریس صاحب کی جب یاد آتی ہے تو ان کی تنہا نجابت، خلوص، ہمدردی، اور محبت بے تحاشہ یاد آتی ہے۔ اب ایسے لوگ شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔

یادش بخیر

شفیع مشہدی

زندگی بھی ایک ایسا عجیب معمہ ہے جس کا
حل آج تک تلاش نہ ہو سکا۔ غالب بھی اسکی ابتدا
اور انتہا کی بھول بھلیاں میں گم ہو گئے مگر اس
کا کنارہ نہ مل سکا۔ کسی نے اسے مایا کہہ کر اپنی
تشفی کر لی تو کسی نے اسے خواب سے تعبیر کیا۔ مگر
حقیقت یہ ہے کہ اس کا راز سمجھ میں نہ آیا۔ اگر
اسے عناصر میں ظہور ترتیب کہا جائے تو پھر اجزا
پریشاں کی تلاش کیسے ہوگی اور کہاں ہوگی؟ صرف
ایک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ زندگی
فانی ہے اور سچ پوچھئے تو یہی زندگی کی خوبصورت
ترین حقیقت بھی ہے۔ نہ جانے کب سے یہ سلسلۂ
حیات و ممات جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری
رہے گا! جہاں ایک انسان کی اپنی زندگی خاصی
طویل المدت اور بے شمار حادثات کی حامل ہوتی
ہے، وقت اور تاریخ کے کینوس پر اس کی حیثیت
ایک لمحۂ مختصر سے زیادہ نہیں مگر یہ لمحۂ مختصر بھی
کتنی کہانیوں، کتنے نشیب و فراز اور کتنے پہلو
کو دامن میں سمیٹ لیتا ہے کہ اس کا نقشہ کھینچئے
تو صفحات کے صفحات سیاہ ہو جائیں اور بات مکمل
نہ ہو سکے گی۔ اپنے اردگرد نگاہ ڈالیں تو ایسی شخصیتیں
سامنے آتی ہیں جن کی موجودگی میں ان کی عدم موجودگی
کا تصور بھی گراں تھا مگر دھیرے دھیرے نہ جانے
کتنے ایسے لوگ زندگی اور موت کی تلخ حقیقت
کے شکار ہو گئے۔ اور اب صرف یادیں ہی باقی
رہ گئی ہیں اور وہ بھی ایک دو نسل کے بعد
فراموش ہو جائیں گی۔ ایسے ہی احساس سے
مغلوب ہو کر میں آنکھیں بند کر کے سوچتا ہوں تو
کئی جانے پہچانے شفیق چہرے نگاہوں میں
گھوم جاتے ہیں اور انکی خاموشی جیسے سوال
کرتی ہے کہ تم ہمیں بھول گئے؟! — انہیں
چہروں میں مرحوم ادریس سہسرامی بھی ہیں
جنھیں میں احتراماً ادریس بھائی کہا کرتا تھا۔
میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔
تحت الشعور کی راکھ کریدتا ہوں تو جی

ماہنامہ سہیل، گیا
ہوئی چنگاریاں سُلگ اٹھتی ہیں اور یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے کہ ادریس بھائی ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں

میں ان چند خوش نصیب لوگوں میں ہوں جنھیں ادریس بھائی کی خصوصی شفقت حاصل تھی۔ یوں تو وہ میرے بڑے بھائی جاوا ذبیح مشہدی صاحب کے دوستوں میں سے تھے اور اس طرح بہت بزرگ تھے مگر ان سے مل کر، ان سے باتیں کرکے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شفیق دوست سے باتیں ہو رہی ہوں۔ ملازمت کے سلسلے میں جب میں مونگیر میں تھا تب بھی وہ مجھ سے ملنے گئے اور جب دربھنگہ میں تھا تب بھی وہ ملنے آئے۔ محفلیں ہوئیں، باتیں ہوئیں، شب بیداریاں ہوئیں اور ہر لمحہ ادریس بھائی کی متانت اور سادگی مجھے متاثر کرتی رہی

ادریس بھائی ایسے آدمی نہیں تھے جنھیں آج کی اصطلاح میں "بڑا آدمی" کہا جاتا ہے۔ نہ وہ بڑے شاعر تھے نہ بڑے ادیب مگر اس سے بھی زیادہ وہ "شاعر اور ادیب گر" تھے۔ نظریاتی طور سے وہ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ہوتے ہوئے ادریس بھائی نے بہار میں ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے اور اسے تحریک کی شکل دینے میں جو بنیادی کام کئے ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسندی کے جس زینے پر چڑھ کر شہرت اور دولت حاصل کی، اس زینے کے پائے ادریس بھائی کی ہتھیلی پر تھے۔ سادہ مزاج، نرم گو، متین اور سنجیدہ ادریس صاحب کی تنظیمی صلاحیت کا اعتراف ہر اس شخص کو تھا جس نے انھیں قریب سے دیکھا تھا۔

ماہنامہ سہیل کی ادارت اور اس کے فروغ کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا۔ ساری زندگی وہ اس رسالے کو اپنا لہو دیتے رہے، اور آج سہیل جس منزل میں ہے اس کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سہیل عظیم آبادی صاحب کے سامنے میں نے ایکبار ادریس بھائی سے کہا تھا کہ آپ اپنا نام "سہیل سنبھار دو" رکھ لیجئے اور سہیل صاحب کا نام ادریس عظیم آبادی رکھ دیا جائے۔ دونوں اسی بات پر خوب محظوظ ہوئے تھے۔ افسوس یہ دونوں شخصیتیں گم ہو گئیں۔

میں جب کبھی فرصت میں گیا آتا تو ادریس بھائی سے ملنا ذہن کی حد تک ضروری تھا۔ ان سے ملاقات جناب نسیم گورگانوی کی دکان "جنتا آرٹس" میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں نسیم صاحب کی دلچسپ گفتگو اور ادریس بھائی کی زیر لب مسکراہٹ سے ہم لطف اندوز ہوتے تھے۔ ادریس بھائی کی شخصیت کا سب سے جاذب نظر پہلو ان کی مسکراہٹ تھی۔ بھاری بھرکم ہوتے ہوئے بھی ادریس بھائی بیحد نرم گفتار

ہمارے بیچ سے گیا ...

مجھے ان کی گفتگو کا انداز بے حد دلکش
تھا۔ وہ دھیرے دھیرے بولتے تھے اور چہرے پر ایک
شگفتگی پھیلی رہتی تھی۔ میں نے کبھی انھیں
اونچی آواز میں یا چلّا کر بولتے نہیں دیکھا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ادریس صاحب
اصطلاحی زبان کے "بڑے آدمی" نہیں بنے۔
وہ ایک جیتے جاگتے، چلتے پھرتے عام آدمی کی
طرح تھے مگر اس عام آدمی کی شخصیت میں ایک
کشش تھی، ایک جادو تھا جو اپنی طرف
کھینچتا تھا۔ یہ عام آدمی جس کا تعلق زمین سے
تھا، آسمانوں کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ فلسفوں
اور آئیڈیلزم (IDEALISM) کے
بھاری بھرکم جملے نہیں بولتا تھا، کتابوں کی زبان
میں باتیں نہیں کرتا تھا بلکہ حقیقت پسند تھا جو
عام آدمیوں کی طرح زندگی کی سنگین حقیقتوں
سے دوچار تھا۔ ان کا اسے احساس تھا اور
پاس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کسی کے دکھ
میں شریک ہونا اور اس کا غم بانٹ لینا اس عام
آدمی کا طیرہ تھا۔ میں اس بات کا شاہد ہوں
کہ ادریس بھائی درجنوں بار مجھ سے کسی کام کے
سلسلے میں ملے مگر ہمیشہ یہ کام دوسروں کا ہوتا
تھا۔ کسی غریب طالب علم کا، کسی بیکس بیوہ کا،
کسی کلرک کا۔ کبھی وہ اپنے ذاتی کام کے سلسلے
میں مجھ سے نہیں ملے تھے۔ میں ان کی اس خوبی سے
ہمیشہ متاثر رہا۔ اپنے لئے جینا تو فطری بات ہے

مگر ساتھ ساتھ کچھ دیر دوسروں کے لئے جی لینے کا
حوصلہ ہونا چاہیے۔ ادریس بھائی صرف اپنے
لئے زندہ نہیں رہے بلکہ دوسروں کا بھی ان کی زندگی
میں حصہ تھا۔ یہی بات انھیں "عام آدمی" اور
"بڑے آدمی" دونوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔

ادریس سنہاوی کا ممکن ہے دوسروں کے
عام نام ہو کر رہ گئے اور ان کے لئے جنھوں
نے انھیں قریب سے دیکھا تھا، یہ ایک اہم نام
اور اہم نام رہے گا۔

ادریس بھائی ہمارے درمیان نہیں رہے
کاروبار حیات جاری ہے اور جاری رہے گا
جن دلوں پر ادریس بھائی نے اپنی شخصیت کے
انمٹ نقوش چھوڑے ہیں انھیں وقت بھی شاید
مدھم نہیں کر سکے گا۔

ڈاکٹر اعجاز انجم فاطمی

دھند کے پیچھے

یہ غالباً ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ پٹنہ
میں بہار ریاستی اُردو کانفرنس ہونے والی تھی۔
میں ان دنوں اسکول کے ابتدائی درجوں میں زیرِ تعلیم
تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت نامہ میرے
والدِ محترم جمیل فاطمی کو بھی تھا۔ جو ان دنوں مونگیر
میں جوڈیشیل مجسٹریٹ تھے۔ کانفرنس میں شرکت
کے لئے جب وہ پٹنہ گئے تو میں بھی ان کے ہمراہ
تھا۔ پٹنہ میں کانفرنس کی تیاریاں زور و شور پر تھیں۔
وجہ یہ کہ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان
بھر کے مشاہیرِ ادب کے آنے کی توقع تھی۔ پٹنہ میں
ان دنوں اختر پیامی بھی زیرِ تعلیم تھے۔ اور انگریزی میں
ایم اے کر رہے تھے۔ میں چونکہ شروع سے
ہی اختر پیامی سے مانوس تھا اور ادب اور شاعری
کے متعلق پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں بھی وہ میری
ذات میں دلچسپی رکھتے تھے اس لئے والدِ محترم کے
بعد ان کی تربیت اور ادبی ذوق کے لئے میں ان کا
مرہونِ منت ہوں۔ پٹنہ میں والدِ محترم نے مجھے
اختر پیامی (جنہیں میں چاند ماموں کہتا ہوں) کے
حوالے کر دیا تاکہ میں پٹنہ کے ادبی حلقے میں متعارف
ہو جاؤں۔ پٹنہ ان دنوں ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا
تھا اور سارے بہار کے ادب دوست اور ادب نواز
حضرات بیک وقت یہاں جمع ہو گئے تھے جن میں
اختر پیامی، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، مظہر
شہاب، بدیع مشہدی، غلام سرور، شاہد اختر کے
نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے
بعد میں اُردو شعر و ادب میں اپنی گراں قدر تخلیقات
سے قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے۔ اختر اورینوی، جمیل
مظہری، سہیل عظیم آبادی، رضا نقوی واہی کی
سرپرستی ان حضرات کو حاصل تھی۔ جس نے ان میں
شعر و ادب کے ذوق کو زندہ رکھا اور ان کے ارادوں
کو تقویت پہنچائی۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کا دور
بھی تھا اور ان میں سے اکثر حضرات اس تحریک
سے باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر منسلک تھے۔ ان
ہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شام میں اختر پیامی
کے ساتھ رمنہ روڈ پر واقع ایک ہوٹل جس کا نام
غالباً ڈی لکس ہوٹل تھا، گیا۔ وہاں میں نے ایک

صاحب کو پہلے ہی سے موجود پایا۔ جو غالباً اختر بیامی کے ہی منتظر تھے۔ ان صاحب کی شخصیت کچھ اس قدر جاذبِ نظر تھی کہ میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھرے بھرے بدن، کم سخن، اور شفیق مزاج کے یہ صاحب ادریس سنبھاروی تھے۔ بہت نرم لہجے میں گفتگو کرنے کا یہ انداز مجھے بہت اچھا لگا اور میں انہیں سلام کر کے الگ کھڑا رہا۔ اختر بیامی نے جب بتایا کہ میں بہزاد فاطمی کا لڑکا ہوں۔ تو بڑے پیار اور شفقت کے ساتھ مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "بیٹے آپ کا نام کیا ہے؟" ان کے اس طرح مخاطب ہونے کا انداز کچھ ایسا بے ساختہ اور مشفقانہ تھا جس کی گرمی آج بھی میں اپنے دل کے کسی گوشے میں پاتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے بیرے کو آواز دی۔ اور ہمارے لئے مٹھائیاں منگائیں۔ رخصت ہوتے وقت مٹھائی کا ایک پیکٹ حوالے کیا اور کہا۔

"اپنے والد کو میرا سلام کہنا۔ میں شام میں ان سے ملنے آؤں گا۔"

شام میں چھ ساڑھے چھ بجے وہ ڈاکٹر نواب کے کوارٹر میں جہاں ہم لوگ مقیم تھے۔ تشریف لائے۔ والدِ محترم سے بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو میں میں نے بار بار یہ محسوس کیا کہ دورانِ گفتگو ادریس چچا کا لہجہ بہت نرم اور دھیما تھا۔ سالاں کہ اس محفل میں موجود دوسرے حضرات بہت مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پا رہے تھے۔ والدِ محترم کے علاوہ تمام حضرات

کسی نہ کسی طرح ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے لہجے میں خفگی، تناؤ تھا۔ اُردو کانفرنس کے آغاز اور اختتام تک میں نے ادریس چچا کو بہت پرسکون پایا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ کانفرنس کی کارروائیوں میں شریک ہوتے اور پھر آہستگی سے اپنی قیام گاہ روانہ ہو جاتے۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ اتنے خاموش طبع اور منکسر المزاج شخص کے گرد اتنے سارے لوگ کیوں جمع رہتے ہیں، لیکن یہ راز میری سمجھ میں اس وقت نہ آیا۔ اسی کے کچھ عرصے بعد ایک شام مونگیر میں ہماری قیام گاہ پر ادریس چچا تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ والدِ محترم نے انہیں بڑی محبت اور خلوص سے گلے لگایا۔ معلوم ہوا کہ وہ "تہذیب" کی خریداری کے سلسلے میں دورے پر ہیں۔ ان دنوں سہیل عظیم آبادی کے ساتھ مل کر وہ "تہذیب" کے نام سے ایک ماہنامہ نکال رہے تھے۔ یہ رسالہ بہت دنوں نہیں نکل پایا۔ اور غالباً تین چار شماروں کے بعد سہیل عظیم آبادی کی طرف مزاجی کی نذر ہو گیا۔ اگر یہ رسالہ جاری رہتا تو شاید آج اُردو کے اہم معیاری رسالوں میں ہوتا اور اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ بنتا۔ "تہذیب" کے بند ہو جانے کے بعد ادریس کو بہت رنج ہوا۔ وہ کسی قیمت پر اس رسالہ کو جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن حالات کچھ اس طرح الجھ گئے تھے جنہیں سلجھانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ

اشنا نہیں گیا
برداشت ہو کر وہ کچھ دنوں پٹنہ سے باہر چلے گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پٹنہ آ گئے ہیں اور کوئی بزنس وغیرہ جمانا چاہتے ہیں لیکن اتنے شریف النفس انسان کے لئے بزنس وغیرہ میں قدم رکھنا اور کامیاب ہونا انتہائی دشوار امر تھا۔ لوگ انکی نیک نیتی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اپنا الو سیدھا کرتے۔ انکی اسی شرافت اور مروت نے انہیں ہزاروں روپے کے خسارے میں رکھا۔ لوگ ان سے قرض لیا کرتے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے یہ قرض انھیں واپس نہیں ملتے۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے ہزاروں روپے ہڑپ کر لئے۔ وہ آج بھی ایسا کرتے ہیں ادریس چچا نہ سہی کوئی اور سہی۔ یہ لوگ قرض مانگنے میں اس قدر ماہر اور استاد ہو چکے ہیں کہ اب انہیں چھوٹے بڑے کا بھی لحاظ نہیں رہ گیا ہے۔ جب کبھی ایسے لوگوں کا ذکر ادریس چچا کے سامنے کیا گیا انہوں نے اس بات کو ٹال دیا۔ انھوں نے اشارتاً یا کنایتاً کبھی اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد ان سے عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کے خطوط والدِ محترم کے نام برابر آیا کرتے۔

۱۹۶۷ء میں جب میری چھوٹی بہن امتیاز کی شادی تھی اور شادی کی تیاری میں وقت اس قدر کم تھا کہ ہم لوگ بدحواس ہو گئے۔ والد محترم ان دنوں اورنگ آباد میں سکنڈ آفیسر تھے۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ ادریس چچا گیا میں مقیم ہیں۔ والدِ محترم نے انہیں خط لکھ کر اورنگ آباد میں بلوایا۔ خط ملتے ہی وہ مہینوں دنوں کے اندر گیا سے اورنگ آباد تشریف لائے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگا کہ وہ کافی تھکے ہوئے ہیں لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ انہیں لڑکی کی شادی کے سلسلے میں مشورے کے لئے بلایا گیا ہے تو پھر انکی ساری تھکن ایک بشاشت میں بدل گئی۔ اور وہ نئے سرے سے تازہ دم نظر آنے لگے۔ اور پھر شادی کے مرحلے میں اس طرح مشغول ہوئے گویا یہ انکی اپنی بچی کی شادی ہو اور پھر اس وقت سے لیکر بارات کے رخصت ہونے تک وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ یہ تھا ان کا خلوص اور ہمارے گھر سے ان کے مشفقانہ تعلقات۔ ہم سے جب بھی ملاقات ہوتی ان کا مشفقانہ اور مربیانہ رویہ قائم رہتا۔ ہماری کامیابی سے انہیں مسرت ہوتی اور کبھی جب مجھے پریشان اور الجھا ہوا دیکھتے تو بزرگانہ شفقت سے دلجوئی کرتے۔ مسعود منظر اور جمیل منظر سے مجھے کسی حال میں کم نہیں سمجھتے تھے۔ ایم۔ اے کر لینے کے بعد جب میری عارضی تقرری انوگرہ کالج، گیا میں ہوئی تو جوائن کرنے کے بعد سب سے پہلے تو دو شخصیتوں سے ملا ایک مولانا خورشید حسن صاحب قبلہ اور دوسرے ادریس سنبھاروی۔ کیونکہ میں یہ جانتا تھا کہ اگر ہمارے ساتھ ان دو ہستیوں کی دعائیں رہیں تو پھر مجھے کس بات کا ڈر نہیں۔ جیسا کچھ بھی ہوا

مصائب اور حوادث کی آندھیاں میرے خلاف چلیں لیکن ان بزرگوں کی دعاؤں نے انھیں ہر بار پسپا کر دیا۔

وہ بات جو بچپن میں میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر ادریس چچا کے گرد اتنے لوگوں کا ہجوم کیوں رہتا ہے؟ کیونکہ بظاہر وہ ایک نہایت منکسر المزاج اور کم سخن انسان تھے اور کیوں لوگ ان کی اس قدر عزت اور قدر کرتے ہیں۔ آج جب میں اس بات کی تہ میں جاتا ہوں تو ادریس چچا کی اصلی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ اپنے آپ کو گمنامی اور دھند میں رکھ کر دوسروں کو شہرت اور مرتبے تک پہونچاتے ہیں۔ ادریس چچا کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ انھوں نے خود کو پس پردہ رکھ کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو آگے بڑھایا، انھیں عزت اور شہرت سے ہم کنار کیا، ادبی تحریکوں کو تقویت پہونچائی اور اس کے بدلے میں خود کچھ نہ لیا۔ وہ دھند کے پیچھے سے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی کامیابی کو دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ انھوں نے اپنے لئے کچھ نہ کیا۔ ان کا ہر کام دوسروں کے لئے ہوا کرتا تھا۔ ایک بڑے انسان میں جو خوبی ہونی چاہیئے وہ ان میں تھی۔ تیاگ، ایثار اور قربانی نے انکی شخصیت کی تعمیر کی تھی اور اسی لئے وہ میری نظر میں ایک بڑے انسان تھے، ایک اونچے انسان۔ آج کی دنیا جو شہرت اور پیسے کے پیچھے بھاگ رہی ہے اور اور ہر شخص الگ الگ اپنی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے، اگر وہ ادریس سنہاروی کے تیاگ اور قربانی کو دیکھے تو اپنی نظر میں خود چھوٹا ہو جائے گا۔

آج ہم بونوں کے عہد میں زندہ ہیں۔ اور ہر بونا اپنے پنجوں پہ کھڑا خود کو طویل القامت سمجھ رہا ہے۔ دوسروں پر ہنس رہا ہے۔ چور دروازے سے شہرت کے شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ ایک سطر صحیح لکھ نہیں سکتا اور شعریت کی کرسیٔ صدارت پر براجمان ہے۔ لفظوں کا مفہوم نہیں سمجھ پاتا لیکن لغت کی ترتیب کر رہا ہے۔ ایک افراتفری کا عالم ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹوپیاں اچھالی جا رہی ہیں اور اہل نظر ان سارے مناظر کو حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے ہیں۔ کوئی اپنی جہالت پر نازاں ہے تو کسی کو اپنی دولت پہ گمان ہے، اور وہ اپنی دولت سے ادب کو خریدنا چاہتا ہے اور خرید رہا ہے۔ اور خرید و فروخت کا یہ سلسلہ تیزی سے جاری ہے۔ علم و جہل کا فرق معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ایذا کی اور اہرمن کی تیز مشکل ہوتی جا رہی ہے، اور پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ ادریس سنہاروی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا ہمیشہ دوسروں کے لئے زندہ رہے۔ دوسروں

کو آگے بڑھایا اور خود اپنی جگہ جمے رہے لیکن جس
جگہ وہ استادہ تھے وہ جگہ اس قدر بلند تھی جہاں
سے پوتوں کی نقل و حرکت کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے
اور یہی بچا ہے میری ملاقات ان کے انتقال
سے غالباً ایک ماہ قبل ہوئی تھی۔ مجھے جب معلوم
ہوا کہ وہ دل کے عارضہ میں مبتلا ہیں تو ایک دن
مزاج پرسی کی غرض سے ان کے دولت کدہ پر
حاضر ہوا۔ بڑی محبت اور شفقت سے ملے حال
چال دریافت کیا لیکن اپنی بیماری کے متعلق کچھ نہیں
بتایا۔ میں نے جب بھی پوچھنا چاہا انہوں نے دوسری
گفتگو چھیڑ دی۔ میں نے سمجھ لیا وہ اپنی بیماری
کے متعلق گفتگو کرنے سے اس لئے گریز کر رہے
ہیں کہ مجھے رنج ہوگا۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں
ہوتی رہیں۔ گھر کے تمام لوگوں کا حال فرداً فرداً
دریافت کیا۔ والد محترم کے متعلق دریافت کیا اور
پھر خاموش ہو گئے۔ میں بھی چپ تھا۔ تھوڑی دیر
بعد خود ہی بولے "اب پتہ نہیں سلطان بھائی
سے کب ملاقات ہو اور کون جانے ہو بھی یا نہیں،
کیوں کہ اب میرے [illegible]" یہ سن کر
طبیعت بھر آئی اور [illegible] اور یہ سوچ
کر کہ اطمینان سے ملاقات کروں گا، چلا آیا۔ مجھے کیا
پتہ تھا کہ ان سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ انسان
بھی کبھی کبھی کس قدر مجبور ہوتا ہے جو شے سامنے
ہوتی ہے اس کی قدر اسے نہیں ہوتی اور جب وہی
چھین جاتی ہے تو زندگی بھر اس کا افسوس

کرتا رہتا ہے۔ یہی حالت کم و بیش میری بھی
ہمیشہ سوچا کہ اطمینان سے ملوں گا، لیکن زندگی
اطمینان کسی کو اور کب نصیب ہوا ہے جو مجھے
اسی اطمینان کے انتظار میں تھا کہ خبر ملی کہ
اب ہم سے اس قدر دور جا چکے ہیں کہ ہماری
ہماری گریہ و زاری اور ہماری آہیں بھی واپس
واپس نہیں بلا سکتیں۔ کاش! میں اسی بیماری
کی حالت میں ان سے کم از کم ایک بار اور
تاکہ آج جو ذہن پر نہ ملنے کا بوجھ ہے وہ
رہتا۔ دنیا میں بہت کم ایسے انسان ہیں جن
مل کر دل کو سکون اور روح کو فرحت ملتی ہے
اگر کسی کو ایک بھی شخص ایسا مل جاتا ہے جس
مل کر اسے سچی خوشی یا "ذہنی" بہجت حاصل ہو
ہے تو وہ دنیا کا خوش نصیب انسان ہے۔
میں خود کو اس لحاظ سے بدقسمت انسانوں میں
کرتا ہوں کہ میں نے اس دولت کی قدر نہ کی
ایسے انسان سے دور دور رہا اور زندگی کی
اور پریشانیوں کو گلے لگاتا رہا۔ کاش زندگی
وہ گزرے ہوئے ایام واپس آجائے تو میں
طور پر اس کی پذیرائی کرتا اور ایسے شفیق اور
والے انسان کی صحبت میں میں اپنے تمام دکھ درد
مداوا تلاش کرتا لیکن میری یہ خواہش ایک دیوانے
کے خواب سے زیادہ نہیں۔ اب تو خدا سے
دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ
دے اور ان کے چاہنے والوں کو صبر جمیل! ٭

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

اِدریس سُنبھاروی

اپنے اداریوں کے آئینہ میں

صحافت ایک ایسا شغل ہے جو نہایت آسان بھی ہے اور سخت مشکل بھی۔ ہمارے یہاں اُردو میں جو رسائل اور جرائد اور ہفت روزہ اور روزنامے شائع ہوتے ہیں اُن میں صحافت کا معیار کچھ دُھندلا سا ہے۔ جیسے جیسے ساری چیزوں کا معیار میں پستی آتی جا رہی ہے۔ اسی طرح صحافت کے معیار میں بھی تیزی سے زوال آیا ہے۔ اُردو صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ملا رموزی، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار اور مولانا عثمان فارقلیط اور جناب اشرف علی صدیقی وغیرہ نے جو معیار قائم کیا ہے اب اس کا عشر عشیر بھی کہیں نہیں ملتا۔ اب اس کی توقع بھی بیکار ہے لیکن تنزل نے جس پست معیار تک پہنچا دیا ہے وہ بھی نہایت افسوسناک ہے۔

صحافت دراصل قوم و ملت اور ملک و تمدن کی خدمت کا ایک نہایت مؤثر اور کارگر وسیلہ ہے۔ اگر صحافی کے پاس حیاتِ اجتماعی کا ایک سوچا سمجھا ہوا منضبط و مرتب نظام ہو تو وہ اپنے قارئین کو مثبت راہوں پر لے جا سکتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ صحافی کے خیالات اور اس کے اندازِ اظہار کا غیر جذباتی ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ صحافی کا سچا کام عوام و خواص میں سنجیدہ فکر پیدا کرنا ہے تعمیری لائحہ کار کی تلقین کرنا ہے۔ اس موقف کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب صحافی واردات و مسائل کو غیر جذباتی انداز میں سمجھے اور اسے پیش کرے۔ ہمارے یہاں کئی صحافیوں نے اپنے جذباتی اداریوں اور اشتعال انگیز شذرات کی وجہ سے ایک طبقہ میں وقتی شہرت حاصل کر لی ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی صحافت کا یہ رنگ و انداز کسی انسانی گروہ کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔

صحافی کی دانشمندی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھے، سیاسی، سماجی، تہذیبی، ملکی اور بین الاقوامی

شذرات کے بہاؤ پر توجہ دے اور یہ دیکھے کہ بہاؤ کا رُخ کیا ہے۔ حالات ہمیں پوری توانائی کے ساتھ کس طرف لیجانا چاہتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں عالمگیر سطح پر کون سا دھارا بہہ رہا ہے اور اگر یہ دھارا ہمارے اجتماعی اقدار کے لئے ضرر رساں ہیں تو پھر ان حالات میں کون سی متوازن راہ اختیار کی جائے۔ غرض صحافتی ذمہ داری نہایت عظیم و وسیع ہے۔ اچھے صحافی کے لئے غور و فکر، تدبر و تفکر، مطالعہ و مشاہدہ، استفسار و تامل، دیدہ وری، پیش بینی، مطابقت و مفاہمت کی گوناگوں صفات ضروری ہیں ـــــ اور میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان متنوع صفات سے متصف صحافی اب ہمارے یہاں شاذ و نادر ہیں۔

جناب ادریس سنبھاروی کی شخصیت کے اگرچہ کئی پہلو ایسے ہیں جو اہل نظر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، لیکن میرے خیال میں اُن کی شخصیت کا سب سے مضبوط پہلو یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب صحافی تھے۔ جس طرح شعرا و ادبا کی داخلی شخصیت ان کے فن پاروں میں بالکل بے پردہ اور کہیں نیم ظاہر ہو جاتی ہے، اسی طرح صحافی کی شخصیت بھی اس کے اداریوں اور شذرات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ بلکہ شعرا، اُدبا کے فن پارے تو تخلیقی سطح پر پہنچ کر علائم و استعارات اور تخیلات و کنایات کی پرتوں میں شخصیت کو کھولنے اور چھپانے کا دوہرا عمل کرتے ہیں لیکن صحافی کی شخصیت اس کی تحریروں میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہاں مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کی اصطلاح میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہاں مسائل کو صاف اور واضح انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں مخاطبت قارئین کے عام طبقے سے ہوتی ہے۔ اس لئے اشارہ و علامت کی گنجائش نہیں ہوتی، یہاں توضیح و صراحت سے کام لیا جاتا ہے اور اس طرح قارئین کے ذہن کو مسائل اور اس کے نتائج پر غور و فکر کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا صحافی کی شخصیت اس کی تحریروں میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اچھا صحافی اپنے قارئین کو فکر و خیال کے Sobstantial نکات سے متعارف کراتا ہے، اس کی اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری کو دانش و آگہی کے ایسے چراغ عطا کرے جس کی روشنی میں قاری حالاتِ حاضرہ میں اپنا لائحہ کار مرتب کر سکے۔

ان حقائق کی روشنی میں جب ہم ادریس سنبھاروی کے اداریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس سیاست و معاشرت، اور تمدن و تہذیب کی کچھ متعین قدریں موجود تھیں۔ انہوں نے وہ دور بھی دیکھا تھا کہ ہندوستان برطانوی شکنجے سے آزاد ہونے کے لئے مضطرب

بے چین تھا۔ انھوں نے مغربی اقدارِ حیات اور مشرقی قدروں کی آویزش کا منظر بھی دیکھا تھا، انھوں نے اس امر کا مشاہدہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والے اس ملک کو محض جغرافیائی اصطلاح میں آزاد کرانا نہیں چاہتے تھے بلکہ یہاں اس مشرقی تمدن کے قیام کے لئے کوشاں تھے جس سے ہندوستان کی اپنی شناخت متعین ہو سکے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سامراجی طاقتوں نے استحصال و استعمار کی فضا پیدا کر دی ہے اور آزادی کے حصول کے ساتھ ساتھ ان لعنتوں سے بھی پاک ہونا ہے۔ ان کے سامنے وہ مسائل بھی تھے جو حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان میں پیدا ہو گئے۔ مذہبی عصبیت اور ذات پات کے جھگڑے، لسانی مناقشے، ریاستی تعلقات کی کشاکش، دولت کی تقسیم، پیداواری طاقتوں میں سرمایہ و محنت کی عادلانہ تقسیم، یہ اور ایسے بیشمار مسائل تھے جو آزادی کے بعد دیکھتے دیکھتے ہمارے ملک کو اپنے گھیرے میں لے رہے تھے۔ ادریسی صاحب کے پیشِ نظر یہ سارے مسائل تھے اور وہ ان کے حل کرنے کے لئے فکر و نظر اور عمل و اقدام کا مضبوط اور مرتب نظام رکھتے تھے۔

ادریسی صاحب کے اداریوں میں ہمیں تمام عصری مسائل نظر آتے ہیں۔ کہیں انھوں نے ہندوستان کے مال و استقبال کے لئے ایک تجزیہ ڈھانچہ پیش کیا ہے، کہیں لسانی جھگڑے کو غیر جذباتی انداز میں حل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کہیں ملک سے غربت و ناداری دور کرنے کا نسخہ پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ سارے نقائص اور معائب یک بیک دور نہیں ہو سکتے لیکن ان کا اصرار یہ ہے کہ ہماری حکومت اور ہمارے عوام کا رُخ صحیح سمت ہو تاکہ آج نہیں تو کل ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ وہ ہندوستان کو صحیح معنوں میں "جنت نشان" دیکھنا چاہتے تھے، انہیں جب یہ احساس ہوتا ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد بھی جب ہم نے اپنے اندازِ کار کو درست نہیں کیا ہے تو کہیں کہیں ان کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے، وہ ہندوستان کی سالمیت، اس کی خوشحالی اور عوام کے اطمینان کے خواہاں تھے اور جب اربابِ حکومت کو اس نہج سے غافل پاتے ہیں تو ان کی سرزنش بھی کرتے ہیں، کہیں کہیں ان کا انداز مایوسانہ بھی ہو گیا ہے مگر اس مایوسی میں بھی وہ اپنا پیغام اور اپنی آواز اربابِ حکومت اور عوام تک پہنچا دیتے رہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لیکن ہندوستان سے فرقہ پرستی، صوبہ پسندی اور تنگ نظری کو دور نہیں کر سکے۔ ہم ہندوستان کو زراعت کے معاملہ میں خود کفیل نہیں بنا سکے جبکہ ہندوستان سراپا زراعتی ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہم نے شہروں کو سنوارا

ماہنامہ سہیل، گیا

"لیکن گاؤں اور دیہاتوں پر کوئی توجہ
نہیں دیا۔ ہم یورپی ملکوں کی جیسی
بھریں اور غریبوں کو وہاں تک پہونچا
دیا، جہاں اب موت ہی ان کا علاج
ہے۔"

اس اقتباس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ادریس سنہاروی ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی اور خوش حالی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اپنی حکومتِ وقت کے اندازِ کار کی بنیادی خامیوں کو سمجھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سچا ہندوستان یہاں کے نادار طبقہ میں ہے۔ ہندوستان گاؤں کا ملک ہے۔ اس لئے ناداروں اور گاؤں والوں کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا جاتا تو ساری چمک دمک بیکار ہے۔ شہری ترقیوں کو ثانوی حیثیت دینی چاہیئے۔ پورے ہندوستان کو مثالی بنانے کے لئے ہمیں سب سے زیادہ توجہ دیہاتوں پر دینی چاہیئے ——— اور یہی نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں ان کا لہجہ سخت تر ہے، ان کے اندازِ تحریر میں نشتریت عیاں ہے۔

ادریس صاحب ایک آزاد ہندوستان کو جملہ لعنتوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اکثر و بیشتر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ہنوز آزادی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ آزادیٔ ہند کے بعد سے رونما ہونے والے متعدد فرقہ وارانہ فسادات نے ہمارے بہت سے اہلِ قلم اور صحافیوں کے خیالات ڈگمگا دیئے تھے۔ رجعت پرستی کو ہوا دینے والے ان فسادات نے لوگوں سے روشن خیالی، یک جہتی اور اتحاد و اتفاق کی جڑوں کو کمزور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن ادریس سنہاروی نے اپنے ترقی پسندانہ نظریات کو کبھی کمزور نہیں ہونے دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ فسادات اس بات کی علامت ہیں کہ اہلِ اقتدار نے عوام کو صحیح راستہ سے گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ہندوستانی عوام پر اعتماد رکھتے تھے اور عوام کی صلح و آشتی، امن پسندی اور انکی فطری سادگی پر یقین رکھتے تھے۔ اسی لئے اکثر و بیشتر ان کے یہاں حالات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ ملتا ہے۔ وہ عوام و خواص کو بار بار تاکید کرتے ہیں کہ آپس میں پھوٹ ڈالنے والی تنظیموں کو روک لگائیں اس لئے کہ ان تنظیموں کی پرورش درپردہ طور پر وہ طاقتیں کر رہی ہیں جو فاسسٹ ہیں، عوام دشمن اور ہندوستان دشمن ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض اداریوں میں ہندوستان میں سرگرمِ عمل ان ساری تنظیموں اور تحریکوں سے نمٹنے کی اپیل کی ہے جو اس ملک کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے اداریہ مطبوعہ سہیل جولائی ۱۹۷۲ء میں حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ ان تنظیموں پر پابندی لگائے جو ہندوستانی عوام کو ہلاکت کی طرف لیجانا چاہتی ہیں۔

ادریس صاحب نے زندگی کے ساتھ ادب کے منفی رویوں کی بھی شدت سے مخالفت کی ہے۔

وہ شعر و ادب کو بہتر زندگی کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں، وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ کسی ملک کے ادب پارے اس ملک کے عوام کی اجتماعی ذہنیت کے غماز بھی ہیں اور ان کے لئے مستقبل کے اصول کار بھی متعین کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب اور زندگی کے ناگزیر ربط کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے متعدد اداریوں میں ایسے ادب کی تخلیق کی تلقین کی ہے جو زندگی سے ہم آہنگ ہو، جس سے ہمیں اقدارِ حیات کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی استعداد حاصل ہو، ایک جگہ ادب کے منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "سیاسی اور سماجی زندگی پر اب منفی
> قوتوں نے اپنے حملے تیز تر کر دیئے ہیں۔
> صحت مند ادبی قدروں کے تحفظ کے
> لئے جس آزاد فضا کی ضرورت ہوتی ہے،
> ایسا لگتا ہے کہ اس پر اب بڑے حملے
> کی تیاری ہے۔" (کھیل، ستمبر ۱۹۷۹ء)

وہ یہ چاہتے ہیں کہ ادب کے ذریعے منفی قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ صحت مند ادب، صحت مند معاشرہ کا ضامن ہوتا ہے۔ اسی اداریہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی صورتحال
> اور سماجی اور تہذیبی زندگی میں اس
> کے اثرات کو نظرانداز کرنا ذمہ دار
> فنکار اور دانشور کے لئے کبھی
> ادب، آرٹ اور کلچر کی نشوونما سے
> لگاؤ ہے، ممکن نہیں۔"

وہ ادب کے عوامی کردار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ فاسسٹوں اور انارکسٹوں نے جہاں تہذیب و تمدن اور اخلاقی اقدار نیز امنِ عامہ کو تہس نہس کرنے کے لئے متعدد سیاسی حکمت عملیوں سے کام لیا ہے اور سازش کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں، وہاں ایک زبردست سازش یہ کی ہے کہ ادب کو عوام سے دور کر دیا جائے۔ عوام سے ادب دوری کی سبب کار اسکیم کو دو سطحوں پر کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ موضوع کے اعتبار سے ادب کو عوام اور اس کے مسائل سے دور کر دیا گیا، داخلی کرب کا غلط مفہوم بتایا اور اس نام پر موضوعاتی حیثیت سے ایسی چیزیں پیش کی جانے لگیں جن میں عام انسانوں کے جذبے، ان کے غم و انبساط اور ان کے واقعات و واردات کی بجائے ایسے دکھوں کا بیان ہونے لگا جن کا وجود خود فنکار کے لئے مشکوک تھا۔ گویا ادب کو سچائی سے دور کر کے تصنع کی سمت لیا کر اسے عوام سے بے تعلق کرنے کی سازش اس طرح سے بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ زبان، بیان اور علائم و اشارات کی سطح پر بھی ادب کو چیستاں بنا کر عوام اور عوامی مسائل سے علاحدہ کرنے کی سازش بھی کامیاب ہو رہی تھی۔ اندیس صاحب اس دوہری مضرت رسانی سے بھی

ماہنامہ سہیل، گیا
سے باخبر بھی تھے اور اپنے قاری کو اپنے اداریوں کے ذریعے بار بار متنبہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اردو زبان کی فطری ساخت، عوام سے اس کا اٹوٹ تعلق، اردو کے شعرا اور ادبا کی اصابت رائے پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لئے وہ ان تخریبی کارگزاریوں کے بے اثر ہونے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ایک جگہ ایک اداریہ میں لکھتے ہیں:

"تقریباً ڈیڑھ دہائی تک ادبی اناکسٹوں نے اپنی تمام منفی توتوں کے استعمال کے بعد بھی اردو ادب کے عوامی کردار کو مجروح کرنے میں ناکامی ہی حاصل ہوئی۔ اب جب کہ ان کے ہنگامے ختم ہو چکے ہیں اور تقریباً پندرہ برسوں کے کرب، تنہائی اور ذات کا الاپ Sublimate کر چکا ہے تو یہ بتا چلا کر زندہ ادب وہی ہے جس کا رشتہ عوام اور سماجی آہنگ سے استوار ہے"
(سہیل، اپریل ۷۹ء)

آگے چل کر اس اداریہ میں ادب اور ادیب پر مکمل اعتماد ظاہر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ:

"عوام نے ہمیشہ زندگی کی مثبت قدروں کو پہچان جیسا رہا ہے۔ ان کی نفی کرنے والے وقتی طور پر شور و ہنگامہ کی فضا ضرور قائم کر لیتے ہیں مگر ان کی Credibility کبھی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ سماجی دھارے سے کٹ کر جو بھی ادب تخلیق کیا جاتا ہے اس کی Credibility ممکن نہیں"

اس طرح پائیدار ادب کا رشتہ وہ سماج سے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ادب کے عوامی Recognization کا مفہوم یہ ہے کہ ادب ہمارے سماجی مسائل سے نزدیک ہو اور جامد، مردہ اور معطل نیز از کار رفتہ اقدار سے چمٹے رہنے کی بجائے تغیرات و انقلابات میں انسانی اور سماجی اقدار کے ساتھ تعاون کرے۔ ادریس صاحب یہ دیکھ رہے تھے کہ بین الاقوامی سطح پر ایک طاقت ایسی ہے جو شعر و ادب کو عوام سے الگ تھلگ رکھ کر اسے بھی نیم جان بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور ہمیں بھی ایک پائیدار اور تابندہ ادبی سرمایہ سے محروم کر رہی ہے۔ سازش کے تحت پیدا ہونے والے اس رجحان میں زیادہ تر قلم کار ایسے تھے جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آرٹ اور ادب کے نام پر دروں بینی اور داخلیت کی بات کرنے والا طبقہ کس طاقت کی رہبری میں کام کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ادریس سنہاروی نے بہ یک جگہ بڑی وضاحت سے فکر انگیزی کے ساتھ مسئلہ کے اصل پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہتے ہیں:

"تقریباً دو دہائی تک ہمارے ادب پر منفی رجحانات کو عام کرنے کی سازشی تحریک چلتی رہی جس کا نتیجہ

ماہنامہ سہیل، گیا

"یہ ہوا کہ صحت مند ادبی تجربوں کو بھی
وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا جس کے
وہ مستحق تھے۔ دراصل سماجی حقائق
کے تناظر کو نظر انداز کر کے کسی فن پارہ
کی تخلیق کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔"

("سہیل" اکتوبر ۱۹۷۸ء)

اور ایک اداریہ میں تو انھوں نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ صحت مند ادبی تحریروں کو زیر کرنے کی یہ منظم سازش ہماری زبان، ہمارے ادب اور ہمارے معاشرہ کی اولین دشمن ہے۔ وہ اس پردۂ زنگاری میں چھپے ہوئے معشوق کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں، اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ سحر سامری کس قدر باطل ثابت ہو گیا ہے وہ کہتے ہیں:

"پچھلے دس برسوں سے ادیبوں اور
شاعروں کے ایک حلقے نے انڈرواد [?]
میں جس رویّہ کی تبلیغ و تشریح کی
کوشش کی ہے اسے وقت کی کسوٹی
نے بیکار محض ہی نہیں بلکہ ہماری فنی
سیاسی اور سماجی قدروں کے
لیے زیاں کار بھی ثابت کر دیا ہے۔
یاسیت، کلبیت اور قنوطیت کے
اس مخصوص Comp میں وہ کسی قدر
کامیاب بھی ہوئے مگر ان کی نیت
کی تخریب کاری بہرحال ظاہر ہو
کر ہی رہی۔ وہ جانے انجانے
کسی سامری کے اشارے پر رقص فرما
تھے، یہ راز بھی اب منکشف ہو چکا
ہے۔"

("سہیل" اپریل ۱۹۷۸ء)

ادریس سنہاروی صاحب ادب و زندگی کی رفتار اور تبدیلیوں کے قائل ہیں۔ وہ ترقی پسندی کو کسی بے بنیاد نظریہ سے وابستہ نہیں کرتے، لیکن وہ اس امر پہ زور دیتے ہیں کہ ادبی اقدار کو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شعر و ادب میں نئے تجربات اور ہیئتی و اسلوبی تبدیلیوں کے منکر نہیں ہیں۔ ان کا اصرار شعر و ادب کے Content پر ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ادب چاہے کسی فارم میں ہو، چاہے انسان کے کسی مسئلہ سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کسی عہد سے تعلق رکھتا ہو، اسے ہر حال میں عام انسانوں کے مشترکہ مسائل سے رابطہ رکھنا چاہیے۔ اسے زندگی کے لیے ایک تعمیری اور مثبت لائحہ کار پیش کرنا چاہیے۔ اپنے ایک اداریہ میں ادریس صاحب نے ادب کی جدید تبدیلیوں کا استقبال بھی کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی بے راہ روی اور گمراہی سے بچے رہنے کی تاکید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"ہم ادب میں نئے تجربوں کے قائل ہیں
بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہر
صحت مند اور خوبصورت تجربے کا ہم

کی دستگیری اور ضرورت پوری کرتے تھے۔ ایسے ضرورت مندوں میں خواہ ادیب ہوں یا عام آدمی وہ کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک بن پڑتا وہ تعاون کرتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں وہ اپنے خیر خواہوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔

سہیل کی ادارت کے دور میں وہ نئے لکھنے والوں کی بڑی فراخ دلی سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ بعض دفعہ میں نے ان کو ٹوکا بھی کہ گھسی پٹی چیزوں کو شائع کر کے سہیل کے معیار کو مت گرائیے۔ جواب میں وہ ایسی باتیں لکھتے کہ میں ان سے پیار کرنے لگتا ــــ کیسے اچھے اور اعلیٰ انسان تھے ادریس بھائی۔

عمر کے تیسرے دور میں وہ بھی "ترقی پسندوں" کے شکار ہوئے اور وہ "حفظِ آفاقی قوانین" سے دور ہو گئے۔ بس مجھے ان میں یہی کمزوری نظر آئی ورنہ وہ سراپا خلوص کے پیکر تھے۔

میری پسندیدہ شخصیتوں میں ادریس صاحب کا درجہ بلند ہے۔ اور میرے سامنے جب بھی ایڈیٹر کا ذکر آئے گا، ادریس بھائی ضرور یاد آئیں گے۔ لیکن ایک مخلص اور خلیق انسان کی حیثیت سے ادریس بھائی ہم جیسوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور برابر یاد آتے رہیں گے۔

پیارے انسانوں سے
خدا کو بھی پیار ہو جاتا ہے

ڈاکٹر روحی قاضی

کہا جاتا ہے کہ اکثر لوگوں کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ لیکن میرے بزرگ محترم ادریس سہارنوی کے ساتھ یہ بات نہ تھی۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بظاہر انسانیت اور شرافت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ لیکن باطنی طور پر بالکل برعکس۔ مرحوم کو مرحوم کہنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے کہ وہ آج بھی اپنی تمام تر خصوصیت کے ساتھ میرے دل و دماغ میں زندہ ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنوں سے ملے ہوئے زیادہ عرصہ ہو جائے تو چہرہ بھولا بھولا سا لگتا ہے مگر مرحوم سے بچھڑے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ لیکن ان کی صورت آج بھی نگاہوں میں جوں کی توں ہے۔ کشادہ پیشانی، روشن اور بولتی ہوئی آنکھیں، مسکراتے لب، سنجیدہ اور پر وقار چہرہ جسے دیکھنے سے یہ گمان ہوتا تھا کہ فرشتوں کے چہرے ایسے ہی مقدس ہوں گے۔ انسان دوستی، شرافت، وفا اور ایثار کا مجسمہ تھے مرحوم۔

ادریس چچا سے میرا خون کا رشتہ نہ تھا لیکن وہ مجھے اپنے والد جمیل عالم جلیلی مرحوم کی طرح عزیز تھے۔

جس قدر دکھ مجھے اپنے والد کے گذرنے کا ہوا تھا اس سے کسی بھی درجہ کم غم مجھے ادریس چچا کے گذرنے کا نہیں ہوا بلکہ ان کے اچانک انتقال کی خبر نے مجھے اس قدر غمگین کر دیا کہ میں سکتے میں آگئی کئی رات اور کئی دن مجھے یہ دکھ ستاتا رہا کہ میں دار فانی سے کوچ کرتے وقت آخری بار انہیں دیکھ نہ سکی۔ آج بھی وہ دن مجھے یاد ہے جب پہلی بار ان سے ملی تھی۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم نے سفر گلگتہ کے دوران مجھ سے کہا تھا کہ میں "سہیل" (دیرچہ گیا) میں اپنی کہانیاں بھیجوں۔ ان کے مشورے کے مد نظر میں نے "سہیل" کے ایڈیٹر ادریس سہارنوی کو (اس وقت مرحوم ہی سہیل کے ایڈیٹر تھے) کے نام خط لکھا اور کہانی روانہ کی جب مجھے جواب ملا تو اس خط میں عجیب سی بات محسوس ہوئی اور میرا دل چاہنے لگا کہ میں جناب ادریس سہارنوی سے ملوں۔ اتفاقاً میں پٹنہ گئی تو ادریس چچا کا خیال آیا اور میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ گیا کتنی دور ہے۔ انہوں نے کہا کہ جانے کے لئے راستہ ہے۔ میری خواہش پر وہ فوراً تیار ہو گئیں اور ہم دونوں

گیا سہیل تھے ایڈیٹر کو ڈھونڈتے ہوئے گھر کے پتے پر پہونچے تو ایک بزرگ جو سادگی اور سنجیدگی کا مجسمہ تھے میرا نام جانتے ہی مکان کے اندر لے گئے اور دروازہ سے ہی بولے۔

"دیکھو تو کون آیا ہے"

"بیٹی یہ تمہاری چچی ہیں اور یہ کلکتہ سے آئی ہیں بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ .... دیکھو نا بیگم، روحی بیٹی سے مل کر طبیعت خوش ہو گئی ہماری قوم میں فنکار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی کمی ہے"

"بس بھی کیجئے چچا جان! آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں!"

"نہیں بیٹی میں سچ کہہ رہا ہوں اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے"

مجھے کیا کسی کو بھی ان کی باتوں میں جھوٹ کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ وہ تو سراپا سچے اور مخلص انسان نظر آتے تھے۔ بشیر کی پاکیزگی نے ان کی صورت کو آسمانی کتاب کی طرح مقدس بنا دیا تھا میں ان کے سراپا کو دیکھ اور سن کر سحرزدہ تھی۔ کوئی انسان اتنا بھی پیارا ہو سکتا ہے۔ ان کے خلوص اور انسان دوستی سے میں اس قدر سرشار ہوئی تھی کہ بالکل خاموش تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ جس شخص کے اندر خدا نیک گفتاری اور نیک کرداری بھر دیتا ہے وہ ایسا ہی مقدس اور عظیم ہوتا ہے۔ جی ہاں! خدا نے مجھے ایک خاص چیز عطا کی ہے وہ خاص چیز یہ ہے کہ میں کسی بھی شخص کے ظاہر سے اس کے باطن کو جان لیتی ہوں۔ کون کہتا ہے کہ آج کی دنیا ان لوگوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اور بس سہارا روحی جیسا انسان میرے نگاہوں کے سامنے تھا۔ سچ میں دنیا کو انسان سے خالی سمجھ رہی تھی۔ مجھے گم سم دیکھ کر مرحوم نے کلام کیا۔

"روحی بیٹی تم کہانیاں بہت اچھی لکھتی ہو۔ تمہاری ایک کہانی "ہڈیوں کے فریم" سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھو یہ مضامین تمہیں کام دیں گے"

"چچا جان آپ کے مشورے پر عمل کروں گی اب تک میں شوق کی تکمیل کے لئے کہانیاں لکھتی رہی لیکن اب ضرورت کا بھی خیال رکھوں گی"

"تم فوراً ایک مضمون لکھو، منشی پریم چند کی کہانیوں میں عورت کا تصور" سہیل کا اگلا شمارہ پریم چند نمبر ہی ہوگا"

کمال تھا چچا مرحوم کی ذہانت کا انہوں نے میرے لئے مضمون کا انتخاب کیا بھی تو میری دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے کچھ اور باتیں اور چند باتوں کے بعد میں رخصت ہو گئی۔ اور اپنے ساتھ لائی ایک میٹھا احساس جس میں انسانیت محبت اور شرافت کی چاشنی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے کسی آسمانی شخصیت کو پا لیا تھا۔ آسمانی سوچنے پر مجبور تھی۔ اس لئے کہ زمین پر خود پرستی، خود غرضی، بغض حسد اور خود نمائی سے بھرپور انسانوں سے میں اب تک مل سکی تھی۔ جو انسان تو کہلاتے تھے مگر انسانیت سے خالی تھے۔ شرافت کا لبادہ اوڑھے ادب کے کندھے پر بیٹھ کر زبان کا تیر چلا کر شکار کر رہے تھے۔ اور اس شکار سے ذاتی خواہشات کی تکمیل کر رہے تھے۔ ایسی مفاد پرست دنیا میں اور ایسی چچا جیسی شخصیت بے لوث مخلص اور مہربان میرے لئے عظیم احساسات ثابت ہوئی۔ اپنے نام کی مناسبت سے میں روحانی نکہت

بے لوث محبت اور کردار کی پاکیزگی کی دیوانی تھی۔ مادی
تعلق سے بے پرواہ ایسے میں ادریس چچا میں مجھے سب
کچھ مل گیا۔ دور رہتے ہوئے بھی مجھ سے بہت قریب ہے
ان کی تحریر ان کے ساتھ ہونے کا احساس دلاتی رہی
ایک دن چچا کا کارڈ ملا جس میں ان کی صورت غمگین نظر
آئی .... چچی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا
میں چچا کے غم میں شریک ہوئی تو مجھے ایسا لگا کہ ادریس
چچا اکیلے ہو گئے ہیں۔ (ماشاءاللہ ان کے ساتھ ان کے
تین بیٹے، مسعود، جمیل، منہال اور ایک بیٹی بلقیس اور بہو
نشاط موجود تھیں)

ان کی اداسی اور ان کے غم کو دیکھ کر سوچنے
لگی تھی ...... کیا شوہر اپنی بیوی سے اس قدر محبت
کر سکتا ہے۔ تو مجھے جواب ملا کہ ایک با کردار اور سچا
شخص اپنے تمام متعلقین کے ساتھ سچا اور وفادار ہوتا ہے
مرحوم کے غم والم کو دیکھ کر ایسا دل چاہتا تھا کہ چچی جان
کو کہاں سے اٹھا لاؤں۔ ان کی رفاقت سے محروم ہو کر
چچا جان ادھورے ہو گئے تھے .... اور وقت
کا دریا بہتا رہا اور ایک دن میرے گھر میں بہار آئی ..
.... میرے مخلص و مشفق چچا جان کی موجودگی سے میرے
گھر کی دیواریں مسکرا اٹھیں .... اور والد مرحوم کے
بعد میں اداس چچا سے پہروں راز و نیاز کی باتیں کرتی رہی
گھر کی ذمہ داریوں سے بے خبر ...... چچا جان مجھے
گیا آنے کے لئے کہہ کر گئے لیکن افسوس میں حالات کے
ناسازگاری کی بنا پر ان کے بلاوے پر نہ جا سکی۔ اور
ایک دن جمیل منظر کی تحریر نے مجھے غم والم کے اندھیرے
میں ڈال دیا۔

" کیا اللہ کو میری عزیز چیزوں سے ہی پیار ہے
آہ پہلے میرے والد مجھ سے جدا ہو گئے اور اب ادریس
چچا ...... یہ سچ ہے پیارے انسانوں سے خدا کو بھی
پیار ہو جاتا ہے۔ وہ (اللہ) زیادہ دنوں تک ایسے
انسان سے دور نہیں رہ سکتا ..... "

کلیم ا۔ جعفری

اِدریس سنسہاروی

ایک صحافی، ایک انسان

آج میں جس شخصیت پر کچھ لکھنے جا رہا ہوں ان سے میرے تعلقات بہت دیرینہ تھے۔ حضرت ادریس سنسہاروی کی پیدائش ۲۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو موضع سنسہاری ضلع نوادہ (سابق ضلع گیا) میں ہوئی تھی۔ آپ کے والدِ محترم کا اسم گرامی حافظ عبدالرحمٰن تخلص بسمل سنسہاروی تھا۔ بسمل صاحب ایک کہنہ مشق شاعر اور عالم دین تھے۔ ادریس صاحب کی تعلیم بھی مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ گھریلو تعلیم کے علاوہ بقدرِ ضرورت ادریس صاحب نے انگریزی اور ہندی زبان میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ وہ بظاہر کسی یونیورسٹی سے فارغ شدہ اسکالر نہ تھے لیکن ادبی ماحول میں تربیت ہوئی تھی اس لئے فارسی اور اُردو ادب میں اچھی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد جب ایک باذوق نوجوان کی حیثیت سے اُردو ادب کی دُنیا میں روشناس ہوئے تو حضرت بسمل سنسہاروی مرحوم نے ادریس صاحب کو مشہور رسالہ "سہیل" کی ادارت سونپ دی۔ ادریس صاحب کی بدولت یہ رسالہ آسمانِ ادب پر ایک روشن ستارے کی مانند دمکنے لگا۔ پھر ایسا ہوا کہ ادریس صاحب کچھ عرصہ کے لئے بمبئی چلے گئے اور وہاں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ بمبئی میں وہ کیفی اعظمی اور احسن رضوی کے ہمراہ فلمی دُنیا سے وابستہ ہوئے۔ لیکن وہ فلمی دنیا میں زیادہ عرصہ تک کام نہ کر سکے اور بالآخر کمیونسٹ پارٹی کے ایک رسالہ کی ادارت کی خاطر دلی بلا لئے گئے۔ وہ پارٹی کے اخبار کی کتابت بھی کرتے رہے اور ادارت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ دلی میں اُن کے ہمراہ سجاد ظہیر بھی تھے۔ لیکن ایک قلیل مدت کے بعد دلی سے پٹنہ آ گئے اور اُردو کے معروف افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی مرحوم کے ہمراہ رسالہ "تہذیب" جاری کیا۔ رسالہ تہذیب کو بڑی مقبولیت حاصل

ہوئی۔ اس کے علاوہ پٹنہ ہی سے ایک ہفتہ وار مجلہ "زمین" جاری کیا گیا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ رسالہ "تہذیب" اور "زمین" کے بند ہونے کے بعد ادریس صاحب گیا آگئے اور اسی شہر گیا میں آخری عمر تک ماہنامہ "سہیل" سے وابستہ رہے۔ رسالہ "سہیل" کی اشاعت اگست چھیالیس برس سے ہو رہی ہے۔ یہ ترقی پسند ادب کا ترجمان ہے۔ اس کی مجلس ادارت سے راقم الحروف بھی ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء وابستہ رہا۔ رسالہ "سہیل" کے خاص موضوعات پر شائع کئے گئے نمبروں کو اردو ادب میں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس رسالے کے کچھ خاص نمبر مثلاً "بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر"، "سہیل عظیم آبادی نمبر"، "جمیل مظہری نمبر" اور "کیفی اعظمی نمبر" بیحد پسند کئے گئے۔ ان کے علاوہ متعدد شمارے ایسے شائع کئے گئے جن میں کسی نہ کسی ادبی شخصیت پر مخصوص گوشے شامل ہیں۔ اس رسالے کو ہند، پاک اور بنگلہ دیش میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ اس مجلے کی ادارت میں جو معروف ادبی شخصیتیں وابستہ رہیں ان میں علامہ جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، سالک لکھنوی، حرمت الاکرام، قیصر عثمانی، ڈاکٹر علیم اللہ حالی اور کلام حیدری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان دنوں اس رسالے کی ادارت مسعود منظر سنہاروی اور جمیل منظر سنہاروی بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اس رسالہ میں ہند و پاک کے مشہور ادبا اور شعرا کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ادریس سنہاروی کی بدولت "سہیل" کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میری ملاقات ادریس سنہاروی سے یاد آتا ہے کہ جون کی تپتی ہوئی دھوپ میں اپنے گاؤں پانڈیہ کٹ مسعود خلیل زادہ میں آئے ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔ ادریس صاحب اپنی صاحبزادی کے رشتہ کے سلسلے میں میرے آبائی گاؤں آئے ہوئے تھے۔ موصوف سے مل کر مجھے بیحد خوشی ہوئی تھی۔ اور یہاں ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ موصوف کے داماد نسیم الدین میرے ہی ہم جماعت تھے۔ شادی کے سلسلے میں نسیم کے والد نے جہیز کی شرط رکھی تھی لیکن میری کوششوں سے بحسن و خوبی بغیر کسی فضول لین دین کے شادی انجام پا گئی۔ ایک ادیب نے ایک ادیب کے ساتھ جو تعاون کیا اس کا ذکر اکثر خطوط میں ادریس صاحب مرحوم کیا کرتے تھے۔

کیا خبر تھی کہ خلوص و محبت کی آئینہ دار شخصیت اپنے بے پناہ چاہنے والے دوستوں، عزیزوں، شاعروں اور ادیبوں کو چھوڑ کر ۲۵ اگست ۱۹۸۴ء کو اپنے حقیقی مولا سے جا ملے گی۔ میری آنکھوں سے آنسو کے پیالے چھلک رہے ہیں جب یہ تحریریں لکھ رہا ہوں۔

میرا قیام کلکتہ میں ۱۹۷۹ء تک رہا۔ جب وطن آتا تو بطور خاص موصوف سے ان کی رہائش گاہ اور "سہیل" کے دفتر واقع [illegible] زید سائیڈ روڈ پر ملتا۔

ادھر ۱۹۷۷ء دسمبر سے میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہوں ۔ چنانچہ جب دہلی سے وطن جاتا تو گیا میں حضرت ادریس سنہاروی سے مل کر جاتا ۔ ان سے مل کر جو روحانی مسرت ہوتی تھی، صرف محسوس کرنے کی چیز ہوتی تھی۔ ادب، صحافت، شاعری اور نجی گفتگو فرماتے ۔ اپنائیت خلوص کا ایک سمندر اُبلنے لگتا ۔ ایک بار کسی مسئلے پر معمولی سا اختلاف ہوا ۔ لیکن دوبارہ ملاقات کی تو محسوس ہوا کہ کبھی کوئی اختلاف ہوا ہی نہ تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ادریس سنہاروی مشرقی تہذیب کا نمائندہ تھے ۔ حضرت ادریس سنہاروی کے لکھے ہوئے اداریئے جو ان کے رسالہ "سہیل" میں شائع ہوتے تھے، بڑی اہمیت کے حامل تھے ۔ موصوف جس موضوع پر لکھتے اس کا حق ادا کرتے تھے ۔ ایک زمانہ ان کی عسرت اور تنگدستی کا بھی گذرا لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری ۔ بڑے منکسر المزاج اور صاف گو تھے ۔ ایک بار ۱۹۷۴ء میں بیاد حافظ عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی گیا میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں ملک کے مشہور شعرا مدعو تھے ۔ میں نے بھی اپنا کلام پڑھا تھا ۔ موصوف نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی تھی ۔ بڑے بھائی سجاد ظہیر مرحوم ان سے بیحد محبت کرتے تھے ۔ ادریس صاحب ایک کامیاب صحافی اور نیک انسان تھے ۔ اُردو صحافت کی خاموش خدمت کرنے والوں کی فہرست میں جناب ادریس سنہاروی کا نام نمایاں رہے ۔ ادھر چند سال سے وہ قلب کے عارضہ میں مبتلا تھے ۔ آخرکار اس دُنیائے فانی سے رخصت ہو گئے ۔

مجھے جب انکی باتیں یاد آتی ہیں تو آنکھیں اس لئے نم ہو جاتی ہیں کہ آج کے اس کم سواد دَور میں ایسی فرشتہ صفت شخصیت کہاں سے لاؤں جن سے مل کر جی ہلکا کروں ۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ ان کے لائق صاحبزادے مسعود منظر اور جمیل منظر رسالہ سہیل کو جاری رکھیں گے ۔ ادریس صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کی ایک بہتر صورت یہ بھی ہوگی کہ بہار اردو اکیڈمی ان کے مختلف مضامین اور اداریوں کو کتابی صورت میں شائع کرے اور رسالہ "سہیل" کی معاونت پہلے سے زیادہ کرے ۔

آخر میں ادریس صاحب کے لئے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ادبی خدمات کے پیش نظر خدا انکی قبر کو رحمت کے پھولوں سے بھر دے ۔ (آمین)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر مسعود منظر نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "سہیل"، ریلوے سائیڈ روڈ۔ گیا سے شائع کیا۔

فیاض حالی (ایڈوکیٹ)

ادریس بھائی

ادریس بھائی سے اتنی باتیں اور اتنی یادیں وابستہ ہیں کہ ان سبھوں کو اکٹھا کرنا اور انہیں قلم بند کرنا آسان نہیں۔ پھر اس کے لئے ایک طویل دفتر درکار ہے۔ جس کے لئے مجھے موقع نہیں۔ لیکن آج جب میں ادریس بھائی کے سلسلہ میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو ایک دو اہم واقعات خاص طور پر ذہن میں رینگ رہے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انہیں کے ذریعہ ادریس بھائی کے مزاج اور ان کی طبعی شرافت اور ان کی انسان دوستی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ادریس بھائی ایک مخلص انسان تھے اور ترقی پسند ذہنیت کے مالک تھے۔ انہیں مستحکم ارادے اور فیصلہ کی قوت عطا ہوئی تھی۔ وہ باقاعدہ علمی صلاحیت کے حامل تھے۔ صحافت کے میدان میں انہوں نے خوشنما اثرات پیدا کئے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کا انہوں نے براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے انصاف پسندی اور غریب پروری ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔

ادریس بھائی سے میری ملاقات برسوں سے پرانی تھی۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ اور میں بھی ہمیشہ انہیں بڑا بھائی سمجھ کر ان سے ہدایات حاصل کرتا تھا۔ میں کسی کام سے گیا سے باہر گیا ہوا تھا اور ۲۶ اگست ۱۹۸۲ء کو واپس آیا تو پتہ چلا کہ کل یعنی ۲۵ اگست ۱۹۸۲ء کو ادریس بھائی ہم سبھوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس صدمہ جانکاہ کا اثر آج بھی باقی ہے۔ ان سے جو قربت رہی ہے وہ آج بھی ان کے غم میں خون کے آنسو رلا رہی ہے ان کی یاد کی یہ شدت کسی جذباتی تاثر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ میں نے ہمیشہ ان سے اچھی باتیں سیکھی ہیں۔

تفصیل سے اجتناب کرتے ہوئے میں صرف دو اہم واقعات درج کر رہا ہوں۔ انہیں واقعات سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قحط الرجال کے دور میں ادریس بھائی کی شخصیت کتنی مثالی تھی۔ پہلا واقعہ کچھ یوں ہے کہ مسجد حاجی تقی محلہ پیر پانی [illegible] شہر گیا کی ایک کمیٹی [illegible] میں میری [illegible] اور [illegible] سبب [illegible] ایک [illegible] نام کا تب [illegible] اس کا علم تھا۔

ماہنامہ سبیل کیا۔

مسجد کمیٹی کا مجھے صدر اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو سکریٹری بنایا گیا تھا۔ اور دیگر پانچ ممبران میں ادریس بھائی بھی ایک تھے۔ میں خود کو مسجد کمیٹی کی صدارت کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ اور نہ میری مرضی سے شمولیت کی گئی تھی۔ اس لئے میں اس کمیٹی سے استعفا دینا چاہتا تھا۔ پر ادریس بھائی کی شخصیت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور انہوں نے بتایا کہ مجھے صدر کے لئے بہ اتفاق رائے منتخب کیا گیا تھا جس کی تجویز انہوں نے کی تھی۔ اور انہیں اعتماد تھا کہ میں ان کی بات رد نہیں کروں گا۔ بہرحال کئی سال تک اس کمیٹی میں شامل رہ کر ادریس بھائی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب سکریٹری کے ساتھ ساتھ مسجد کی امامت اور جاروب کشی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ مولانا اچانک ۲۹ جولائی ۱۹۸۶ء کی صبح ۴ بجے اس دار فانی سے رحلت کر گئے یہ ایک بڑے ہی مخلص انسان تھے۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ بی بی انیسہ خاتون ساکنہ محلہ پنجابی تکیہ ابھانڈہ شہر گیا کی شادی [illegible] میں عبدالغنی ساکن محلہ بنیا پوکھر شہر گیا سے ہوئی تھی اور دین مہر کی رقم مبلغ ۵ ہزار روپیہ علاوہ نان و نفقہ طے قرار پائی تھی۔ دونوں کی ابتدائی زندگی بڑی خوشگوار گذری۔ لیکن کچھ دنوں سے عبدالغنی انیسہ خاتون کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے لگے تھے اور آخر کار ۸ فروری [illegible] کو عبدالغنی نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اور اس کا سارا سامان چھین لیا۔ نتیجتاً اس بے سہارا عورت نے اپنی ماں کے گھر محلہ پنجابی تکیہ ابھانڈہ شہر گیا میں پناہ لی۔ ادریس بھائی کو اس واقعہ کی خبر ملی۔ ان کا حساس دل تڑپ اٹھا۔ اس مظلوم غریب عورت جس کو نہ خود اپنی کفالت کی صلاحیت تھی اور نہ اس کی ماں اس لائق تھی۔ بے سہارا دیکھ کر حرکت میں آگئے۔ اور انہوں نے خود اور دوسرے بااثر لوگوں کے ذریعہ عبدالغنی کو بہت سمجھایا لیکن اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس معاملہ کا تذکرہ ایک دن مجھ سے ادریس بھائی نے کیا۔ اور بی بی انیسہ خاتون کو قانونی مدد دینے کے لئے، اس مظلوم کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہوئے بی بی انیسہ خاتون کے نان و نفقہ کا ایک مقدمہ

CRIMNAL PROECDURE CODE

کے دفعہ ۱۲۵ کے تحت چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ گیا کی عدالت میں دائر کر دیا۔ عرضی کے دوسرے پارہ میں دین مہر کی رقم اور زیور کا بیان تھا۔ نان و نفقہ کے لئے ۳۰۰ روپیہ ماہانہ درخواست کی گئی تھی۔ عدالت نے سماعت کر کے مدعا علیہ عبدالغنی کو شو کاز نوٹس کر دیا۔ عبدالغنی عدالت میں حاضر ہونے اور کئی تاریخ پر مہلت لینے کے بعد شو کاز عدالت میں پیش کیا۔ شو کاز میں انہوں نے ایک جھوٹا اور بے بنیاد دعویٰ پیش کیا۔ کہ انہوں نے مدعیہ انیسہ خاتون کو ۱۰ مارچ [illegible] کو طلاق دے دیا ہے۔ اور ۳۰ مارچ [illegible] کو مدعیہ بی بی انیسہ خاتون نے ایک پنچایت بلائی جس میں مدعا علیہ عبدالغنی نے مہر کی رقم ۵۰۰ سو روپیہ اور ۵۰ سو روپیہ عدت کی ادا کر دیا ہے۔ مدعا علیہ کا یہ سراسر غلط اور بے بنیاد دعویٰ تھا۔ نہ مدعیہ کو ۱۰ مارچ کو طلاق ہی دیا گیا تھا اور نہ دین مہر کی رقم مبلغ ۵۰۰ روپیہ قرار پایا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ۳۰ مارچ کی پنچایت کا بیان بھی بے بنیاد تھا۔ یہ غلط اور بے بنیاد

ادریس سنہاروی

نظام الدین احمد

یہ سن ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ ۹، ۱۰ سال کا ایک بھولا بھالا لڑکا حافظ عبدالقدوس صاحب کے مدرسہ میں روزانہ آتا تھا۔ کرتا، پاجامہ پہنے سر پر ٹوپی بغل میں قرآن پاک اور رحل دبائے وہ وقت کی پابندی سے آیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہ مدرسہ محلہ سرائے میں سڑک کے مغربی حصے میں تھا اور آج بھی وہیں ہے۔ آگے چل کر یہی لڑکا حافظ ادریس سنہاروی کے نام سے مشہور ہوا۔ انقلاباتِ زمانہ نے نئے نئے رنگ دکھائے۔ وہ عہد سیاسی، سماجی، معاشرتی اور فکری اعتبار سے تغیرات کی تیز رفتاری کا زمانہ تھا۔ تغیرات نے ادریس سنہاروی کی شخصیت اور انکی زندگی پر زبردست اثر ڈالا۔

ادریس کا شعور کچھ اور پختہ ہوا تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ روایتی اندازِ فکر میں عہد حاضر کے تقتضا کے لحاظ سے مناسبت کے لئے زبردست تبدیلی کی ضرورت ہے۔ نئے علوم و فنون، اور شعر و ادب کے مطالعہ نے انکی نگاہ میں وسعت اور دماغ میں کشادگی پیدا کردی۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ دور تھا جب ملک پر اشتراکی تحریک زور شور سے اثر انداز تھی۔ نوجوان نسل کے بہت سے وہ افراد جو قدیم و روایتی ماحول کے پروردہ تھے ایک محدود فضا سے نکل کر حقیقتوں کو نئی وسعت میں تلاش کر رہے تھے۔ پورے ہندوستان کی طرح گیا میں بھی یہ صورتحال نمایاں تھی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے مولانا خیرالدین کے صاحبزادے سید ابوالعلا، حافظ عبدالقدوس صاحب کے صاحبزادے سید عبدالرؤف اور جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب بسمل سنہاروی کے صاحبزادے ادریس سنہاروی بھی اس تحریک سے متعلق ہوگئے۔ ان کی رہنمائی بہار کے مشہور کمیونسٹ سید منظر رضوی کر رہے تھے۔ چنانچہ اس تحریک میں شمولیت کی وجہ سے ادریس سنہاروی کبھی پوشیدہ اور کبھی کھلے طور پر کمیونسٹ پارٹی کا

کام کرتے رہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب حکومت
نے پارٹی پر پابندی عائد کردی تھی۔ دار و گیر کا
عالم تھا، اس لئے زیادہ تر کام چھپ چھپا کر
ہوتا تھا، مختلف جگہوں میں کمیونسٹ تحریک کو
مضبوط بنانے کے بعد جب ادریس سنہاروی گیا
واپس آئے تو وہ گیا شہر کمیٹی کے سکریٹری بھی رہے۔

چونکہ ادریس سنہاروی صرف ایک سیاسی
ورکر ہی نہیں تھے بلکہ انہیں ادب و صحافت کا
ماحول بھی ملا تھا اس لئے تحریک کی ادبی شاخ
یعنی ترقی پسند ادبی تحریک سے بھی انکا اٹوٹ
تعلق رہا ہے۔ ان کے والد نے پہلے ہی ایک
مطبع شمسی پریس کے نام سے قائم کرلیا تھا۔ اس
لئے گیا واپس آکر انھوں نے طباعت و کتابت
کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ماہنامہ سہیل جو
عالم التوا میں تھا ادریس سنہاروی کی غیر معمولی
جدوجہد اور ادبی و صحافتی تجربات کی وجہ سے
اب باقاعدگی سے نکلنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ
اس کا معیار بلند ہو رہا تھا۔ انھوں نے اس رسالہ
سے ایک طرف کامیاب ادبی تخلیقات کی اشاعت
کی اور دوسری طرف انھوں نے ادبی و ثقافتی نقوش
کو بدلنے کی کوشش کی جن میں جمود اور تعطل پیدا
ہو چکا تھا۔

وہ زبردست سوجھ بوجھ کے حامل تھے۔ اشتراکیت
سے اگرچہ ان کا گہرا تعلق تھا لیکن وہ اشتراکیت
کو فیشن کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے
وہ اسے عام لوگوں کے لئے بہتری اور بڑائی کا ذریعہ
بنانا چاہتے تھے۔ لیکن تیزی سے بدلنے والے
حالات نے بہت جلد یہ ظاہر کردیا کہ مستقبل
قریب میں اشتراکی خیالات کو سیاسی طور پر
ہندوستان میں استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔
لہٰذا ان کے خدمتِ خلق کے جذبے نے چھوٹے
بڑے منصوبوں کا سہارا لیا جن سے عوام الناس
کی بھلائی ہو سکتی تھی۔ مذہبی اداروں کی بے
انتظامی اور بدعنوانی سے انھیں تکلیف ہوتی
تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اسے بھی عوام کی اصلاح
کا ذریعہ بنایا جائے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ وقف
کمیٹیوں کی عملی کارگزاریوں کی دیکھ ریکھ کرتے
ہوئے انہوں نے اپنے خواب کو کسی حد تک
شرمندۂ تعبیر بنالیا۔

ادریس سنہاروی بہار اور بیرون بہار
کی اردو تحریک سے بھی گہرے طور پر وابستہ
رہے ہیں۔ اس عہد کے سہیل کے اداریے اس بات
کے شاہد ہیں کہ انھوں نے اردو کو اس کا جائز
حق دلانے کی انتھک کوشش کی۔ انہوں
نے ان افراد کی سازشوں کو بھی بے نقاب کردیا
ہے جو اردو کے نام پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے
ہیں اور اسے اپنے ذاتی منفعت کا ذریعہ بنانا
چاہتے ہیں۔ ادریس سنہاروی نے حکومت سے
اردو یونیورسیٹی کا مطالبہ بھی کیا ہے لیکن جہاں
بہت سے مطالبات ہنوز دبے ہوئے ہیں وہاں

(باقی ہے)

ادریس سنہاروی کا سانحۂ رحلت

اردو دوستوں کے لئے زبردست حادثہ

مرحوم زندگی بھر انجمن کی اردو تحریک سے وابستہ رہے

صدر انجمن مولانا بیتاب صدیقی کے تاثرات اور تعزیتی بیان

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے ایک پرانے رکن اور بہار کے سب سے قدیم ماہنامہ سہیل گیا کے مدیر مؤسس، اردو تحریک کے روح رواں، ایک ممتاز صحافی اور ایک ممتاز ادیب جناب ادریس سنہاروی کا سانحۂ ارتحال اردو دوستوں کے لئے ایک زبردست حادثہ اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے حلقہ میں گہرے رنج و اندوہ کا باعث ہوا۔ اور میرے لئے صدمۂ عظیم اور ناقابل تلافی نقصان سانحہ سے دوچار ہونے کے مرادف ہے۔ ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ابدی سکون عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے (آمین)

جناب ادریس سنہاروی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو اور اس کی اردو تحریک میں ابتدا ہی سے شامل رہے۔ اور ہر موڑ پر انجمن اور اردو تحریک سے انہوں نے گہری وابستگی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۸۲ء میں جب ریاستی انجمن نے اضلاع میں تربیتی کیمپ کے انعقاد کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے مرحوم نے گیا میں شاندار طریقے پر تربیتی کیمپ کا اہتمام کیا۔

ادھر کچھ عرصے اپنی صحت کی خرابی اور دل کے مریض ہو جانے کی وجہ سے وہ عملی طور پر انجمن کی سرگرمیوں میں شرکت سے معذور ہو گئے تھے۔ پھر بھی ان کا مخلصانہ تعاون ہمیں حاصل تھا۔ جب کبھی ریاستی انجمن ترقی اردو کی تحریک میں سستی آئی یا کوئی ایسا موڑ آیا کہ انجمن پریشان کن حالات سے دوچار ہوئی انہوں نے ہمیں سہارا دیا اور اپنے پر خلوص مشورہ دیا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تحریک کے مقاصد کو تقویت پہونچانے میں انہوں نے ماہنامہ سہیل کو بھی استعمال کیا۔

مرحوم انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی گہری

وابستگی رکھتے تھے۔ اور بہار میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو روشناس کرانے اور آگے بڑھانے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ادھر کچھ عرصے سے یہ انجمن جمود و تعطل کا شکار ہوئی تو اسے ادریس سنہاروی مرحوم اور ان کے حلقے نے زندہ رکھا۔ ایسا بھی ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرکردہ اصحاب جو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھے۔ الگ ہو گئے یا خاموشی اختیار کی لیکن جناب ادریس سنہاروی مرحوم نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو سے اپنی وابستگی برقرار رکھی۔ کسی اخلاقی مسئلے یا سیاسی مصالحے نے بہار ریاستی انجمن سے مرحوم کو علاحدہ کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم کردار کے مالک تھے۔

گیا میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی تحریک کو دبانے کے لئے جب کبھی کوئی شاخسانہ کھڑا ہوا۔ جناب ادریس سنہاروی نے ہمیشہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ساتھ دیا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اردو سے گہری محبت اور شیفتگی رکھتے تھے۔ افکار و نظریات میں ریاستی انجمن کے قائدین سے اختلاف کے باوجود کبھی انھوں نے اپنے اختلاف کا اظہار نہ کیا۔ وہ اردو آبادی کے مسائل پر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بیحد تشویش میں مبتلا تھے۔ اور ان مسائل پر قابو پانے کیلئے راہ کا تعین اور اس کا حل مجھ سے اعتماد کے ساتھ تلاش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تنظیم کو فروغ دیا جائے اور اردو تحریک کو عملی طور پر عوام میں پھیلانے کے لئے جدوجہد کی راہ پر گامزن رہنا چاہیے۔

ادارہ "سہیل" اگرچہ اردو کا ایک ادبی ادارہ ہے لیکن اردو کی ہمہ جہتی ترقی کے ساتھ وہ اردو سماج کے مذہبی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتا ہے اور اس کے مختلف زوال پذیری اور ابتذال پر وہ بے لاگ تبصرہ اور تنقید کرتا ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لئے ٹھوس تجویزیں پیش کرتا ہے۔ اس طرح جناب ادریس سنہاروی مرحوم نے ادارہ سہیل کو اردو سماج کی ہمہ جہت فلاح و بہبود کے لئے لگا رکھا تھا۔

بہرکیف ادریس سنہاروی مرحوم نے اردو کے تحفظ و بقا کی تحریک میں پورا حصہ لیا اور اپنے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ماہنامہ سہیل کے ذریعہ اردو کے فروغ و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ اور حکومت سے کبھی بھی مراعات کی بھیک نہیں مانگی۔ اور نہ حکومت کے خوشامد پسند اور چاپلوسی کی سیاست کو پسند کیا۔ وہ اپنی گراں قدر خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آخر میں پھر بارگاہ رب العزت میں دعاگو ہوں کہ مرحوم کو اپنے فضل و رحمت کا سزاوار بنائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین)

سوگوارانِ ادریس

ماہنامہ سہیل کے مدیر و سرپرست عالیجناب ادریس سنسہاروی صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد بڑی تعداد میں عقیدت مندوں اور تعزیت گزاروں کے خطوط ہمیں موصول ہوئے ان میں سے چند خطوط اس نمبر میں شاملِ اشاعت کئے جا رہے ہیں۔ ادارہ سہیل اپنے تمام کرمفرما تعزیت گزاروں کا تہہِ دل سے شکر گزار ہے کہ انہوں نے ہماری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لئے بروقت خطوط لکھنے کی زحمت فرمائی۔ (ادارہ)

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی۔ جموں توی (کشمیر)

قبلہ ادریس صاحب کے انتقال پُر ملال کے بارے میں اطلاع ملی۔ بے حد دکھ ہوا۔ میری اُن کے ساتھ ملاقات تو نہیں تھی لیکن برادرم ڈاکٹر رستوگی نے اُن کا ذکر کئی بار کیا تھا اور انتہائی تعریفی الفاظ میں۔

ان کی زیرِ نگرانی اور آپ کی ادارت میں سہیل جس طرح نکلتا رہا آپ تو آپ کے ساتھ اُس سے ادب کے ساتھ ان کی دلی لگاؤ کی ایک جامع تصویر ہم لوگوں کے سامنے آتی رہی۔ اُن کے جانے سے یقیناً ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ آپ حضرات کی زندگی میں بھی اور ادب میں بالخصوص ادبی صحافت میں۔

انکی یادگار قائم کرنے کا واحد اور عمدہ طریقہ یہ ہے کہ سہیل کو آپ اسی خوبصورتی اور دیدہ زیبی کے ساتھ جاری رکھیں۔

خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

آپ کے غم میں شریک : جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر علی سردار جعفری

سیتا محل، پراگجی پٹیل روڈ۔ بمبئی ۳۶

یہ معلوم ہو کر بے حد افسوس ہوا کہ آپ کے والدِ محترم جناب ادریس سنسہاروی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور آپ کے تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

آپکا : سردار جعفری

ڈاکٹر محمد حسن

صدر شعبۂ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

آپ کے والدِ محترم کے انتقال کی خبر معلوم ہو کر افسوس ہوا۔ اس موقع پر میری طرف سے تعزیت قبول کیجئے۔ صدمہ سخت ہے مگر سوائے صبر کیا چارہ ہے۔

خاکسار : محمد حسن

ہنامہ سہیل گیا

ڈاکٹر سید محمد محسن

دارالامان، بھوجو بگھر۔ پٹنہ

آپ کے والد محترم کی ناگہانی رحلت کی اطلاع ملی۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے اور لوگوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ مشیت ایزدی کے آگے آدمی بے بس ہے۔ بقول غالب ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

آپ کے غم میں شریک۔

مخلص: محمد محسن

سید مظفر حسین برنی (گورنر ہریانہ)

ہریانہ راج بھون۔ چنڈی گڑھ

I am shocked to know about the sad demise of Janab Idris Sunsaharvi who was the very soul of the monthly "Sohail".

Mysterious are the ways of the Allah and we have to bow before his will.

I convey my heart-felt condolence and pray that the departed soul may rest in peace.

Yours Sincerely
S. M. H. Burney

ترجمہ: "اس خبر سے سخت صدمہ پہنچا کہ جناب ادریس سنسہاروی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم ماہنامہ سہیل کے روح رواں تھے۔ مشیت الہی بھی حیرت انگیز ہے مگر ہم سبھوں کو اس کی مرضی پر راضی رہنا ہے

دلی گہرائیوں کے ساتھ اپنی تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔"

مخلص، سید مظفر حسین برنی

کلیم الدین شمس

ڈپٹی اسپیکر، مغربی بنگال اسمبلی۔ کلکتہ

I am very much pained to know that your father expired on 26th August 1984. Really speakin it very much painfull. but there is no way out left and this is the distinct of the human being.

May God bless him and the same time I pray to God for restoring the courage wich you have lost after a demise of your beloved father.

سُہیل گیا

Please convey my c
dolence to the membe
of your family.

Thanking you
Kalimuddin Sha

ترجمہ: مجھے یہ سن کر دکھ ہوا کہ آپ کے والدِ
امجد کا ۲۵ راگست ۱۹۸۴ء کو انتقال ہو گیا
ہے یا اس خبر نے انتہائی صدمہ پہونچایا ہے۔
لیکن موت سے مفر نہیں اور تمام نوعِ بشر کو
اس کا سامنا کرنا ہے۔

خدائے تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ
دے اور آپ لوگوں کو کہ آپ کے سر سے
شفیق باپ کا سایہ اُٹھ گیا ہے کہ صبرِ جمیل
عطا کرے۔

تمام افرادِ خانہ تک میری تعزیت پہونچا
دیجئے۔

مخلص: کلیم الدین شمس

[اخ]تر انصاری

[آ]زاد، جامعہ اُردو روڈ علی گڑھ۔ (یوپی)

[ش]ہیر صاحب سے المناک سانحۂ ارتحال کے بارے
[م]علوم ہوا۔ تعزیت کے رسمی الفاظ بیکار ہیں۔ صرف
[ک]ہوں گا کہ صبر و تحمل سے کام لینے کے علاوہ کوئی چارہ
[ن]ہیں ہے ع آج وہ کل ہماری باری ہے۔

آپ کے مخلصانہ ملاقاتوں کی بنا پر میرے دل میں
[محب]ت اور قدر شناسی کا جو جذبہ آپ کے لئے ہے اس نے

مجھے اطلاع پاتے ہی تڑپا دیا۔ اس کے علاوہ اور کیا
کہوں! ناطقہ سر بہ گریباں ہے ——"

دلگیر و ناشاد: اختر انصاری

شاہ مقبول احمد

۱۶۔ حاجی محمد محسن اسکوائر، کلکتہ ۱۶

بہار اُردو اکیڈمی کا خبرنامہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں
محبِ گرامی جناب ادریس سنساروی کی المناک اور اچانک
رحلت کی خبر سے بہت صدمہ ہوا۔ مرحوم سے دیرینہ مراسم
تھے۔ کلکتہ جب کبھی تشریف لاتے تھے۔ غریب خانہ میں
آتے اور عزت افزائی فرماتے۔

رسالہ سُہیل کے ذریعے مرحوم کی اَدبی خدمات ناقابلِ
فراموش ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں مقامِ اعلیٰ
عطا کرے اور جملہ پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ یہ
مرحوم کی ہمت و استقامت تھی کہ رسالہ "سُہیل" عرصۂ دراز
سے علم و ادب کی گراں بہا خدمت کر رہا ہے۔ مرحوم کی
سعی کا یہ کارنامہ تھا کہ اس کے خاص نمبر جمیل نمبر، پریم چند
نمبر وغیرہ ادبِ اُردو کی تاریخ میں مقامِ خاص حاصل
کر سکے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سوگوار: شاہ مقبول احمد

فضا ابنِ فیضی

مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

حضرت ادریس سنسہاروی کے انتقال کی خبر سن کر
بیحد صدمہ ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو

بحارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

اس سانحہ سے آپ لوگوں پر جو قیامت گذری ہوگی اس کرب و اذیت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ باپ وہ بھی اتنے شفیق اور ذی علم باپ کا سایۂ عاطفت آپ لوگوں کے لئے "سایۂ ابرِ کرم" سے کم نہیں تھا۔ مگر بھائی! موت شاید زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی کو مجالِ گریز نہیں۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ط

مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ پوری زندگی ادب و صحافت کی خدمت میں گزری۔ اُن کی رحلت سے گیا کا ادبستان سونا ہو گیا۔ اب آپ لوگوں کا فرض ہے کہ مرحوم کی زندگی اور شخصیت کی ایک ادبی و صحافتی علامت کے طور پر ماہنامہ "سہیل" کو جاری و باقی رکھیں۔ اور اس نقشِ جمیل کو دھندلا ہونے نہ دیں۔ اس سے ان کے ادبی مشن کی تکمیل بھی ہوگی۔ اور انکی روح کو تسکین بھی ملے گی۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں

غمزدہ : نفسا ابن فیضی

ڈاکٹر قمر رئیس

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی۔ دہلی۔

قبلہ ادریس سنہاروی صاحب کی رحلت کی خبر ملی۔ انکی جدائی کا دکھ تنہا آپ کا دکھ نہیں ہے ہم سب بلکہ وہ لاکھوں انسان جو اس میں شریک ہیں جو انسان سماج کو استحصال سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی ساری زندگی اسی نصب العین کے لئے وقف کر دی تھی اس کے لئے انھوں نے جس مثالی ایثار اور استقلال سے کام کیا ہے وہ ہم سب کے روشن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اور ہم سب ان کی راہ پر چل کر ہی انہیں بہترین خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ آرزو ہے کہ ہمیں یہ توفیق ملے۔

آپ کے غم میں شریک : قمر رئیس

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

ہیرو باڑی گوہاٹی (آسام)

بیٹے جمیل، طول العمر رہو، خوش و خرم رہو۔

بیٹا مجھے بہار اردو اکیڈمی کے خبر نامے سے دل خراش خبر ملی تھی۔ کاش ادریس بھائی کے مرحوم ہونے کے بجائے میں مر جاتا۔ میں نہ جانے کیوں زندہ ہوں۔ ادریس مرحوم دل و دماغ کی خوبیوں سے متصف انسان تھے۔ برادرم سہیل مرحوم کے توسط سے میں غائبانہ طور پر ادریس بھائی سے متعارف ہوا تھا۔ ان کے میرے حق میں لکھے گئے خطوط کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی۔ — تم سب خوش و خرم رہو۔

تمہارا اپنا تارا چرن رستوگی

مظہر امام

ڈائریکٹر دور درشن کیندر سرینگر (کشمیر)

ادریس بھائی ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ توقع نہیں تھی کہ وہ اس قدر جلد اور اچانک ہم کو رخصت ہو جائیں گے۔ ہر چند انکی صحت کی جانب سے تشویش رہنے لگی تھی۔ مجھ سے ۳۲ - ۳۳ سال کے تعلقات تھے۔ انھوں نے ہی مجھے سہیل کے ادارے میں شامل کیا تھا۔ کلکتہ کے دورانِ قیام میں اکثر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور سہیل کے

سلسلے میں کئی اہم فیصلے انہیں دونوں ہوئے تھے۔ ادریس صاحب ان معدودے چند لوگوں میں تھے، جن سے میں نے قرابت اور یگانگت محسوس کی اور اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے میرے ہی جسم کا ایک حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔
آپ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ والد کی شفقت ایک بڑی نعمت ہوتی ہے۔ کس دل سے کہوں کہ صبر کیجئے۔ کیوں کہ صبر پر بھی کسی کو اختیار ہے! اور پھر والد کی دائمی جدائی کوئی معمولی سانحہ تو نہیں! خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر کی توفیق۔

آپ کا اپنا: مظہر امام

ڈاکٹر عنوان چشتی

صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

یہ روح فرسا خبر ملی کہ حضرت ادریس شہبازدی دارِ فانی سے دارِ بقا کو رحلت کر گئے ہیں۔ بتا نہیں سکتا کہ دل پر کیا گزر گئی۔ تقریباً ایک سال قبل میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سر سے شفقت کی چادر اٹھ گئی ہو اور میں یکا و تنہا سلگتی ہوئی دھوپ میں کھڑا ہوں۔ اب آپ بھی اسی نوعیت کے روحانی مرحلے سے گزر رہے ہوں گے؟ حضرتِ ادریس کی شخصیت آپ کے لئے ایک سایہ دار شجر کی سی تھی۔ یہ آپ کا ذاتی نقصان ہے مگر ان کی علمی خدمات نے انہیں اردو دنیا سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اس رشتے سے بہتوں کو صدمہ پہنچا ہے۔ میرا غم دہرا ہے۔ ایک تو ان سے ذاتی مراسم کی بنیاد پر، دوسرے سہیل کے تعلق سے۔ کیوں کیا نہ لکھوں۔ گزشتہ دن ان کا خط موصول ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں اپنے جد اعلیٰ حضرت شکوہ منگلوری کی درگاہ پر ان کے لئے صحت کی دعا کروں۔ کیا خبر تھی کہ وہ اتنی جلدی ہم سے بچھڑنے والے ہیں۔
موصوف بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ بارگاہِ خداوندی میں ان کے لئے دست بدعا ہوں کہ ربّ العالمین انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی دولت عطا کرے۔ آمین۔
جمیل منظر اور گھر کے دیگر افراد کو میری طرف سے تعزیت کر دیجئے۔

سوگوار: عنوان چشتی کان اللہ

اصغر علی انجینیر

ایرن کا گاؤں۔ سکنڈ فلور۔ ۳۰ تقاراستہ۔ سانتا کروز (ایسٹ)
بمبئی ۵۵

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط
آپ کے والدِ محترم کے انتقال سے مجھے ذاتی طور پر سخت صدمہ ہوا۔ آپ کے خاندان سے مجھے ذاتی رشتہ محسوس ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے اور باقی ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

مخلص: اصغر علی انجینیر

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

صدر شعبۂ اردو۔ گیا کالج، گیا

برادرِ عزیز! سلامتیں
کیا بتاؤں کہ تمہارے والدِ ماجد کے انتقال پر ملال سے

دل کس قدر رنجیدہ ہو گیا۔ یہ بزرگ ہستی تھی تو میں بھی اپنے آپ کو اس شہر میں بے سہارا تصور نہیں کرتا تھا۔ افسوس کہ موت چن چن کر ہمارے تمام سہارے ختم کرتی جا رہی ہے۔

اس بے ثبات اور لمحاتی زندگی میں کوئی ایسا نقش پیدا کرنا جو آئندہ نسلوں کے لئے یادگار اور قابلِ عمل رہ سکے کوئی آسان کام نہیں ہوتا، تمہارے والد نے صبر و ضبط مسلسل جدوجہد، خاموش خدمت اور ایثار و عمل کے جو چراغِ روشنِ عمل ہیں وہ بہتوں کے لئے رہنمائی کرتے رہیں گے

خدا انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین

شریکِ غم: رحیم اللہ حسانی

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

آنندہ پلی، پو، رباپنیا رتی، ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

یہ منحوس خبر ملی کہ ادریس صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں تو اللہ کو پیارا ہونا بڑی بات ہے لیکن دنیا والے تو افسوس ہی کریں گے۔ والدین چاہے کتنے ہی بوڑھے کیوں نہ ہوں۔ سر پر اُن کا سایہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ اور اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی انمول سایہ سے محروم ہو جائے ــــــ اور پھر میرا جہاں تک خیال ہے ادریس صاحب کی عمر ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ میرے خیال سے وہ ۶۰ کے رہے ہوں گے۔

بہر حال: موت اٹل ہے۔ اس کا وقت معین ہے اور صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ ہاں اب آپ لوگوں پر زیادہ ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ اُن کے مشن کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ دور دور تک پھیلانا اور زیادہ سے زیادہ مفید بنانا ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن اگر ادریس صاحب نے زندگی بھر جدوجہد کی ہے اس کو سامنے رکھ لیں تو پھر ہمت ہارنے کی وجہ نہیں ـــــ!

دعا کرتا ہوں کہ اُن کی روح کو سکون ملے اور آپ تمام لوگوں کو اُن کی راہ پر آگے بڑھنے کا حوصلہ ـــــ

تم لوگوں کا: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

آسی رام نگری

مغل سرائے (بنارس)

آپ کے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر بیحد رنج ہوا۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

خلوص آگیں، آسی

ڈاکٹر عبد المغنی

صدر انجمن ترقی اردو بہار، شاہ گنج محمد پور۔ پٹنہ ۶/۷۸۰۰۰

جناب ادریس شہسرامی مدیر "سہیل" کی وفات اردو کی ادبی صحافت کے لئے ایک پُر الم واقعہ ہے۔ موصوف نے ایک طویل عرصے تک جو لسانی و ادبی خدمت انجام دی ہے وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔

مجھے توقع ہے کہ مرحوم کے جانشین اُن کی روایات کو زندہ رکھیں گے۔ اور ترقی دیں گے۔

آپ کے غم میں شریک اور مرحوم کے لئے دعا گو

عبد المغنی

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ ۴۰۰۰۰۸

کل بہار اردو اکاڈمی کے خبرنامے سے یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ ادریس صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ ان کے دوسرے اعزا کو بھی میری تعزیت پہونچا دیجیے۔

آپ کے غم میں شریک: عابد رضا بیدار

سالک لکھنوی

سورتین اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۲

خدا تمہیں اور گھر والوں کو صبر عطا کرے۔ بھائی ادریس کیا گئے اپنے ساتھ لے گئے اخلاق، شرافت، وضع داری کا مجسمہ ادریس۔ ہائے میرے بہار کے دوستوں میں کیا کیا ہستیاں تھیں جو اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ایوب ایڈوکیٹ نے منھ چھپا لیا، حضرت جمیل مظہری نے آنکھیں پھیر لیں، پرویز شاہدی پہلے ہی روٹھ گئے، اور اب حضرت ادریس بھی محفل سے رخصت ہوگئے۔

شمع اک اک کرکے پروانوں کو اپنے رو گئی
رفتہ رفتہ بزم پروانوں سے خالی ہوگئی

ادریس! اردو ادب کا مرد مجاہد نے گزشتہ پینتیس (۳۵) برسوں سے چراغ سہیل کے ذریعے اردو راہِ ادب کو روشن رکھنے کی کوشش کی، آج موت کی رہنمائی میں خود راہ میں گم ہوگیا۔ ایسے شریف لوگوں سے موت کو کیا مل جاتا ہے؟ لیکن ایسے شریف لوگ ہی بخوشی موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں تاکہ زندگی میں شرافت کی یاد باقی رہ سکے۔ جانے والا چلا گیا، اپنا کام کرکے گیا، بہت خوب کیا۔ خدا دوسروں کو پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

صبر کی تلقین کیا دوں؟ موت سے کس کو رستگاری ہے، آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ادریس نے سبقت کی، مجھ سے پہلے منزل کو جا لیا۔ میں ہمیشہ کا ناکارہ لمبی زندگی گھسیٹ رہا ہوں۔ کس کو معلوم ہے کب وقت پکار آ جائے!

تم بھائیوں کا یہ فرض ہے کہ اخلاق و رواداری، شرافت و مروت کی جو راہ وہ روشن کر گئے وہ تاریک نہ ہونے پائے۔ یہی ان کے لئے سب سے بڑا خراجِ عقیدت و محبت ہوگا۔

تم سبھوں کے ساتھ شریکِ غم: سالک لکھنوی

شہاب الدین دسنوی

وائس چیرمین، بہار اردو اکاڈمی۔ پٹنہ

آپ کے والد ماجد کی اچانک رحلت کی خبر سے بہت صدمہ ہوا۔ انھوں نے ناساعد حالات کے باوجود رسالہ "سہیل" کی جس طرح خدمت اور اسے پروان چڑھایا، وہ ناقابل فراموش ہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آپکا: شہاب الدین دسنوی

شفیقہ فرحت

۲/۱۸۶ - ودیا وہار۔ بھوپال (ایم پی)

ادریس صاحب کے انتقال کی خبر سے بےحد صدمہ ہوا۔ انکی جدائی ماہنامہ "سہیل" کے لئے ضرب کاری ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی سہیل کے لئے وقف کردی تھی۔ خدا تمہیں صبر کے ساتھ یہ ہمت بھی عطا فرمائے کہ تم سہیل کو اسی آب و تاب اور

سید حامد حسین

۲/۳/۱۰۲- اے، پروفیسر کالونی۔ بھوپال (ایم۔ پی)

ادریس صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ بیحد صدمہ ہوا۔ اُن کا آخری خط مجھے اپریل میں ملا تھا۔ اس وقت وہ سجاد ظہیر نمبر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس کے بعد نہ تو ان کا کوئی خط موصول ہو سکا اور نہ ہی میں انہیں لکھ سکا۔ نہ ہی ان کی علالت وغیرہ کا علم ہو سکا۔ شروع اپریل میں میں جشنِ ظرافت میں شرکت کی غرض سے پٹنہ گیا تھا۔ پہلے خیال تھا کہ گیا بھی نکل جاؤں گا۔ بس ادریس صاحب کی کشش تھی۔ لیکن وہی زمانہ یہاں امتحان کا تھا چھٹی زیادہ نہ مل سکی اور مجھے پٹنہ سے سیدھے بھوپال لوٹ آنا پڑا۔ اب یہ احساس محرومی اور بڑھ گیا۔ کاش میں اس وقت کسی نہ کسی طرح گیا کا چکّر لگا ہی آتا۔

صبر کیجیے اور اس سانحے کو رضائے خداوندی سمجھ کر برداشت کیجیے۔ کیونکہ خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا بجائے خود عبادت کے مثل ہے۔

عرفا کا مقولہ ہے "بزرگوں کی موت نے ہمیں بزرگ بنا دیا۔" ادریس صاحب کی ذمہ داریاں اب آپ کو سنبھالنی ہیں۔ خدا آپ کو اس کی ہمت اور توفیق دے۔ اب ہم آپ میں ادریس صاحب کی نیکیوں اور اُن کے خلوص کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری یہ توقعات غلط نہیں ہیں۔

نیاز کیش: سید حامد حسین

قیصر عثمانی

گوکل سنے کارپوریشن، مہالکشمی۔ بمبئی ۱۱

ابھی ابھی ادریس سلمہٗ کے حادثۂ جانکاہ کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کن الفاظ میں اپنے درد و غم کا اظہار کروں۔ عزیزی ادریس زندگی بھر مجھ سے چھوٹے بھائی کی طرح پیش آتے رہے اور وہ میرے نزدیک عنفوانِ شباب سے میرے قریبی عزیزوں میں سے ایک تھے۔ افسوس کہ ظالم موت نے اُن کو ہم سے جدا کر دیا۔ اللہ مرحوم کو جنت میں جگہ دے۔ اور آپ سب لوگوں کو صبر عطا کرے۔ آمین ——— میں کئی ہفتوں سے فکرمند تھا اور ایک خط خیریت دریافت کرنے کے لئے آج ہی پوسٹ کارڈ خرید کر لایا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خط کا مضمون بدل جائیگا۔

آپ لوگ صبر سے کام لیں اور جو کام وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں انہیں ہمیشہ انجام دیتے رہیں۔ حسن و خوبی کے ساتھ۔

شریکِ غم: قیصر عثمانی

منظر شہاب

پرنسپل کریم سیٹی کالج۔ جمشید پور

... میرے دیرینہ رفیق کی موت کی خبر ملی۔ جناب ادریس شہسوار دکنی سے میرے تعلقات تقریباً ۳۲ سال سے تھے۔ وہ نہ صرف اخلاق اور خلوص کا مجسمہ تھے بلکہ ایک بے باک، بیخوف اور بیحد ایمان دار ترقی پسند صحافی تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک اور

اُردو ادب کی ترویج و اشاعت میں بے مثال خدمات انجام دیں۔ ان کو دوست نوازی اور وسعت کش نے ان کو پریشان رکھا۔ لیکن پاس وضعداری یہ تھا کہ کبھی چہرے پر شکن نہیں آنے دیا۔ اُن کی اچانک موت نے مجھے ذاتی طور پر بہت دکھ پہنچایا ہے۔ ان کے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اور پسماندگان کے حق میں صبر کا طالب ہوں۔

میری خواہش ہے کہ سُہیل کا ایک نمبر ان کی شخصیت اور صحافت نگاری کے لئے وقف کیجئے۔ میں تعاون کے لئے ہمہ دم تیار ہوں۔

ساغر کی بوند بوند ترستی ہے آپ کو
اے آفتاب تیری تمازت کو کیا ہوا

مظفر شہاب

حسن نعیم

۲۹-سی، شالیمار۔ نیوپگ نگر۔ بمبئی ۶۸

دو تین روز قبل "سُہیل" کا اگست کا شمارہ ملا جس سے یہ اذیت ناک خبر ملی کہ برادرم ادریس صاحب کا ۲۵/اگست ۱۹۹۴ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط

میرے پاس پٹنے کا کوئی روز نامہ آتا ہے اور نہ گیا کا کوئی ہفتہ وار۔ جس سے یہ خبر پہلے ملتی۔ بہرحال یہ خبر دیر ہی سہی آخر سُہیل ہی کے ذریعے ملی۔ مجھے اس حادثے سے یوں دکھ ہوا کہ ایک زمانے سے ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ خدا آپ کو عزیزم مسعود منظر کو اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (ایک دکھ یہ بھی ہے کہ سبھی ساتھی اور احباب بچھڑتے جا رہے ہیں جب میری باری ہوگی تو کون غمگین ہوگا۔)

آپ ادریس بھائی کی یاد اسی طور پر منا سکیں گے۔ اگر سہیل کو ترقی پسند رجحانات کا ترجمان رکھتے ہوئے بھی اس کو ذرا Moderanise کیجئے یعنی کتابت، طباعت کو بہتر اور اس کے مواد میں کچھ جدت سے کام لیجئے گا جس طرح شاعر کو اعجاز صدیقی مرحوم کے صاحبزادوں نے بلا اس کے ادبی معیار کو بدلے ہوئے شکل و صورت سے زندہ اور متحرک بنا دیا اسی طرح سہیل کو آپ بنا دیجئے یہ یاد رکھئے کہ ادریس بھائی کا عہد دوسرا تھا اور آپ لوگوں کا عہد دوسرا ہے۔ وہی قومیں وہی قبیلے، وہی خاندان اور صرف وہی افراد زندہ رہتے ہیں جو نئے حالات میں بھی اپنے آپ کو ترو تازہ رکھ سکیں۔

خاکسار، حسن نعیم

کرشن سنگھ

پنجابی لین۔ رام داس بھوڑی۔ جمشید پور

"سُہیل" اگست کے شمارہ کا شکریہ! سرورق پر جناب ادریس سنسہاروی کی تصویر دیکھی۔ ان کے انتقال فرمانے کی اطلاع اخبارات کے ذریعے مل چکی تھی مرحوم نے اُردو ادب کی جو خدمت سُہیل کے ذریعے کی اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ خاص کر بہار کی اُردو تاریخ میں انکا نام روشن رہے گا۔

کرشن سنگھ

راج نرائن راز

ایڈیٹر "آج کل" پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی

تازہ "سہیل" ملا۔ آپ کے والد محترم جناب ادریس
سنبھاروی صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر
دلی افسوس ہوا۔ آپ عزیزوں کے لئے واقعی آزمائش
کی گھڑی ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو
جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور آپ عزیزوں کو صبر عطا
کرے۔ آمین

شریک غم: راج نرائن راز

نشاط الایمان

۱۳۔ اچاریہ جگدیش بوس روڈ۔ کلکتہ ۱۷

آہ! ادریس بھائی بھی اب نہ رہے۔ چند دن پہلے
سہیل کا تازہ شمارہ (جون جولائی ۸۰ء) موصول
ہوا تھا۔ اس کی مجلس مشاورت میں ادریس بھائی
اپنی روشن زندگی کا ثبوت دے رہے تھے۔ اور ان کی
یہ موجودگی ہم جیسوں کے لئے بہت تھی۔ لیکن اب ——!
موت تو برحق ہے اور سب کو ایک دن اصلی دنیا کی طرف
جانا ہے۔ لیکن بعض موتیں اپنے پیچھے بڑا دردناک
اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ میں ادریس بھائی کی جدائی پر ایسا
ہی محسوس کر رہا ہوں۔ خدا جانے آپ لوگوں کا کیا
حال ہوگا!

میں دوسروں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا مگر
میرے لئے ادریس بھائی سراپا محبت تھے۔ وہ جب
بھی کلکتہ آتے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتے تھے۔ ان کی
باتیں اور مسکراہٹیں بڑی دل نشیں ہوتی تھیں ——

اب یہ سب یادوں کی مالا میں پروئی رہیں گی!
اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر اپنی رحمت کے
پھول برساتا رہے۔

شریک غم: نشاط الایمان

شیبا کا

مشتاق احمد

پارک ویو۔ کدمنو لوکھر۔ پٹنہ ۴

برادرم انیس صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر
ملی۔ اللہ پاک ان کی روح کو سکون بخشے۔ اور انہیں
جنت الفردوس میں جگہ دے۔ بھائی ادریس سے
ہمارے تعلقات کم و بیش چالیس سال سے یکساں طور
پر خوشگوار رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرحوم ایک پرخلوص
دوست اور ہمدرد ساتھی تھے۔

فی الوقت ذہنی اذیت اور روحانی کوفت میں
اس قدر زیادہ مبتلا ہوں کہ میری کچھ میں کچھ بھی نہیں
آرہا ہے کہ اس حادثہ جانکاہ کے متعلق تم سے کیا کہوں
اور تمہیں صبر کی تلقین کن الفاظ میں کروں۔

یہ لکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ اردو سے
بھائی ادریس کو والہانہ عشق تھا۔ صلہ اور ستائش سے
بے نیاز ہو کر وہ شروع ہی سے ہر محاذ پر ایک جانباز
سپاہی کی طرح اردو کے جائز حق کے لئے دامے درمے
قدمے سخنے کوشاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشوار گزار
گھاٹیوں سے گزر کر اور ہر طرح کی پریشانیوں کو جھیل کر سہیل
کو تابندہ اور پائندہ رکھا۔ اب اس کی چمک دمک کو برقرار
رکھنا اور اس چراغ کو روشن رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔
اللہ تعالیٰ تمہیں حوصلہ عطا [illegible] ۲

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

اے بھون۔ کوٹلہ مارگ۔ نئی دہلی

آپ کے والدِ محترم کے اچانک انتقال کی خبر سُن کر بڑا صدمہ ہوا۔ میں جب گیا آیا تھا اُن سے ملا بھی تھا۔ بڑی جاذب شخصیت تھی۔ اُن سے باتیں کرتے ہوئے گھنٹوں بھی بیت جائے تو لگتا ہے ابھی اور باتیں کرنی ہیں۔ ان کے خلوص اور اُن کی رحمدلی سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ — سُہیل کے تو وہ روحِ رواں تھے۔

مجھے اُمید ہے کہ تم اور مرحوم کے سب اہل و عیال صبر سے کام لیں گے۔ میری طرف سے پُرخلوص تعزیت قبول کریں۔

تمہارا اپنا: راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر امانت

۲۰۶۸۔ جان محمد اسٹریٹ۔ پونیہ ما

ماہنامہ سُہیل سے قبلہ ادریس صاحب کے انتقال پر ملال کا پتہ چلا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اور متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

شریکِ غم: امانت

میجر علی حماد عباسی

۲۲۶۔ باز بہادر۔ اعظم گڑھ (یوپی)

برادرِ محترم جناب ادریس سنسہاروی کے سانحۂ ارتحال کی خبر پاکر دل کو سخت تکلیف پہنچی۔

مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے اور ہمیشہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ اور میں بھی اُنہیں اپنے محترم بزرگوں میں سے ایک شمار کرتا تھا۔ مرحوم کے ساتھ رواداری، شرافت اور شفقت کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ میں دست بدعا ہوں کہ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ مزید یہ کہ آپ ان کی روایات کو برقرار رکھیں اور زبان و ادب کی خدمت ان ہی کے نقشِ قدم پر چل کر سرانجام دیں۔ اُردو والوں کے دلوں میں اُنکی یاد تازہ رکھیں۔

آپ کا غم بہت بڑا ہے۔ آپ کے درد کا درماں الفاظ سے نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ایک عزیز کی حیثیت سے آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں

دعاگو: علی حماد عباسی

ڈاکٹر حسین الحق

شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا (گیا)

میں سہسرام سے لوٹا تو حادثے کی خبر ملی۔ اور اچانک حادثات پر جو کیفیت کسی پر بھی طاری ہو سکتی ہے وہ مجھ پر بھی ہوئی۔ — مگر یہ تو عام کیفیت کی بات ہوئی۔

میں نے تو جس دن سے یہ خبر سنی ہے مجھے بار بار یہی احساس کچوکے لگا رہا ہے کہ ایک اور ایسا شخص اس جہان سے گزر گیا جس کو یاد کر کے یہ اطمینان ہوتا تھا کہ گیا میں بھی ابھی بھلا چاہنے

والے موجود ہیں۔

شفیق و کریم ادریس صاحب مجھ سے عمر میں اتنے ہی بڑے تھے کہ اگر میں آپ کے خاندان میں جنم لیتا تو ان کا بیٹا یا بھتیجہ ہوتا مگر اس کے باوجود وہ مجھ جیسے چھوٹے آدمی سے جس طرح برابری کی سطح پر ملتے تھے اس "دور نا پرساں" میں کتنے لوگوں کو اس کا جگر ہے۔

وہ زندگی بھر ترقی پسند رہے اور ہمیشہ ترقی پسند قوتوں، اداروں اور اشخاص سے ان کا رابطہ رہا۔ مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت میں مشرقی اقدار کا جو رکھ رکھاؤ تھا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر ہی اندر وہ ماضی اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود تھا جو کبھی نہیں مرتا۔

یہ ذاتی تجزیہ ہے کہ ایسی دراصل ضد کرنے والوں کا ختم ہو جانا ہے۔ اب آپ حضرات کو ضد کرنا نہیں ہے ضد بننا ہے۔ اللہ آپ کو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت عطا کرے۔

اور انہیں جنت نعیم میں جگہ عنایت فرمائے اور ان کی قبر کو اپنی رحمتوں کے نور سے بھر دے۔ آمین

بھائی! ابن سہیل "آپ ہی لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ کوشش کیجیے کہ ان کی اولاد معنوی (سہیل) اور اولاد نسلی یعنی (آپ لوگ) دونوں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ترقی پسند قوتوں اور اشخاص کے دوست رہیں۔ اور سرمایہ دارانہ REACTIONARY اور صحافت کو ذلیل کرنے والے اشخاص سے لڑتے رہیں کہ خود ادریس صاحب کا بھی یہی مشن تھا۔

میں آپ حضرات سے کیا عرض کروں سوا اس کے کہ جس ایک چھوٹا لفظ .... (مگر ایسا لفظ جس کا آج تک دنیا میں کوئی بدل نہ پیدا ہو سکا) پیش کروں .... "صبر ....."

بے اختیاری اور بے تابی ہماری تقدیر اور عطا اور صبر ہماری مجبوری۔

اللہ آپ کو صبر دے۔ گو کہ میں خود کئی مہینوں سے صبر کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ نہیں آ رہا ہے۔

غمزدہ: حسین الحق

شبیر رسول

۴۔ اکبر مارکیٹ، دودھ پور، علی گڑھ (یوپی)

آپ کے والد صاحب کے انتقال پر ملال کی انتہائی دل سوز خبر ملی۔ سخت افسوس ہوا۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا حادثہ ہے۔ خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

خدا بڑا کارساز ہے۔ اپنے نظام کو وہ سمجھ سکتا ہے۔ صبر کے علاوہ اس بے بسی کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ "ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت خود مختاری کی"۔ دعا ہے کہ وہ گوشۂ رحمت کے مکیں ہوں۔

آپ کے غم میں برابر کا شریک آپ کا:

شبیر رسول

احمد یوسف

کرشین ایمپوریم، صدر گلی، پٹنہ

معلوم ہوا کہ ادریس صاحب اس دارِ فانی

سے کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط
بہت خوب آدمی تھے۔ خدا انہیں غریقِ رحمت
کرے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے
آمین

شریکِ غم: احمد یوسف

بے تاب صدیقی

اردو بہار ریاستی انجمن ترقی اردو۔ پٹنہ

برادرم ادریس صاحب کی وفات کی خبر کل شام
کو مجھے ملی۔ میری کیا کیفیت ہے اور دل پر جو گزری
ہے اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں لیکن یہ وہ حادثہ
ہے کہ جس کے سامنے چارہ ہی کیا ہے۔
بھائی ادریس صاحب مرحوم جس موذی مرض
میں مبتلا تھے اس کا نتیجہ معلوم تھا مگر اتنی جلد وہ ہم
سے داغِ مفارقت دے جائیں گے قطعی توقع نہ تھی۔
آپ لوگوں کا صدمہ اور غم فطری ہے لیکن صبر کے
سوائے چارۂ کار ہی کیا ہے۔ خدا آپ لوگوں
کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو اپنے جوارِ
رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین
اس عظیم صدمہ اور غم میں مجھے اپنا شریک
سمجھیں۔ پچھلی مرتبہ جب میں آپ کے مکان پر پہونچا
تھا تو انھیں بیحد مضمحل پایا تھا اسی وقت سے
یہ کھٹکا لگا ہوا تھا۔ ویسے انجمن کے مستقبل کے
بارے میں بہت سی باتیں ہوئی تھیں لیکن اے بسا
آرزو کہ خاک شدہ۔
عزیزم جمیل منظر کو بھی دعا اور سلام مسنون
پہونچا دیں۔ اور میری طرف سے انہیں بھی یقین دلا دیں
کہ اس صدمے میں مجھے وہ برابر کا شریک سمجھیں۔
دعا گو: بیتاب صدیقی

مظفر حنفی

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

محترم ادریس سنہاروی صاحب میرے دیرینہ
کرمفرما تھے۔ اور انکی مفارقت میرے لئے ذاتی صدمہ
کی حیثیت رکھتی ہے۔ خدا انھیں جوارِ رحمت میں جگہ
دے اور آپ لوگوں کو اس صدمے کو جھیلنے کی قوت
عطا فرمائے آمین۔ مرحوم کی جاری کردہ اردو تحریک
کو اور آگے بڑھانے کی کوشش کیجئے۔ اور مجھے اپنے
غم میں برابر کا شریک جانئے۔
سوگوار مظفر حنفی

احمد عظیم آبادی (جمشید پور)

بے وقت کی دخترِ جانکاہ کی خبر سے دل پاش
پاش ہو گیا۔ خط پڑھنے کے بعد مجھے دیر تک خاموش
دیکھ کر متعلقین میرے نزدیک جمع ہو گئے۔ بالخصوص
اہلیہ دیر تک سوچ میں ڈوبی رہیں۔
ہر برسات میں کم از کم دو ہفتوں کے لئے مرحوم
کی تشریف آوری اور گھر کی ہنگامی رونق کی یادیں
دیر تک دل و دماغ کو پریشان کرتی رہیں۔ اللہ
مرحوم پہ تا ابد اپنی رحمت نازل کرتا رہے۔
عزیزم جیسے کام لو اور اُن کے ادبی اور سیاسی
مشن کو بہر نوع آگے بڑھاتے رہو۔

علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی۔ الٰہ آباد (یوپی)

آپ کے والد کے وصال کی خبر ملی۔ افسوس ہوا۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ اور آپ حضرات کو صبر عطا کرے۔ ہم سب لوگ آپ کے غم میں شریک ہیں۔

شریکِ غم: علی احمد فاطمی

بدیع الزّماں خاور

۶۳۴۹، بیئر مارکیٹ ڈاکخانہ دیولی۔ ۴۱۵۷۱۲
ضلع رتناگیری (ایم۔ ایس)

آج ۲۲ ستمبر کا تازہ "ہماری زبان" دیکھا تو یہ معلوم کر کے بیحد صدمہ ہوا کہ محترم ادریس صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

یہ صرف آپ ہی لوگوں کا نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کا ذاتی غم ہے۔ اور اردو صحافت کا ایک ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن نہیں۔

خداوند کریم مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

آمین   سوگوار و شریکِ غم: بدیع الزّماں خاور

بلراج حیرت

۲۔۲۹۴ ب، ساؤتھ موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

آج ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب سے یہ جان کر سخت حیرت اور افسوس ہوا کہ آپ کے والد صاحب رحلت فرما گئے۔ خدا ان کی روح کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی طاقت دے۔ مرحوم سے نیاز حاصل نہ تھا۔ یہ میری بدقسمتی ہے لیکن رستوگی صاحب نے غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ اور آپ سے بھی ایک تعلقِ خاطر ہے خواہ کتنا ہی سہی۔ اس لئے یہ سانحہ میرے لئے بھی معمولی نہیں اور آج کل تو میں ڈپریشن کی گرفت میں ہوں۔ اس لئے اور بھی صدمہ ہوا کیا کریں موت کے سامنے کسی کا بس نہیں۔

آپ کا: بلراج حیرت

ڈاکٹر روحی قاضی

۲۹ لنٹن اسٹریٹ، کلکتہ ۱۴

اس ماہ کا "سہیل" بجلی بن کر گرا۔ الفاظ کہاں سے لاؤں کہ اپنے دکھ کا اظہار کروں۔ تم لوگوں نے ہی نہیں میں نے بھی ایک شفیق ہستی کو کھو دیا ہے جس کا مداوا ممکن نہیں۔

تمہارے غم میں برابر کی شریک: روحی

ستیش بترا

سیکٹر ۵۲۰/۲۰-اے، ۱۶ فریدآباد (ہریانہ)

پچھلے ہفتہ ادریس بھائی کی رحلت کی خبر پڑھ کر از حد افسوس ہوا۔ جب میں گوہاٹی میں تھا تو ڈاکٹر تارا چرن رستوگی سے اکثر ان کے بارے میں ذکر ہوتا تھا۔

میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو اس سانحۂ عظیم کے برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ سہیل کا سفر جاری رہے گا۔ اور آپ اسے خوب سے خوب تر کی طرف لے جائیں گے۔

سوگوار: ستیش بترا

سید اختر الاسلام

ایڈیٹر ہفت وار "میرٹھ میلا" مہ اشاعت ناظم۔ میرٹھ (یوپی)

ماہنامہ "سہیل" کے روحِ رواں جناب ادریس سنبھاروی کے حادثۂ ارتحال کی روح فرسا خبر پڑھی۔ موت ہر انسان کا مقدر ہے۔ مگر قافلہ میں ساتھ چلنے والے کے بچھڑنے کا غم ہوتا ہے۔ صبر و ضبط کے ساتھ اب تو ہمارا اور آپ کا یہی کام رہ گیا ہے کہ خلد آشیاں کی مغفرت کی دعا کریں۔ اپنے غم میں مجھے بھی شریک سمجھیں۔

مخلص: اختر الاسلام

ڈاکٹر احمر لاری

شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی۔ گورکھپور (یوپی)

آپ کے والدِ محترم جناب ادریس سنبھاروی کی وفات کی خبر سن کر بیحد صدمہ ہوا۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے کرم بے پایاں سے نوازے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اس غم میں مجھے بھی اپنا شریک سمجھیں۔

خلوص کیش: احمر لاری

مناظر عاشق ہرگانوی

شعبۂ اردو، مارواڑی کالج۔ بھاگلپور

ابھی ابھی معلوم ہوا کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر کی توفیق بخشے۔ آمین!

ابھی پچھلے دنوں جب میں گیا آیا تھا تو آپ کے یہاں آپ کے والد صاحب سے ملنے گیا تھا۔ کافی دیر تک ادبی باتیں ہوتی رہیں۔ "کہسار" کی تعریف کرتے رہے تھے اور مجھے سردار جعفری نمبر کے لئے لکھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ صحت کے لحاظ سے وہ پچھلی ملاقات سے بہتر نظر آ رہے تھے۔ کیا پتہ تھا کہ اجل کے فرشتے اپنے پر پھیلائے انہیں لیجانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

بیکرِ اخلاق و رعنائی صاحبِ قلبِ رقیق
پاک صورت، پاک سیرت، خوش عقیدہ خوش نگاہ
خندہ روئی سے گلے ملنا وہ ان کا یاد ہے
ان کے سینے میں نہاں تھا سوزِ الفت بے پناہ
نسلِ نو کی گمرہی پر مضطرب رہتے تھے وہ
دل نہ وہ رکھتا تھا انکو قوم کا حالِ تباہ
اہلِ صدق و معرفت کے تھے ہمیشہ جاں نثار
کاذبوں سے دہر یوں سے کر نہ سکتے تھے نباہ
آدمی سوئے عدم جاتا ہے پھر آتا نہیں
کوئی قاصد ہے نہ اسکا نے کوئی اسکا گواہ
ہے اسیرِ مرگ اس دنیا کا اک اک ذی حیات
کیا فقیرِ رہ نشیں کیا خسرو خاقان جاہ
جھونپڑی ہو یا محل، اس درد سے خالی نہیں
موت سے بچ کر نہ ہے کوئی گدا نے کوئی شاہ
اعتنا زکہتر و بہتر یہاں ممکن نہیں
اس کے پنجے میں ہے مفلس اسکی زد پہ کج کلاہ
ان حقائق سے سہارا دے رہا ہوں دل کو میں
قالبِ قرطاس کو دیدوں تو اسکے اشک و آہ

آہ! رخصت ہو گئے وہ حضرت ادریس بھی
وہ غلام مصطفیٰ وہ سائل باب الٰہ
اب تھے منزل کے وہ لیکن تھے سبھی کے ہی شفیق
کون ہے جس پر نہ تھی ان کی محبت کی نگاہ

آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔
خاکسار: مناظر عاشق ہرگانوی

ظہیر غازی پوری

بی۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ بی۔ ڈمکا

یہ خبر انتہائی روح فرسا ثابت ہوئی کہ برادر محترم ادریس سنبھاروی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انکی رحلت کی خبر اس طرح اچانک ملے گی۔ اس سے قبل کوئی ایسی اطلاع بھی نہیں ملی تھی جس سے علم ہوتا کہ وہ بیمار تھے یا وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ انکا اچانک دارِ فانی سے کوچ کر جانا میرے لئے حیرتناک ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

غمگسار: ظہیر غازی پوری

یوسف جمال

راج کھانگ (پدما لار طیبہ)

کل بمبئی سے پچیس روزہ قیام کے بعد واپسی ہوئی۔ اور سہیل کے توسط سے یہ المناک خبر پڑھنے کو ملی کہ ادریس صاحب اب ہم میں نہیں رہے، تو روحانی صدمہ ہوا۔

والدین کی مفارقت کا غم کیا ہوتا ہے اس کا مجھے بخوبی تجربہ ہو چکا ہے اس لئے آپ کے غم کا مجھے شدید احساس ہے۔

بھائی دنیا اسی کا نام ہے۔ اس سے مفر ناممکن ہے۔ مصلحتِ ایزدی کے آگے سرِ تسلیم خم ہے کے مصداق صبر و ضبط سے کام لیں گے، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

امید ہے آپ صبر سے کام لیں گے اور لواحقین کو اس کی ترغیب دیں گے۔

شریکِ غم: یوسف جمال

رئیس مرزا

۱۹۔ اے، نظام الدین (ایسٹ) نئی دہلی ۱۳

آپ کے والدِ محترم کے انتقال کی خبر یقیناً تکلیف دہ ہے مگر یہ ایسا مقام ہے جہاں بڑے بڑے سائنسداں بھی مجبور ہیں۔

رئیس مرزا

حسن نجمی

نزدیک دربار۔ دہلی ۳۲

ادریس بھائی کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر انتہائی صدمہ ہوا۔ مرحوم کو خط لکھنے کی سوچ رہا تھا کہ اس سانحۂ غم کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ممکن ہے ادریس بھائی کی آخری تحریر دیکھنے کو مل جاتی لیکن قضا و قدر کے ہاتھوں ایسا نہیں ہو سکا ایک ماہ سے زائد تقریباً دو ماہ ہو گئے (جمیل سلما)

یہاں لے گئے۔ تمہید تھی کہ رہ گیا پہنچ کر خیریت
تار بھیجیں گے۔ لیکن حالات نے اجازت نہیں دی
ہوگی۔ سلسلہ کے خط کے انتظار میں میں بھی کوئی خط
نہیں لکھا اور ادریس بھائی سے تحریری ملاقات
سے محروم رہ گیا۔
خدا انہیں غریق رحمت کرے اور آپ تمام
متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
شریک غم: حسن نجمی

نسیم شہنوی
۱۰۲-بی ٹی آئی کیمپس سیہور (ایم پی)

کل سہیل اگست کا شمارہ ملا۔ شمارہ کے
سرورق کو دیکھتے ہی دل و ذہن پر جو کیفیت
طاری ہوئی قلم اسے لکھ نہیں سکتا ہے۔ اس سانحہ
سے بڑا رنج ہوا ہے۔ رب العزت سے دعا کرتا
ہوں کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا
فرمائے۔ ساتھ ہی آپ لوگوں کو صبر کرنے کی قوت
بخشے۔ کیونکہ ہم لوگوں کو اب صبر کے علاوہ کوئی چارہ
نہیں ہے۔ مرحوم نے سہیل کو ایسی تحریک دی
ہے جو ہمیشہ انکی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ میں
اور ہمارے گھر کے تمام افراد آپ کے غم میں برابر
شریک ہیں۔
نسیم

رونق شہری
گولگھر۔ جھریا۔ دھنباد

آپ کے والد محترم کے اچانک ارتحال کی خبر پاکر
دل بہت رنجور ہوا۔ خدا انہیں جنت الفردوس عطا
فرمائے۔ مزید یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ آپ کو رنج کی یہ گھڑی
برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
آپ کا: رونق شہری

شام بارک پوری
پکچر پیلیس، کھلنا، بنگلہ دیش

جناب ادریس سنبہاروی کی رحلت کا سن کر
غم سے معمور ہوگیا۔ ان سے آخری ملاقات کا منظر نظروں
کے سامنے پھرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت
میں جگہ دے اور آپ دونوں بھائیوں کو صبر جمیل عطا
فرمائے۔ میں آپکے غم میں برابر کا شریک ہوں۔
"سہیل" ادریس صاحب کی زندگی میں جس باقاعدگی
سے نکلتا تھا امید کہ آئندہ بھی اسی طرح نکلتا رہیگا۔
شام بارک پوری

رئیس الدین رئیس
۱۰/۱۱۲۵-دہلی گیٹ- علیگڑھ (یوپی)

ابھی ابھی خبیر صاحب سے معلوم ہوا کہ والد
محترم اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ بیحد افسوس
ہوا۔ خداوند کریم مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جملہ
پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین
میں آپ کے اس غم میں برابر کا شریک ہوں بقول
غالب: اظہار افسوس، تلقین صبر اور دعائے
مغفرت کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ بہرحال انتہائی
صبر کے ساتھ دعائے مغفرت ہی ہمارا فرض ہے کہ

اہنامہ سہیل، گیا

اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو جنت الفردوس میں گوشہ خاص عطا فرمائے۔ آمین

میری طرف سے تمام پسماندگان کو آداب کہیے۔ اللہ ہم سبھوں کو صبر عطا کرے۔ شہپر رسول صاحب کو بھی بہت افسوس ہے۔

مخلص: رئیس الدین رئیس

طیّب اسلام پوری

رونق منزل۔ دوبراج دگھی۔ بردوان (مغربی بنگال)

ادریس بھائی کے انتقال پُر ملال کی خبر سے ہم پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ اور گھر ماتم کدہ بن گیا۔ کچھ میں نہیں آتا کہ تمہیں تسلی کس طرح دوں۔ دعا ہے غفور الرحیم اپنے کرم سے تمہیں صبر جمیل کی طاقت اور مرحوم کو جنت عدن عنایت فرمائے۔

سوگوار: طیب اسلامپوری

منصور اعجاز

الوت بلی، دمھار اشٹر

محترم محبی منظر صاحب تسلیم

ہمارا اُردو اکادمی کا جریدۂ "خبرنامہ" (اناپُرنا) جناب ادریس سنبھلدی کے انتقال کی خبر پڑھی۔ پھر الوت محل میں ماہنامہ سہیل بھی مل گیا۔ پروردگار مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ تمام لوگوں کو صبر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

سہیل کے قارئین کے ساتھ میں بھی آپکے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ پروردگار آپ کو حوصلہ ہمت دے اور ماہنامہ سہیل کو ترقی۔

سوگوار: منصور اعجاز

رحمان شاہی

عالم گنج گھیرا گلزار باغ۔ پٹنہ

والد بزرگوار کے انتقال پر ملال کا پڑھ کر شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ دو مہینے قبل میں آپ کے گھر گیا تھا اور محترم بزرگ سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اس وقت میں اپنے بچّے کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ اس کا ذکر میں نے اُن سے کیا بھی تھا انھوں نے ڈاکٹر کے علاوہ ایک مولانا سے تعویز بنا کر بچّے کے گلے میں ڈالنے کا مشورہ دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک مولانا سے ملاقات بھی کروا دی تھی۔ میں نے ان کے مشورے پر فوراً عمل بھی کیا تھا اور تعویذ بنوا کر بچّے کے گلے میں ڈال بھی دی تھی۔ اور اللہ نے بچّے کو صحت یاب بھی کیا۔ ـــ لیکن اب وہ ہمارے بیچ نہ رہے۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ لیکن جس خلوص اور توجہ سے انھوں نے میرے بچّے کی بیماری کی تفصیل معلوم کی تھی اور مشورہ بھی دیا تھا اُسے میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔

میں آپ اور گھر کے تمام لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ خدا انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو بے انتہا صبر کی قوت عطا کرے۔ آمین

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور تحریر کریں۔

سوگوار: رحمان شاہی

عظیم الرحمٰن

سبزی باغ۔ پٹنہ ۴

اخبار سے سانحہ کی خبر ملی۔ خدا آپ کو اور کل لواحقین کو صبر کی قوت عطا فرمائے (آمین)

غم میں شریک : عظیم الرحمٰن

شکیل صدیقی (لکھنؤ)

ادریس صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر نے ہم سب کو رنجیدہ کر دیا۔ وہ ادب کے خاموش خادم تھے۔ "سہیل" کو زندہ رکھ کے اور اس کی ترقی و توسیع کر کے انھوں نے واقعی ادب کی زبان کی اور سب سے زیادہ ترقی پسند خیالات کی بیش قیمت خدمت کی تھی۔ انہیں کھو کر ہم نے اردو کا ایک سپاہی کھو دیا۔

میں انھیں اپنا والہانہ خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

سوگوار : شکیل صدیقی

روشن لال

اے ۱۱۰/۴۷ ٹوی رامپورہ۔ پٹنہ ۴۔

آج کی ڈاک سے موصول "بودھ دھرتی" میں آپ کے والد صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ خدا آپ صاحبان کو اس عظیم صدمہ کے لئے قوتِ برداشت دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ بخشے۔ آمین

شریکِ غم : روشن لال

ظفیر عالم فاخری

دھتکی ڈیہہ۔ جمشید پور

رات میں ہٹ کر گیا وہی حسبِ معمول عبد الحفیظ صاحب سے ملنے گیا تو فوراً انہوں نے تمہارے والد کے حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی۔ ایک بجلی تھی جو گری اور سکونِ قلب خاکستر ہو گیا۔ تھوڑی دیر سکوت کا عالم طاری رہا۔ ماضی کی طرف دھیان چلا گیا جب کہ آج چار سال پہلے میں حکیم سعد اللہ صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا تھا اور گفتگو ہو رہی تھی۔ خیال ہوا کہ اب اٹھوں اور ادریس سے ملاقات کر لوں کہ اچانک پیچھے سے وہ آ کر عالم بھائی کہہ کر لپٹ گئے تھے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب ہم علاحدہ ہونے لگے تو میں نے کہا کہ اب آئندہ ملاقات ہو گی۔ اس پر برجستہ انہوں نے کہا کہ اس وقت تو میں اللہ تعالیٰ کے یہاں رہونگا۔ اور پھر اپنے مرض کی حالت بیان کی۔ کیا جانتا تھا کہ پھر واقعی ملاقات نہ ہو گی۔ کتنے مخلص تھے وہ۔ کبھی بھی انہوں نے مجھ کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ میرے اپنے چھوٹے بھائی نہیں ہیں۔ اب ان کی باتوں کو ان کی یاد کروں۔ صبر اور ان کی مغفرت کی دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ انسان کا مشیتِ ایزدی کے آگے ختم ہے۔ امید ہے تم لوگ جوانمردی کے ساتھ اس غم کا مقابلہ کرو گے۔ اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس آگے دیکھو۔ یہی میری نصیحت ہے۔

دعا گو : ظفیر عالم فاخری

رضا احمد ارب

رام داس بجرٹا۔ جمشید پور

سہیل کا تازہ شمارہ دیکھا۔ سرورق پر محترم
ادریس صاحب کی تصویر دیکھی، جس میں تاریخ وفات
۲۵ اگست تحریر ہے۔ انتقال کی خبر پڑھ کر حیرت زدہ
ہو گیا اور ذہن مفلوج ہو گیا۔

ادریس صاحب ایک تناور درخت تھے جس کے
سائے سے آپ لوگ محروم ہو گئے۔ ایک روشنی تھی جسے
تاریکی نے نگل لیا۔

رب العزت سے دعا گو ہوں کہ مرحوم کو جنت الفردوس
میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے
ہر سال محرم کے موقع پر میں گیا آتا تھا اور ان
سے ملاقات کرتا تھا۔ گزشتہ سال میں شاہد کے
ساتھ گیا تھا۔ تو انہوں نے "حبیب اردو نمبر" دیا۔ لیکن
امسال کس دل سے آؤں۔

آپ کے غم میں برابر کا شریک: رضا احمد اریب

شکیل احمد جمالی

شانت اکروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

محترم ادریس صاحب کے انتقال پر ملال کی اچانک
خبر سے دل کو صدمۂ عظیم پہنچا۔ دعا ہے کہ خدا اپنے
حبیب کے صدقہ میں جوار رحمت میں رکھے۔ اور جنت
الفردوس میں جگہ دے۔ آمین
"کل نفس ذائقۃ الموت" جو انسان دنیا میں
آیا ہے اسے موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مگر انسان کی
بے وقت موت غموں کا پہاڑ توڑتی ہے۔ خدا تم
لوگوں کو اس غم کے سہنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے۔
ہم لوگ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔
شریک غم: شکیل احمد جمالی

سلطان احمد (ایڈوکیٹ)، رانچی

بھائی ادریس صاحب کی وفات کا سن کر بہت ہی
صدمہ ہوا۔ اللہ انہیں مقام فردوس عطا فرمائے۔
یہ صحیح ہے کہ آپ لوگوں کو انکی کمی محسوس ہوتی ہوگی،
لیکن اللہ کے کاموں میں کس کا دخل ہے۔ اللہ آپ
لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
دعا گو: سلطان احمد

محمد ابو صالح

حال مقیم ہوسٹل۔ ایم۔ ایم ہال، مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ

دو تین روز قبل شہیر بھائی کی زبانی آپ
کے والد محترم کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی۔ انا للہ
وانا الیہ راجعون ط

جب ہم اور شہیر بھائی ایک جگہ ہوتے ہیں تو کسی
نہ کسی طرح آپکا ذکر بھی آجاتا ہے۔ حالیہ ملاقات
میں انہوں نے آپ کے والد محترم کے اچانک انتقال
کا ذکر کیا۔ بڑا رنج ہوا۔ خدا آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے
اور مرحوم کو جنت الفردوس۔ آمین
محمد ابو صالح

شہود عالم شہود

ادارہ "فروغ اردو" محلہ یحییٰ پور۔ شیخ پورہ (مونگیر)

بہار اردو اکاڈمی کے خبرنامہ شمارہ ۵۹

نظر نواز ہوا۔ نظر پھسل کر منحوس خبر پر اٹک گئی۔

انتہائی دکھ اور دلی صدمہ ہوا۔ کیا کہوں سوائے

اس کے کہ مشیت ایزدی میں بندے کا کیا دخل ہے

سہ چراغ بجھ گئے تاروں کی روشنی نہ رہی

لبوں پہ کھیل رہی تھی جو وہ ہنسی نہ رہی

دعاگو ہوں کہ خداوند قدوس مرحوم کو جوار رحمت

میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

شریک غم: شہود عالم شہود

اے۔ رؤف

۲۹/ اسٹرینڈ روڈ۔ کلکتہ ۱

بھائی ادریس کے انتقال کی خبر ملی۔ اس خبر سے

مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ادریس ہمارے بچپن اور

مکتب کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد سیاسی زندگی

میں بھی میدان کا بہت دنوں تک ساتھ رہا۔ اللہ

مرحوم کو جوار رحمت بخشے۔ اور پسماندگان کو تسکین

قلب دے۔ باری کے لئے ہم بھی تیار رہیں۔ انکی

موت بہت سے سجھوں کے لیے بعد دیکھے

اس دنیا سے اٹھنے کا آغاز ہوچکا ہے۔ بہرحال زندگی

اور موت قدرت کے ذمہ رخ ہیں اور ہم تمام

لوگ ان ہی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ دعاگو ہوں کہ

اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو صبر عطا فرمائے۔

دعاگو: اے۔ رؤف

نیاز اعظمی

۱۲ سی، آر۔ ایم ہال۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علیگڑھ

آپ کے والد ماجد کے انتقال پر ملال کی خبر

سے سخت افسوس ہوا۔ خدا آپ کو اور دیگر

متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اللہ مرحوم کو

جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

موت ایسی حقیقت ہے کہ جس کے آگے اس

دار فانی کی حیثیت صفر ہوکر رہ جاتی ہے۔

بہرحال یہ تمام رموز تو خدا ہی جانے،

ہم بندے تو ہر عالم میں اس کے مطیع ہیں

آپ کے غم میں برابر کا شریک

نیاز اعظمی

جمیل احمد

۸۔ ایچ۔ جیسٹ، سشاٹ کوارٹر

شاخاکوز، دیسٹ بمبئی ۵۲

حضرت محترم ادریس بھائی کے انتقال

پر ملال کی خبر نے ہمارے کلیجے میں تیر پیوست کردیا

ہے۔ مجھ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اب تک

مجھے یقین نہیں آتا ایسا ہو نہیں سکتا۔ دل مانتا

نہیں ہے خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ روح جان

الگ کردی گئی ہو۔ دل منہدم ہو گیا۔ تسلیں جم

دُنیا سے باہر آگیا۔

اور اب سہیل کا تازہ شمارہ، سرورق کی تصویر، مجھے پُرانے دنوں میں گم کر رہی ہے۔ جہاں مجھے اس ایک لمحے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہاں آپکی زندگی جو ایسے شفیق اور مخلص باپ کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہو، اس کے بارے میں سوچنا ہی کیا...... مگر صبر...... صبر...... کہ خدا صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔ اور ایسے موقعوں پہ دہی کام آتا ہے۔

میرے بھائی! خود میں نے اپنی ۲۲ سالہ زندگی میں موت کو کچھ اتنی بار اور اتنے قریب سے دیکھا ہے جس کا رنگ میری تمام تر کہانیوں میں آپکو دکھائی دے سکتا ہے۔ ہر پل لگتا جیسے اب موت کی آغوش میں سو جاؤں گا، ــــ موت ایک حقیقت ہے اور اس فلسفے پہ مجھے ایک صاحب کی رائے یاد آرہی ہے۔

جب آدمی ابدی نیند سو رہا ہوتا ہے اس وقت وہ محوِ خواب ہوتا ہے، قیامت تک وہ محوِ خواب ہوتا ہے۔ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کب مر گیا ہے۔

اس لئے ایسے موقع پر سب کی بڑی تسلی یہی ہے کہ موت ایک ایسا طویل خواب ہے جو اس کی آغوش میں سویا ہوا شخص دیکھ رہا ہے۔ وہ کس عالم میں ہے اس کا پتہ خود اسے بھی نہیں ہے۔ اس فلسفے کے اندر جائیے تو عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوگا۔ اور احساسِ غم کسی حد تک کم ہو جائیگا۔

میرے بھائی!

آپ اور ہم صاحب نہیں رہے۔ مگر یہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ مرحوم کی ادبی خدمات کا سہیل کے ذریعے اعتراف کریں۔ اُن پہ نمبر شائع کریں اور انکی ذاتِ گرامی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالیں۔ یہ آپکا کام ہے۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس کام کو بھرپور طریقے سے انجام دیں گے۔

آپ کا شریکِ غم
مشرف عالم ذوقی

سیفُ الدّین الصاف

۳/۱۰۱- اے گارڈن ریج، ہل سائیڈ۔ وکھرولی۔ بمبئی ۷۹

بہت افسوس ہوا کہ آپ کے والدِ محترم اور بزرگ سہیل اور گیاوی ۲۵ اگست کو رحلت فرما گئے۔ جمیل بھائی سے انکی علالت کی خبر ملتی رہتی تھی مگر معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ہمارے درمیان سے اٹھ جائیں گے۔ خیر صبر کے سوا چارہ نہیں۔

سیف الدین الصاف

شمس بدایونی

روشن محل، محلہ سوتھہ، بدایوں (یوپی)

والد ماجد کے سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر رنج ہوا۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو اس غم کے برداشت کرنے کی توفیق دے۔ مسئلہ الٰہی میں کسی کا چارہ نہیں۔

شریکِ غم
شمس بدایونی

ف۔س۔اعجاز

اعجاز پرنٹنگ ہاؤس، ۲۵ زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۹

جناب ادریس سنبھاروی کے انتقال پر ملال کی خبر ہوئی اور اس خبر سے دکھ پہونچا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو گوشۂ فردوس نصیب کرے (آمین) اور آپ سبھوں کو صبر کی توفیق دے۔

میرے جذبات آپ کے ساتھ ہیں۔

ف۔س۔اعجاز

رام پرکاش راہی

۱۱۱۔ اے۔ جی۔ سی۔ آر۔ انکلیو۔ نئی دہلی ۹۲

سہیل کا شمارہ برائے اگست ملا۔ دل افسوس کر رہ گیا کہ بزرگوار ادریس بھائی ایک ماہ پہلے رحلت فرما گئے۔ آپکی طرف سے اطلاع پہلے آتی تو مناسب تھا۔ خیر! اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ — اپنے بھائیوں اور دیگر احباب و اقارب تک اظہارِ افسوس پہونچا دیجئے۔

دعاگو رام پرکاش راہی

غریب بدایونی

اردو اسکول اسٹریٹ۔ راورکیلا (اڑیسہ)

آج میرے ادریس مجھ سے بچھڑ گئے۔ ادریس دنیا کے لئے مر گئے اور میں دل کے لئے!! پیار کے سنسار میں ہم دونوں اکیلے ہو گئے ہیں۔ پھر بھی خدا ہمیں ملائیگا۔ یہاں نہیں "جنت" میں! اگر یہاں ملائے گا تو وادیٔ خیال میں — اور میں انہیں سہیل کے آئینہ میں دیکھا کروں گا۔ انہیں سہیل کے صفحات میں پڑھا کروں گا۔ تم دیکھنا منظر! ایسا ہوگا، ہاں ایسا ہوگا۔ منظر! — خدا حافظ

غریب بدایونی

حسن منظور حسن

جی۔ پی سلوپ، کدما۔ جمشید پور

اگست ۹۴ء کا "سہیل" موصول ہوا۔ سرورق دیکھ کر سکتے میں رہ گیا ع

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بیشک آپ حضرات اور متعلقین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ آپکے غم میں یہ احقر بھی برابر کا شریک ہے اور اللہ پاک سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور آپ حضرات کو صبرِ جمیل عطا فرمائے گا (آمین)

مرحوم ادریس علیہ الرحمۃ والرضوان کی شفقت و محبت سے صرف آپ ہی لوگ محروم نہیں ہوئے بلکہ میں نے بھی ایک شفیق و مہربان ہستی کو کھو دیا۔ جب بھی گیا جانا ہوا۔ آپ حضرات سے تو کبھی ملاقات نہ ہو سکی مگر مرحوم سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی ملاقات ہی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیار کا خزانہ مل گیا ہے۔ افسوس اب وہ لمحات نہ آئیں گے۔ اس دارِ فانی کی ہر شے فنا ہونے والی ہے اور باقی رہنے والی ایک ہی ہستی

ہے وہ ہے خدا۔ تو خدا سے دعا کریں گے کہ ہم سب کو صبر و استقامت عطا فرمائے اور مرحوم کی قبر کو نور سے منور کر دے۔ (آمین)

حسن منتظر حسن

غلام مرتضیٰ

انٹرنیشنل کمرشیل انسٹی ٹیوٹ۔ بہار شریف

یہ خبر سن کر صدا افسوس اور صدمہ ہوا کہ آپ کے والد بزرگوار جناب ادریس صاحب اپنے تمام اقربا عزیزان اور محبان کو سوگوار چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب اکرم کے طفیل میں انکو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

آپ شفقت پدری سے محروم و محزون ہو گئے ہیں لیکن ہدایت پدری کو مشعل راہ بنائیں۔ اور صبر و سکون سے کام لیتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہیں۔ یہ دنیا مسافر خانہ ہے، یہاں کی زندگی مسافرت کی زندگی ہے، قیام کرتے ہیں اور اپنے مقصد حیات کی تکمیل کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اب تو صبر و ضبط سے ہی کام لینا ہے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرنی ہے۔

مخلص غلام مرتضیٰ

سر شید رشمن

شریک مدیر۔ کیانا جیل خانہ، گیا

آپ کے والد ماجد کے انتقال کی خبر مجھے گیا میں ٹریڈ یونین کنونشن میں ملی۔ کنونشن نے ایک منٹ تک خاموش رہ کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

(ہندی سے ترجمہ) سر شید رشمن

سید رضا امام رضوی

۳۲۔ کھگول روڈ۔ گردنی باغ۔ پٹنہ ۲

بہادر موصوف کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر بہت ہی صدمہ و ملال ہوا۔ مجھے کیا علم تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں گے۔ ۲۹ جولائی کی شام میں ملاقات ہوئی تھی۔ دیر تک گفتگو ہوئی عشائیہ ہی چائے بھی پی۔ وہ ہمارے ایک پرانے دوست بھی تھے۔ خدا نے ایک اچھے دوست کو مجھ سے چھین لیا۔ لیکن کرنا ہی کیا ہے؟ کل نفس ذائقۃ الموت ط موت کا مزہ تو سبھی کو چکھنا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج انکی کل ہماری باری ہے

خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

یعنی
سید امام رضوی

قاضی انصار

قاضی پورہ لکھنؤ (ایم۔ پی)

ابھی ابھی مجھے "کتاب نما" کا تازہ شمارہ ملا۔ ورق گردانی کے درمیان اچانک محترم ادریس صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط ادریس صاحب مرحوم کے ساتھ ایک زبردست ادب کا

خاتمہ ہو گیا۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں جس طرح زبان و ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے وہ اُردو دُنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مرحوم سے میرے اپنے دیرینہ تعلقات رہے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بڑا بھائی مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔

بہرحال! یہ غم آپ کا نہیں میرا اپنا بھی ہے۔ اُردو دُنیا کا بھی ہے۔ مجھے اس میں اپنے برابر کا حصہ سمجھیں۔ میں درگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ مرحوم کو اپنے حبیبِ پاک کے صدقے میں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین) اور متعلقین کو صبر دیں۔

شریکِ غم: قاضی القصار

مرشد ہوش نعیمی قادری

نیو مسلم کالونی۔ ہندپیڑھی۔ رانچی

میرے کرم فرما کے سانحۂ ارتحال کے علم سے دل بیٹھ سا گیا۔ اِنّا للّٰہ الخ۔ حق تبارک و تعالیٰ جل مجدہ انکی مغفرت فرمائے اور ہم اور آپ سبھوں کو صبرِ جمیل بخشے (آمین) بجاہ النبی الکریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم۔ مرحوم پیکرِ اخلاص اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔

مرشد ہوش غفرلہٗ

ریاض الحق (سعودی عربیہ)

ابھی ابھی فوراً خبر ملی کہ محترم ادریس چچا کا انتقال پُر ملال ہو گیا۔ یہ پڑھتے ہی دل و دماغ سے صبر گیا ہے۔ اللہ پاک سے دعاگو ہوں کہ اپنے بندوں کے صدقے میں ان کو جنت میں جگہ دے۔ (آمین)۔ چچا محترم کی شخصیت ہمارے خاندان میں ایک ستون کی تھی۔ ان کے انتقال سے بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ نہ معلوم خدا کا یہ کیسا انصاف ہے کہ اچھے لوگوں کو وہ جلد ہی اپنے پاس بُلا لیتا ہے۔

موت یقینی ہے۔ اس کا مزہ سبھوں کو چکھنا ہے۔ تم لوگ صبر و سکون سے کام لو اور خدا سے تعالیٰ سے ان کے لئے دعا کرو۔ تم لوگوں کے غم میں برابر کا شریک:

ریاض الحق

ایس۔ ایم۔ سالم

۱۸/۲۴۲-۱ اے حسن آباد، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸

سانحہ کی روح فرسا خبر ملی، افسوس ہوا۔ ہمارے دوست شفیق دوست ادریس بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنّا للّٰہ .... آپ لوگ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اللہ پاک سے دعا کریں مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)

ایس۔ ایم۔ سالم

قاسم فریدی

مرانچی۔ مسے پلہ

بزرگ محترم حضرت ادریس سہسرامی صاحب کے اچانک انتقال کی خبر ایک حادثۂ جانکاہ سے یقیناً کم نہیں۔ مرحوم سہیل کے ذریعے اُردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی مثال خال خال ملتی ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین)

انتخاب نمود

اِدریس سُنسہاروی

جناب اِدریس سُنسہاروی کے ○ اداریوں کا مختصر انتخاب

یہ اگست کا مہینہ ہے اور اس مہینہ میں ۱۵ر تاریخ کا دن ہندوستان کے لئے ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اسی روز طویل جد و جہد اور ان گنت قربانیوں کے بعد برطانیہ کے شکنجے سے نجات حاصل کی تھی۔ اور ہم نے امن، ترقی اور خوشی کے رنگا رنگ خواب دیکھے تھے۔

اور ان خوابوں کو دیکھتے ہوئے بیس سال گذر گئے۔ اکیسواں سال شروع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں ہم نے اپنے ملک اور قوم کو اپنے قوانین دئے۔ ہم پلانوں پر عمل کرتے ہوئے نئی نئی بڑی بڑی سڑکیں، نئی نئی فیکٹریاں، عالی شان عمارتیں اور عالی شان باندھ کو وجود میں لائے۔ جن کو دیکھ کر اور جن کی نمائش کر کے ہم بے انتہا خوش ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستان سے فرقہ پرستی، صوبہ پرستی، اور تنگ نظری کو دور نہیں کر سکے۔ ہم ہندوستان کو زراعت کے معاملے میں خود کفیل نہیں بنا سکے۔ جبکہ ہندوستان سراپا زراعتی ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہم نے شہروں کو سنوارا لیکن گاؤں اور دیہاتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہم نے پونجی پتیوں کی جیبیں بھریں اور غریبوں کو وہاں تک پہنچا دیا ہے جہاں اب موت ہی ان کا علاج ہے ------ ہم نے اقلیت کے حقوق کو پامال کیا۔ ہم نے اب تک اردو یا گنگا جمنی تہذیب کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا اور اس کو اس کے گھروں میں جگہ نہیں دے پائے ہم شہریت اور جمہوریت کی جو قدریں ہیں ان کو پڑھا اور پڑھایا ضرور ہے لیکن جن کی "قابل تقلید" مثالیں دوسرے ملکوں کی اسمبلیوں اور شہروں میں ملتی ہیں اور ہم انہیں دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں ------ غرض کہ ہم نے امن اور قوس قزح جیسے خواب دیکھے تھے، صرف دیکھے تھے، ان کی تعبیریں ہم سے ابھی پنہاں ہیں ------ !

جانے یہ نہاں کا پردہ کب چاک ہوگا ------ ؟ اور کب وہ وقت آئے گا جب ہمارا ہندوستان اخلاقی اور سماجی اعتبار سے جنت کا نمونہ بنے گا۔؟

ادریس سنسہاروی
اگست ۱۹۶۷ء

ماہنامہ سہیل گیا

اہل اردو نے اردو زبان کی بقا، اس کے جائز حقوق اور اس کی مدافعت میں صفحے کے صفحے سیاہ کردیے۔ مگر اب بھی اردو دشمن گروہ کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور اب بھی وہ اپنی مشنری ذہنیت کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں۔ ان کے کردار اور گفتار سے ملک کی یکجہتی خاک میں مل جائے اور قوم ارتقا کی منزل سے دور ہوتی چلی جائے انہیں پرواہ نہیں ـــــ ابھی چند دنوں کی بات ہے جمشید پور میں بھارتیہ جن سنگھ کے نئے صدر باجپائی جی اور کلکتہ میں آر ایس ایس کے کرتا دھرتا گرو گولوالکر جی نے اپنے محبوب موضوع اردو پر گل افشانی کی ہے۔ اور کیا خوب کہا ہے کہ اگر اردو کو دوسرے صوبوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو ان کی جماعت اس کے خلاف آندولن چلائے گی۔ مطا کہ رانچی اور ہٹیا کی خون ریزی دہرائی جائے گی۔ ہندو دھرم کا مطالعہ کیجیے تو کہیں سے بھی وہ ظلم و جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے نزدیک چیونٹی جیسی حقیر ترین چیز کو ایذا پہنچانا پاپ گردانتا ہے ـــــ جبکہ یہ دونوں جماعتیں اور اس کے کارکن اپنے کو ہندو دھرم کے رسیا اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا مقدم سمجھتے ہیں ـــــ حیران ہوں کہ آزادی ان جیسوں کو ملی ہے یا سارے ہندوستان کو۔ اگر سارے ہندوستان کو ملی ہے تو جس فرقہ پرست اور انتہا پسند پارٹیوں کی تحریکوں اور زبانوں پر فوراً پابندی ڈال دی جاتی ہے ہماری حکومت ان لوگوں سے جانبدارانہ سلوک کیوں روا رکھتی ہے ـــــ گرو گولوالکر جی نے دورانِ تقریر ایک بات کہی ہے وہ یہ کہ اگر اردو کو زندہ رکھا گیا تو ایک دن ایک اور پاکستان بن جائے گا۔ کیا دور کی کوڑی لائے ہے نے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیچاری اردو ہی نے پاکستان بنایا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اور یہ حقیقت اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ کاغذی پاکستان کو حقیقی پاکستان کا درجہ دینے والے عصبیت پسند اور تنگ نظر تھے۔ جو آج بھی دنیا کے حالات سے بے خبر ہو کر اسی پرانے راگ کی دھن پر رقص کناں ہیں۔

بہرحال اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اہل اردو ایسی زہریلی باتوں سے کبھی دل برداشتہ اور نہ ہوں گے۔ کیوں کہ اردو کے بہی خواہوں اور نام لیواؤں میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی ہیں۔ ان کی مشترکہ جد و جہد ایک دن کامیاب ہوگی اور اردو کو وہ جائز حقوق ملیں گے۔ جن کے لئے بہتیرے قابل احترام ہندوؤں نے دیگر اردو کی اہمیت کو امر بنا دیا ہے۔

ادریس سنہاروی

دسمبر ۱۹۷۱ء

○

کسی بھی عوامی ادارے کی ورکنگ کمیٹی میں اختلاف پیدا ہونا بری بات نہیں۔ بلکہ اس سے ممبران کے کام کرنے کی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اور ادارہ کی ترقی ہوتی ہے لیکن ان اختلافات کی مدت کو طویل نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ جلد از جلد اس کا قلع قمع کر دینا چاہئے ورنہ پھر یہی اختلافات بڑھ کر ادارہ کو کھوکھلا کر دینا شروع کر دیتے ہیں۔

اختلافات حق و صداقت اور فتنہ و شر کے درمیان ہوتے ہیں۔ اگر ممبران دیانت داری سے کام لیں تو فتنہ و شر کو مات کھانے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن کچھ ممبران دونوں گروہ میں سے کسی ایک گروہ میں شریک نہ ہو کر غیر جانبدار ہو جاتے ہیں تاکہ ہر گروہ میں انہیں سرخروئی حاصل رہے۔ اور پھر دونوں گروہ میں لیپ پوت صلح و صفائی کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق و صداقت اور فتنہ و شر میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ غیر جانبدار حضرات جانبدار ہو جائیں تو پھر فتنہ و شر کی مات اور حق و صداقت کی فتح فی الفور ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ غیر جانبدار حضرات صرف دو تو ہوتے ہیں لیکن در پردہ یہی سب سے بڑے ادارے کے دشمن ہوتے ہیں۔ اور انہیں کی وجہ سے فتنہ و شر کو مزید زندہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔

حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انتہائی چھان بین کے بعد یہ پتہ چلایا جاتا کہ کس گروہ کے سامنے عوامی مفاد ہے۔ اور کس گروہ کے ساتھ ذاتی مفاد۔ اور پھر عوامی مفاد مد نظر رکھنے والے گروہ میں شامل ہو کر فتنہ و شر کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔

غیر جانبداری زہر ہے اسے ترک کرنا ہی بہترین مصلحت ہے۔ ادارہ کی ترقی اور اس کی بقا کے لئے حق و انصاف کا ساتھ دیجئے۔ تاریخ کے اوراق الٹیے، پچھلے کارناموں کا جائزہ لیجئے، کھرا کھوٹا صاف نظر آ جائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ فتنہ و شر کا ساتھ دینے یا انہیں چھوٹ دینے کی وجہ سے عوام کے سامنے مطعون ہونا پڑے۔

ادریس سنبارہی

○

اردو کے ادبی رسالے صرف جنون کے تحت جاری ہوتے ہیں اسے جاری کرنے کے بعد وہی لوگ باقی رکھتے ہیں جو اپنا خون جلانے اور پسینہ بہانے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ جنون کے بغیر اردو ادبی رسالوں کو باقی رکھنا ممکن ہی نہیں کسی ادبی رسالے سے مالی فائدے کی امید دلانا ایک خواب ہے۔

سہیل ۱۹۷۹ء میں جاری ہوا تھا۔ اب تک اس کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ ایسے لمحے بھی آئے جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور اس کی زندگی کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی لیکن پھر جنون نے سہارا دیا اور سہیل جاری رہا۔ لیکن اس لمبی کہانی کو دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ہم نے ہر حیثیت پر پہلے بھی اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور آئندہ بھی اپنے خون پسینے سے سرسبز رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

ہم آج اپنے قارئین کو یہ خوشخبری دینے کے لائق ہوئے ہیں کہ اب ہم تنہا نہیں ہیں اب ہمارے جنون میں کچھ بزرگ اور دوست بھی شامل ہیں، جناب سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر قمر رئیس، جناب سالک لکھنوی، جناب شاہد احمد شعیب اور ڈاکٹر افصح ظفر سہیل کی مجلس مشاورت میں شریک ہو گئے ہیں۔ اور رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

"سہیل" اپنی ابتدا سے ترقی پسند رسالہ ہے لیکن کسی مخصوص جماعت سے وابستہ نہیں رہا ہے۔ اور اسی لئے جماعتی تنگ نظری سے بلند رہا ہے۔ تنگ نظری ترقی پسندی کی ضد ہے آئندہ بھی اس کی پالیسی وہی رہے گی جو اب تک رہی ہے۔

ہم ادب میں نئے تجربوں کے قائل ہیں۔ بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں اس لئے ہر خوب صورت اور صحت مند تجربے کا ہم خیر مقدم کریں گے۔ "سہیل" غلط اور بھونڈے تجربے کی ہمت افزائی کسی حال میں نہیں کرے گا اس لئے کہ یہ ساری باتیں انسانی سماج کے لئے زہر ہیں۔

ادب کو جام حیات ہونا چاہئے۔

زہر کا پیالہ نہیں۔

ہم اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے، آپ بھی سوچیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔

ادریس سہسرامی ستمبر

○

ادھر کچھ دنوں سے ادبی رویوں میں مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ تقریباً دو دہائی تک ہمارے ادب پر منفی رجحانات کو عام کرنے کی سازشی تحریک چلتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحت مند ادبی تجربوں کو بھی وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ دراصل سماجی حقائق کے تناظر کو نظر انداز کر کے کسی فن پارے کی تخلیق کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک طویل بے راہ روی کے بعد بیشتر بے راہ رو فنکاروں نے اب اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سیاسی، تمدنی اور سماجی تبدیلی کے عوامل ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رہے ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات کے صحیح تناظر کو سمجھنا اور مثبت انداز فکر کی راہیں ہموار کرنا "سہیل" کا مقصد اولین ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے قارئین نے اس حقیقت کو سمجھا ہے اور ہماری ہمت افزائی کی ہے۔

سچ کہنے والوں کو ہم اپنی برادری میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان فکری اور نظری اختلاف ممکن ہے۔ مگر ہم سچائی کے متلاشی ہیں۔ جس کو جہاں روشنی کی کرن نظر آئے گی وہ اس کو حرف و صوت کے ذریعہ دوسروں تک منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیتا رہے گا۔

ادریس سنہاروی

اکتوبر ۸۰ء

ایسا لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر کے لئے منفی ادبی لہروں کا ایک جھونکا آیا تھا۔ گرد و غبار سے بھرا ہوا جھونکا۔ جس نے آمنے سامنے کی چیزوں کو دھندلا دیا تھا۔ راستے گم ہو چکے تھے۔ جب ایسا احساس بڑھا اور راستے کی تلاش شروع ہوئی۔ اور اب یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جو کچھ ہوا نظر کا دھوکا تھا۔ تحریک بھی اپنی جگہ درست تھی اور ترقی پسندی کے واویلے میں بھی کچھ جان تھی۔ یہ احساس خوش آئند ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر ہماری قومی زندگی کا ترقی پسندانہ شعور ابھی بھی دور کا ڈھول ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہم اپنی تخلیقی جدت کو سکتے اور مضمحل کرب سے اسے اور بھی دور کی آواز بنا دیتے ہیں۔ یہ بے مجگری سے مقابلہ کرتا ہے۔ کرب کی لذت اس طرح پیدا کریں کہ قومی زندگی میں چراغاں ہو جائے۔

آج کا تقاضا ہے کہ وہ سارے لوگ جن کے ہاتھوں میں قلم ہے ترقی پسندانہ زاویۂ نظر کی تازہ دم انداز میں اس طرح مشعل برداری کریں کہ روشنی کی لکیریں تخلیق کی تہہ میں پیوست ہو جائیں۔ انقلاب تہہ نشین ہو جائے گا۔ مگر اثر بہت دور تک سرایت بھی کر جائے گا۔ ترقی پسندی کی نئی معنویت یہی ہے۔

برصغیر میں چھوٹی بڑی بیسیوں زبانیں ہیں جو حصول آزادی کے بعد خوب پھلی پھولی ہیں۔ اور روز بروز برگ و بار سے لدتی چلی جا رہی ہیں۔ زبانوں کے پھلنے پھولنے کا یہ زمانہ قابل دید ہے۔ وہ بولیاں بھی چمکنے لگی ہیں جنہیں کبھی ادب نہ دیکھا جاتا تھا کیونکہ ان میں ادبی شعور کی کمی تھی۔ مگر اب ان کی ترقی اور ترویج قابل تحسین ہے۔ یقینی طور پر زبانوں کا یہ ارتقا ہندوستان کی کثرت میں وحدت کے اصول کی خوب صورت عملی شکل ہے ہم اس اصول کے سچے پرستار کی حیثیت سے اس صورت حال پر فخر کر سکتے ہیں۔

لیکن جس زبان میں یہ بات لکھی جا رہی ہے اس کے بارے میں یہ اصول حصول آزادی کے بعد کچھ بہتر نہیں رہا۔ اس زبان کو روز کوئی نہ کوئی جھگڑے بکھیڑے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ اس زبان کے بولنے والے کو ہوتا ہے اور نقصان ہوتا زبان کو۔ زبان کے ساتھ ایسی صورت اس وقت تشکیل پاتی ہے۔ جب زبان کو سیاست کی سطحیت سے واسطہ پڑتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ زبان سے جذباتی رشتہ تو گہرا ہو جاتا ہے مگر اس زبان کی ذہنی سطح کمزور ہو جاتی ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہمیں ایسے سیاست والوں سے واسطہ پڑ رہا ہے جو اردو کے مسئلے کو جذباتی بنا کر رکھ دے رہے ہیں۔ اور اردو اپنے دماغ میں مغز سے زیادہ چھلکے بھرتی چلی جا رہی ہے۔ جذبات کے لمحے اچھے ہوتے ہیں مگر لمبا سفر دماغ سے طے ہوتا ہے۔ آئیے! ہم اپنی زبان کو مغز سے بھر دیں، چھلکوں کو باہر پھینک دیں۔ اپنے اخبار، اپنے رسالے اور اپنی کتابیں دانشورانہ تحقیق اور تخلیق سے اس طرح پر کر دیں کہ لوگ سچ مچ علم و ادب کی پیاس بجھانے کے لئے اس طرف خود بخود راغب ہو جائیں ——— ادریس سنہاروی دسمبر ۸۶ء

O

پچھلے بیس برسوں میں ایک گروہ نے ادب کے نام پر منفی رجحانات کا پرچار کیا۔ اور ہر مثبت رجحان کی دل کھول کر مخالفت کی نتیجے کے طور پر ادبی دنیا میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ادب میں ترقی پسندی اس گروہ کا خاص طور پر نشانہ بنی۔ اسے طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جدیدیت کے مبلغوں نے ادب کے نام پر جو مجہول تحریریں پیش کیں وہ قبول عام حاصل نہ کر سکیں۔ ان تحریروں کو ایک مخصوص حلقے کے علاوہ کہیں پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ایماندار لکھنے والوں نے اپنے رویئے پر خود غور کیا۔ اور خود کو بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن آج بھی کچھ لوگ ہیں جو اپنی روش پر قائم ہیں۔ مگر ہمیں اس کا یقین ہے کہ ان میں بھی جو سمجھ والے، ایماندار لکھنے والے ہیں وہ خود محسوس کریں گے۔ اور اپنا رویہ بدلیں گے۔ اور جو نہیں بدلیں گے وہ خود اپنے خیالات کے صحرا میں بھٹک کر رہ جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک افسوسناک پہلو بھی ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی سست رفتاری اور بے عملی۔ اس مدت میں عام طور پر ترقی پسند لکھنے والے خاموش رہے۔ بہتوں نے بہت کم لکھا۔ اور کچھ لوگوں نے لکھا ہی نہیں۔ ترقی پسندی پر پیہم حملے ہوتے رہے۔ اور انہوں نے جواب تک نہیں دیا۔ حالانکہ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ زیادہ سرگرم عمل ہوتے، اور بہتر سے بہتر ادب تخلیق کرتے۔ حالات بدلے ہیں اور تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ لیکن ترقی پسند لکھنے والے اب بھی حالات کی طرف سے بے پرواہ ہیں۔ یہ صورت حال افسوسناک ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ترقی پسند شاعر اور ادیب پہلے سے زیادہ سرگرم ہوں۔ اور ادب کو صحیح سمت اختیار کرنے میں مدد دیں۔

ادریس سہسرامی
جنوری ۷۹ء

○

شکر ہے کہ سماجی ذمہ داری اور نظریاتی وابستگی کی باتیں اب پہلے سے زیادہ محسوس کی جانے لگی ہیں۔ جن لوگوں نے ان حقائق سے گریز کی راہ اختیار کی تھی اب ایسا لگتا ہے کہ انہیں بھی صحیح سمت کی پہچان ہونے لگی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دہائی تک ادبی انارکیوں نے اپنی تمام منفی قوتوں کے استعمال کے بعد بھی اردو ادب کے ثقافتی کردار کو مجروح کرنے میں ناکامی ہی حاصل کی اب جبکہ ان کے ہنگامے ختم ہو چکے ہیں۔ اور تقریباً پندرہ برسوں کے کرب تنہائی اور ذات کا ابال SUBLIMATE کر چکا ہے تو پتہ چلا کہ زندہ ادب وہی ہے جس کا رشتہ عوام اور سماجی آہنگ سے استوار ہے۔

اردو کے علاوہ ملک کی دوسری زبانوں میں بھی عوامی عناصر اب زیادہ کارفرما ہیں۔ دیگر تحریک والے اب اپنا رشتہ بائیں بازو سے جوڑتے ہیں۔ دلت پنتھر والے اپنی نجات مارکسزم میں دیکھنے لگے ہیں۔

عوام نے ہمیشہ زندگی کی مثبت قدروں کو پروان چڑھایا ہے ان کی نفی کرنے والے وقتی طور پر شور و ہنگامہ کی فضا ضرور قائم کر لیتے ہیں۔ مگر ان کی CREDIBILITY کبھی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ سماجی دھارے سے کٹ کر جو بھی ادب تخلیق کیا جاتا ہے اس کی CREDIBILITY ممکن نہیں۔

ادریس سنہاروی
اپریل ۷۹ء

جمشید پور کے ہولناک فرقہ وارانہ فساد میں
ذکی الانور کا قتل ہو گیا
ادیبوں، شاعروں، اور دانشوروں پر اس خبر سے سکتہ طاری ہو گیا
سبھوں نے افسوس اور دکھ کا اظہار کیا
کہیں کہیں قلم کاروں نے تعزیتی جلسے کئے
تجویزیں بھی پاس ہوئیں
اور پھر —— پتہ نہیں کیا ہوا۔

مگر ایسا لگتا ہے کہ اب بھی لوگوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ ذکی الانور زندگی، فن اور تہذیب کی کن کن صحت مند قدروں کی علامت بن کر سامنے آیا اور اسے کن قوتوں نے اپنا نشانہ بنایا اور کیوں بنایا۔ کیا ذکی الانور کا قتل صرف ذکی الانور کا قتل ہے؟ صرف ایک ادیب ایک فنکار کا قتل ہے؟ یا بات اس سے آگے بھی جاتی ہے؟

پورے جنوب مشرقی ایشیا میں ایک عجیب سیاسی افراتفری کی فضا قائم کی گئی ہے فاسشٹ قوتوں نے جمہوری اقدار اور جمہوری قدروں کے خاتمہ کی قسمیں کھالی ہیں۔ ان تاریک اثرات سے ظاہر ہے ہندوستان اور پڑوسی ممالک بھی الگ نہیں رہ سکتے سیاسی اور سماجی انارکی کو اسی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔

ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ بے حد سنجیدگی سے غور کرنے کا مقام ہے۔
وہ لوگ جو فرد کی تنہائی، ذات کا کرب وغیرہ کا رونا روتے ہیں جو سماجی ذمہ داریوں اور مثبت قوتوں سے ادب اور فن کی وابستگی اور فن اور زندگی کے رشتے کا مذاق اڑاتے رہے کاش ہوش کے ناخن لیں اور ان فاسشٹ قوتوں کی سفاکی کو محسوس کریں جو ملک، قوم اور زندگی کے لئے پیام موت بن کر سامنے آتی ہیں۔
ادیبوں شاعروں، دانشوروں اور تمام فنکاروں کے لئے؟
حالات کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا وقت ہے، سماجی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کا وقت ہے ہر اس مثبت قوت سے رشتہ جوڑ لینے کا وقت ہے جو فن تہذیب اور آزادی کی علامت ہیں۔ —————— ورنہ
ادب فن اور تہذیب پر حملے ہوتے رہیں گے۔ امن آزادی اور انسانیت موت کا شکار ہوتی رہے گی
اور —————— ذکی الانور کے قتل کا سلسلہ جاری رہے گا —— ادریس سنہاروی مئی ۱۹۷۹ء

تیزی سے بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال سماجی، تہذیبی اور تہذیبی زندگی میں اس کے اثرات کو نظر انداز کرنا ذمہ دار فنکار اور دانشور کے لئے جنھیں ادب، آرٹ اور کلچر کی نشو نما سے لگاؤ ہے، ممکن نہیں۔

سیاسی اور سماجی زندگی پر اب منفی قوتوں نے اپنے حملے تیز تر کر دیئے ہیں۔ صحت مند ادبی قدروں کے تحفظ کے لئے جس آزاد فضا کی ضرورت ہوتی ہے ایسا لگتا ہے اس پر اب کسی بڑے حملے کی تیاری ہے۔

یہ نیک شگون ہے کہ ہمارے فنکار اب ان حقائق کے جانب سنجیدگی سے توجہ دے رہے ہیں اور ادھر ادبی رویّوں میں صحت مند تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ ہم آنے والی منفی صورت حال کے مقابلہ کے لئے تیار رہیں۔ اور اپنے ادب و آرٹ کے ذریعہ ان قوتوں کو مضبوط کرنے کی کوشش جاری رکھیں۔ جن کے سائے میں زندگی کا حسن اور ادب و فن کی دلکشی زندہ و پائندہ رہتی ہے۔

ادریس سنابدوی
ستمبر ۱۹۷۹ء

نہ میرے قلم میں اتنی قوت ہے

اور

نہ دل و دماغ میں اتنی صلاحیت

کہ

سہیل عظیم آبادی کی تعزیت میں کچھ لکھ سکوں

کیسے لکھوں ـــــ کہ سہیل بھائی ہم سب کو چھوڑ چکے ہیں

کیسے لکھوں ـــــ کہ اب ہم ان کی شفقت محبت اور بے پناہ پیار سے

محروم ہو گئے ہیں۔

کیسے لکھوں ـــــ کہ اب ہم کو پناہ دکھانے والا نہیں رہا

ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے اندر سب سے قیمتی چیز کھو گئی ہو

چاروں جانب اندھیرا ہے، تاریکی ہے۔

اب ہم کہاں جائیں اور کس سے روشنی طلب کریں۔

....

مگر سہیل بھائی ـــــ آپ نے روشنی کی جستجو کو "مذہب" بتایا تھا

ہم وعدہ کرتے ہیں

کہ

اس مذہب پہ

ہمارا ایمان

اب پہلے سے اور زیادہ پختہ اور مضبوط ہوگا۔

ادریس سہارادی

دسمبر ۱۹۷۹ء
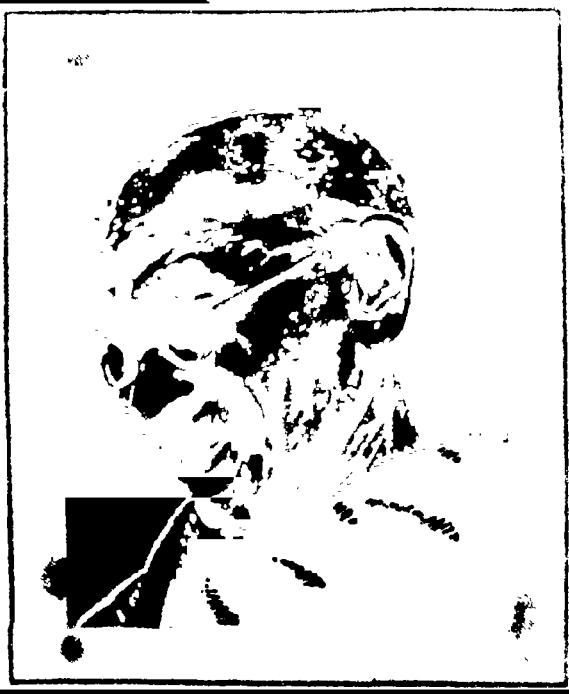
باپو کا مذہب

"میرے مذہب کی کوئی جغرافیائی حدود نہیں ہیں۔
میرے مذہب کی بنیاد سچ اور عدم تشدد ہے
میرا مذہب مجھے کسی سے نفرت کرنے سے منع کرتا ہے۔
مذہب لوگوں کو جدا کرنے کے نہیں۔ اُن کو باہم جوڑنے کے لئے ہے"

یہ تھا مہاتما کا مذہب

محبّت اور بُردباری کا مذہب

تیس ۳۰ سائنس دانوں کے ذریعہ
عظیم ترین مصفیِ خون کے راز پانے کی کوشش
گزشتہ پچاس برسوں سے صافی بطور مصفی خون بے حد مقبول و مشہور ہے اور جدید تحقیقات نے بھی
اس کے استعمال کو سو فی صد بے خطر اور بہت سے فائدوں کی حامل ثابت کر دیا ہے۔
صافی — ایگزیما، مہاسے، دوامی خارش اور جلدی عوارضات میں بے انتہا موثر
بمبئی کے ایک مشہور کلینیکل فارماکولوجی ڈیپارٹمنٹ کی تجرباتی رپورٹ کے مطابق صافی ایگزیما، خارش اور
ان کے بعد کے اثرات میں نہایت موثر ہے۔ اسی ڈیپارٹمنٹ نے
اپنی ایک دوسری ریسرچ کے نتیجے میں بتایا ہے کہ مہاسوں کے علاج میں بھی صافی کامیاب ہے۔
یہ ڈیپارٹمنٹ صافی کے اور بھی کئی پہلوؤں پر مزید ریسرچ میں مصروف ہے۔ اسی طرح ملک کے مختلف
حصوں میں تیس سائنس داں مختلف زاویوں سے صافی پر تفصیلی ریسرچ کر رہے ہیں، جن کے نتیجے
سالِ رواں ہی میں حاصل ہونے کی امید ہے۔
صافی کب استعمال کی جائے؟
* خون کی خرابی میں * پتی اچھلنے میں * مہاسے،
اور خارش میں * خسرہ میں * نکسیر پھوٹنے میں * وقتی اور
پرانے قبض کی شکایت میں * پیشاب میں جلن کی شکایت میں
* عام تھکاوٹ میں۔
۲۴ مصفی خون لازمی عناصر اور
جڑی بوٹیوں کا ایک نادر مرکب
صافی
خون کو صاف کرتی ہے۔ جلد کو نکھارتی ہے۔
ہمدرد
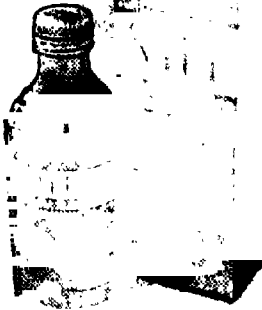
موتی
دھلائی صابن
پنجاب سوپ فیکٹری

ماہنامہ سہیل کے چار گراں قدر خصوصی پیش کش

علامہ جمیل مظہری نمبر

صفحات : ۳۰۰

قیمت : ۲۵ روپے

ایک شمارہ
کلیم الدین احمد کے نام

صفحات : ۸۲

قیمت : ۵ روپے

ایک شمارہ
علیم اللہ حالی کے نام

صفحات : ۸۰

قیمت : ۳ روپے

ایک شمارہ
منوّر رانا کے نام

صفحات : ۱۴۴

قیمت : ۱۰ روپے

کاپیاں کم تعداد میں بچ رہی ہیں خواہشمند فوری توجہ دیں۔

منیجر ماہنامہ سہیل ریورسائیڈ روڈ گیا

سے حاصل کیجئے!

دانتوں کی حفاظت کے لیے
چاند مارکہ
اسپیشل گل
ہمیشہ استعمال کیجیے
SPECIAL GUL

سب سے زیادہ
اے آر چاند تارا
گل
ہمیشہ استعمال کیجئے

The SOHAIL Monthly,
47 years of Publication

Cushion

EXTRA

Cushion

All
my thundering Power of a Poet
is yours,
my class
waging rightful battle !
"Proletariat"
Seems;
too clumsy for using
to those
whom communism
throws into a fright
For us, though
it sounds
like mighty music
that'll rouse
the dead
to get up
and fight

— Mayakovsky

NOV. '86

Rs. 2/-

RADE JRI MARK
ANTA
FOAM
جنتافوم
خوبصورت
آرام دِہ
اور مضبوط
DURABLE
&
COMFORTABLE
PHONE-44 22 22

متو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان
لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس
نمبر U 18/77 ضرور دیکھیں
کیپسول پر مارک دیکھیں
اگر لیبل پر مذکورہ لائسنس نمبر نہ ہو
اور ایل ٹی مارک نہ ہو یا دوسرا مارک ہو تو
ہرگز نہ خریدیں۔
نورانی تیل
درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا
انڈین کیمیکل کمپنی، متوناتھ بھنجن، یوپی
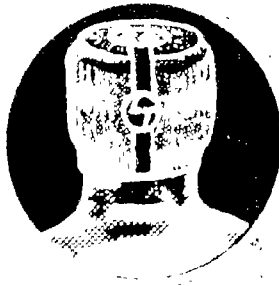
جی ہاں! آنکھوں کی حفاظت کے لئے سرمہ سب سے اچھی چیز ہے۔
لیکن جب ضامن ہو حفاظت کا۔ ہم آپ کی خدمت میں پیش
کرتے ہیں دو اعلےٰ قسم کے ایکرو فائنڈ سرمے
سرمہ نور علی نور
آنکھ مارکہ
۵۰۰
سرمہ اصلی ممیرہ
گینڈا مارکہ
۲۰۰
REGD
آنکھوں سے پانی گرنا۔ دھندلاپن۔ کچا موتیابند۔ رتوندھی
جالا۔ ناخونہ۔ پھولا کے لئے جادو اثر
ہر جگہ دستیاب ہے
تیار کردہ: حکیمان محمد اسرائیل محمد علی صاحبان
فینسی مراد آبادی سرمہ اسٹورس
۱۳۵/پارک اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱۶

دھلائی کا
صابن
MODI
مودی
پنجاب سوپ فیکٹری

مارکہ
اسپیشل گل
ہمیشہ استعمال کیجئے
SPECIAL GUL
TRADE MARK
ASHIQUE HUSSAIN & SONS
SHIBPORE HOWRAH

نی: حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنہاروی بنیاد گذار: زین العابدین احمد وادرلیس سنہاروی علیہ الرحمہ

ایڈیٹر مسعود منظر | مجلس مشاورت: ڈاکٹر تاراچرن رستوگی | جلد ۳۴ | شمارہ ۱۱
ڈیٹر جمیل منظر | ڈاکٹر قمر رئیس | خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
اون شکیل احمد جمالی | اصغر علی انجینیر
اون عبدالقیوم ابدالی | ڈاکٹر برج پریمی | ماہنامہ سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا (بہار)

ل اشتراک فی شمارہ ۲ روپے، زر سالانہ ۲۴ روپے، لائف ممبری پانچ سو اکاون روپے

فہرست

محمود	جمیل منظر سنہاروی	۸
قاضی عبدالودود اور میں	ڈاکٹر گیان چند	۹
نظمیں	ڈاکٹر فریدہ کول	۲۶
غزلیں	گوہر شیخ پوروی، تسنیم فاروقی	۲۸
غزلیں	سرفراز نواز، حسیب سوز، شیریں سحر	۲۹
کامریڈ برکت سنگھ (کہانی)	نریندر	۳۶
نئی کتابوں کا تعارف	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، ڈاکٹر فریدہ کول	۳۷

کامریڈ گورباچوف کی آمد

روس کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری میخائیل گورباچوف کی ہندوستان آمد کئی نظریے سے بہت اہمیت کا حامل ہے یوں تو ہندوستان اور روس کے بیچ صلاح مشورہ، دونوں کے بیچ دوستی۔ اور آپسی تعلقات میں اضافہ کا مستقل حصہ بن چکا ہے۔ دونوں ملکوں کے سربراہان کا ہر سفر اپنے آپ میں بہت اہم ہے لیکن ہمارے ملک کے جن حالات میں کامریڈ گورباچوف ہندوستان آ رہے ہیں اس میں یہ سفر خاص اہمیت رکھتی ہے۔

ہمارے ملک کی ایکتا اور یکجہتی پر جیسا خطرہ آج منڈلا رہا ہے ویسا آزادی کے وقت بٹوارے کے بعد سے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان اور سری لنکا جیسے پڑوسی ملکوں کے حکمراں ہندوستان میں انتشار پھیلانے میں امریکی سامراج وادیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت واشنگٹن کو خوش کرنے کے لئے اپنی پالیسیوں میں چاہے جتنی بھی نرمی برتے، سچائی یہ ہے کہ ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے پاکستان کو جدید ہتھیاروں سے لیس کرنے کی امریکی پالیسی میں ذرا بھی نرمی نہیں آئی ہے پاکستان نیوکلیر بم بنانے کی طرف بڑھ رہا ہے پھر بھی اسے ہتھیار دیتے ہیں۔ صدر ریگن کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہندوستان، امریکہ، برطانیہ، کناڈا وغیرہ ملکوں سے تعلقات سنوارنے کے چاہئے جتنی بھی کوشش کرے، سچائی یہ ہے کہ یہ ملک پنجاب کے انتہاپسندوں کا فنڈ، مقام، اور دولت، ہتھیار، ٹریننگ، اور سازشوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان تو انتہاپسندوں کا خاص مورچہ بنا ہوا ہے ہی۔ جنرل ضیا ایسی نشاندہی کر رہے ہیں کہ ہند و پاک جنگ ممکن ہے اور پاکستان میں ایسا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے کہ جیسے لڑائی ہونے ہی والی ہے۔

ان حالات میں کامریڈ گورباچوف ہندوستان آ رہے ہیں حکومت کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ بات چیت کے آخر میں کئی سمجھوتوں پر دستخط ہوں گے۔ ایک پریس ریلیز جاری کیا جائے گا ایک مشترکہ بیان جاری ہوگا۔ یقیناً یہ دستاویز ہمارے ملک کی اقتصادی مسائل کے حل، اور ہماری آزادی۔ اتحاد اور یکجہتی کی حفاظت کے لئے اہم ہوں گے۔ لیکن ہندوستان اور روس کے بیچ آپسی تعلقات کی اہمیت صرف دونوں ممالک کے فائدہ تک ہی محدود نہیں ہے یہ تعلقات پورے ایشیا میں بلکہ پوری دنیا میں امن کا پیغام ہے آج جبکہ ریگن کے اڑیل رخ کی وجہ کر پوری دنیا پر نیوکلیائی جنگ کا بھیانک خطرہ منڈرا رہا ہے امن کے مجاہد کامریڈ میخائیل گورباچوف کا ہندوستان آمد اور دو امن پسند ملکوں کے بیچ اعلیٰ سطحی بات چیت پوری دنیا میں امن کی حفاظت کی کوششوں کی ایک کڑی ثابت ہوگی۔

نیوکلیائی ہتھیاروں کے آج کے دور میں جنگ سے دنیا کی کسی بھی مسائل کے حل کی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ مختلف سماجی انتظام والے ممالک کے بیچ باہمی تعلقات آج صرف اہم نہیں بلکہ ضروری ہو گیا ہے۔ ہند سوویت تعلقات اس نظریے سے ایک نمونہ بن گیا ہے کامریڈ گورباچوف کی آمد سے اس نمونے میں اور نکھار آئے گا۔ لیکن ہندوستان کے لوگوں کے لئے یہ صرف کسی ہمجولی لیڈر کا سرکاری دورہ ہی نہیں۔ ہند سوویت دوستی سرکاری دائرے کو پار کر کے دو ملکوں کے عوام کے بیچ کی دوستی بن گئی ہے اس دوستی کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے جس کی شروعات ہماری آزادی کی لڑائی میں ہوئی ہمارے ملک کی آزادی کے بعد بھی مشکلوں یا بحرانوں کی گھڑیوں میں یہ دوستی کھری اتری ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو یاد ہے کہ سامراج وادیوں کے ذریعہ پیدا کئے گئے مشکلوں اور خطروں میں روس نے ہندوستان کا ساتھ دیا ہے۔ اسی لئے وہ کامریڈ گورباچوف کی آمد کو ہندوستان کے عوام کے ایک سچے دوست کی آمد مانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ یہ موقع دو ملکوں کے بیچ دوستانہ تعلقات کو ایک نئی بلندی سے ہم آہنگ کرے گا۔

کامریڈ گورباچوف ——— خوش آمدید

کامریڈ گورباچوف ——— زندہ باد

[illegible]

قاضی عبدالودود اور میں

تحریر کس طرح قاری کے دل و دماغ میں غلط فہمی پیدا کر دیتی ہے اس کی ایک المیہ مثال میرا اور قاضی عبدالودود مرحوم کا معاملہ ہے میں نے ہمیشہ ان کے علم و فضل، تحقیقی حزم و احتیاط، معروضیت اور اخلاقی جرأت کی داد دی اپنا ڈی لٹ کا مقالہ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" ۱۹۶۹ء میں ان الفاظ کے ساتھ ان کے نام معنون کیا:

"احتیاط اور عقیدت کے ساتھ اس صحیفۂ اغلاط کو اردو کے عظیم محقق قاضی عبدالودود بار ایٹ لا کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں"

۱۹۷۲ء میں میں نے غالب کے غیر متداول کلام کی شرح "تفسیر غالب" کے نام سے شائع کی۔ قاضی صاحب کو ایک جلد بھیجی۔ ۱۹۷۳ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی نے اس پر ۱۹۷۳ء کا غالب انعام دیا۔ یہ غالب انعامات کا پہلا سلسلہ تھا جس میں میرے علاوہ کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالستار شریک تھے۔ اداروں اور اکیڈمیوں کے انعامات کا فیصلہ یوں تو کوئی کمیٹی کرتی ہے لیکن بسا اوقات یہ قدردانی کسی ایک شخص کے طفیل ہوتی ہے۔ علم و استحقاق ایک سے زیادہ شخصوں میں پایا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی ترقی ہی کسی کے نام قرعۂ فال نکلواتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے غالب انعام دلانے کی ذمہ داری انعام کمیٹی کے صدر قاضی عبدالودود کی ہے۔ ایسے میں میں کیونکر محسن کش احسان فراموش بن سکتا ہوں۔

رسالہ "معاصر" پٹنہ نے قاضی عبدالودود نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ رشید حسن خاں، اور کلیم الدین احمد کے تقاضا کے سبب میں نے مضمون لکھنے کی ہامی بھر لی۔ اور نہایت محنت کر کے ایک مفصل مضمون "بہت مشکل تحقیق" لکھ بھیجا جو معاصر کے عبدالودود نمبر اگست ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ قاضی صاحب کی تحریروں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نڈر ہو کر دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں لکھا:

"قاضی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے مفصل لکھا کہ اعتراض کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں قاضی صاحب کے علم و فضل کو تسلیم کرنے، ان کی نگارشات کی بلندیوں کو ماننے اور ان سے عقیدت رکھنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں۔ ان کے ذاتی احسان بھی ہیں لیکن چونکہ وہ اپنی بزرگی اور اپنے نہایت وسیع القلبی اور شفقت کے سبب اعتراضات کی اجازت دیتے ہیں اس لئے میں آئندہ سطور میں تصویر کے دونوں رخ دکھانے میں تامل نہ کروں گا۔ تاہم کہیں کہیں میں گستاخی کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو بیٹھوں۔"

میرے مضمون کا [illegible] تو قاضی صاحب کی تعریف و تحسین کا تھا۔ لیکن ضمناً ان کے اسلوب تحریر پر اعتراض بھی کئے گئے۔ جن میں کہیں کہیں [illegible] کے اقتباسات سے [illegible]۔

" وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے، اردو دنیا میں جو نام بڑا طمطراق رکھتے ہیں قاضی صاحب جب ان کا قیا
لو بیچ پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طفل مکتب سے بہتر نہ تھے،، (ص ۶۶)

"تنہا قاضی صاحب کی شخصیت کی ہیبت نے محققین کو جس عزم و احتیاط پر مجبور کیا، اتنا دوسرے سب مل کر بھی نہ کر سکے، تحقیق کے فن اور روایت کے لئے قاضی صاحب کی یہ بہت بڑی خدمت ہے۔ (ص ۶۲)

" مسعود صاحب جیسے محقق کی تحریر میں اضافہ یا ترمیم کرنا کھیل نہیں، لیکن قاضی صاحب اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں،، (ص ۷۱)

ذکر میر کے سلسلے میں": قاضی صاحب نے مولوی صاحب کی تاریخ سے متعلق ۳۶ غلط فہمیوں کی نشاندہی بھی کی۔ قاضی صاحب اس میدان کے ماہر ٹھہرے۔ (ص ۷۷)

"زرد دشتی و دساتیری مذہبی ادب اور زبان سے غالب کی واقفیت جتنی ناقص تھی قاضی صاحب کی اتنی ہی مکمل ہے، (ص ۸۸ - ۸۷)

"قاضی صاحب نے ...... ایک ایک دعوے کی دلیل کے طور پر فارسی ادبیات سے اسناد کا جو انبار لگا دیا ہے اسے دیکھ کر عش عش کرنا پڑتا ہے،، (ص ۸۸)

" مجھے قاضی صاحب سے عقیدت ہی عقیدت ہے تحقیق کی صحت اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے وہ بے مثال محقق ہیں اس لئے میں نے اپنی مثنوی کی کتاب ان کے نام معنون کی ہے گذشتہ صفحات میں ان کے انداز بیان کی تنقید کر کے میں ایک گناہ کا مرتکب ہوا ہوں لیکن میں اپنے دل کے درد و سوز کو ظاہر کیا چاہتا ہوں" (ص ۱۱۸)

"قاضی صاحب نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزار دی۔ انہوں نے اس کے علاوہ اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا،، (ص ۱۱۸)

"اس تبحر علمی، اس مطالعے اور ایسی نظر والی شخصیت قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں" (ص ۱۱۹)

"میں صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بدولت بھی ان کا نام زندہ رہے گا...۔ قاضی صاحب صدق کی جس سختی سے نگہداشت اور وکالت کرتے ہیں، ویسا ان سے پہلے اور اس زمانے میں کوئی اور نہ کر سکا۔ انہوں نے بڑی جرأت اور محنت کے ساتھ جھوٹ کا پردہ چاک کر کے حق کی دریافت کی۔ وہ محض بت شکن ہی نہیں حق پرست بھی ہیں۔ خدا انہیں درازیٔ عمر و صحت دے کہ وہ عرصے تک ہماری رہنمائی کرتے رہیں،، (ص ۱۱۹)

مجھے دور دور تک شک و گمان نہ تھا کہ جو شخص تمام عمر دوسروں پر طنز کے ساتھ اعتراض کرتا رہا وہ اپنے اوپر چند معمولی سے اعتراضات بھی برداشت نہ کر سکے گا دراصل اپنے اوپر اعتراض اور اپنی غلطیوں کی نشاندہی کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے لئے بہت بڑا دل چاہئے جو جیسے لوگ کم ہوتے ہیں جس سے تقریباً ایک درجن حضرات کے اعتراضات کا تحمل [illegible] کے ساتھ رہے، بعض اوقات بہت اچھے تعلقات برقرار رکھے میری تمام مروت و شائستگی، عقیدت اور ارادت کو نظرانداز کر کے قاضی صاحب مجھ سے سخت ناراض ہوئے۔ اس کا پہلا اظہار اس مضمون سے ہوا کہ [illegible]

ایک دوسری طرح پر تبصرے کی شکل میں ہوا۔ تاہم ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے واقعے کی تفصیل پہلے بیان کرتا ہوں۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں غالباً ۱۹۸۳ء میں منعقد ہوئی۔ مجھ ننگ المحققین نے شعبۂ تحقیق کی صدارت کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی نے کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ رہبرِ تحقیق کے نام سے شائع کیا۔ اس میں میرا خطبۂ صدارت بھی تھا۔ قاضی صاحب نے خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ کے پہلے شمارے بابت ۱۹۸۶ء میں اس پر تبصرہ کیا۔ مجھے اس تبصرے کا علم ۱۹۹۰ء میں ہی ہو سکا۔ انہوں نے میرے خطبے کے دو اقتباس دے کر ان پر جو تعریض کی وہ حسب ذیل ہے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا سوال ہے میں اس احساس برتری سے محروم ہوں کہ رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر نور السعید اختر، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور ان جیسے دوسرے حضرات کی تحقیقات کو نظر انداز کرسکوں۔ اس سے رشید حسن خاں وغیرہ کی جو توہین ہوتی ہے ممکن ہے کہ انہیں اپنی "برتری" کی طرح اس کا احساس نہ ہو کہ وہ جن کی تعریف کرنا چاہتے ہیں ان کے الفاظ سے ان کی توہین ہو رہی ہے۔ ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اس کی جگہ یہ لکھا جا سکتا تھا رشید حسن خاں وغیرہ کی تحقیقات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔"

مجھے "تحقیقات کو نظر انداز کرسکوں" اور "تحقیقات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتیں" کا فرق معلوم نہیں۔ میں نے اپنے خطبے میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا نام شامل نہیں کیا تھا۔ خطبہ چھپواتے وقت شعبے کی طرف سے کسی نے الحاق کر دیا۔ خطبہ پڑھتے وقت میں نے سندیلوی صاحب کا نام حذف کرکے ڈاکٹر ابو محمد سحر کا نام کا اضافہ کیا لیکن رہبرِ تحقیق میں خطبہ سندیلوی صاحب کے نام کے ساتھ چھپا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے الفاظ سے رشید حسن خاں اور دوسروں کی توہین کیونکر ہوتی ہے۔ کیا قاضی صاحب ان میں سے بعض ناموں کے شمول کو بقیہ کی توہین سمجھتے تھے۔ میں نے ان ناموں کے بیچ کوئی درجہ بندی تو نہیں کی تھی۔

قاضی صاحب اسی تبصرے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہی صاحب صفحہ ۱۰ میں رقمطراز ہیں: یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشاندہی میں احساس برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کوئی جان کر نہیں کرتا۔ اغلاط کی طرف ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو اس سے اصلاح ہوگی۔ چبھتے ہوئے الفاظ میں وہی بات کہی گئی تو شاید وہ چڑ کر اپنی بات پر اڑ جائے گا۔ گویا انشائیہ کا حق تو ادا ہو جائے گا لیکن تحقیق کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تحقیقی بحث میں ذاتی حملے نہ کئے جائیں۔ دشتِ تحقیق کو انشا و منطق کے معرکوں کا میدان نہ بنائیے۔"

مگر کوئی اس شعور سے یہ عمل کرنا چاہے تو کتاب خواہ اغلاط فاحش سے کتنی ہی مملو کیوں نہ ہو، اس پر تبصرہ کا انداز کچھ اس طرح ہو: جناب والا کو نہایت ادب سے اطلاع دی جاتی ہے کہ جناب والا کی کتاب ... میں بکثرت اغلاط فاحش نظر آتی ہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جناب والا سے یہ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں۔ کاپی نویس یا تصحیح کا کام جن صاحب کے سپرد ہوا تھا کثرت مشاغل کی وجہ سے وہ اس کے لئے کافی وقت نہ نکال سکے۔ جناب والا اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ اس ملک میں

حاشیوں کی کمی نہیں وہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور چھاپے کی غلطیوں کو لکھنے والے کی غلطیاں قرار دینے میں انہیں مطلق تامل نہیں ہوتا۔ احقر کا باادب مشورہ ہے کہ آئندہ تصحیح کا کام ایسے لوگوں کے سپرد ہو جو اس کے لئے وقت نکال سکیں۔

مضمون نگار نے شاید شوپنہار کا یہ قول نہیں سنا کہ بڑوں کو برا کہنا اچھوں کے ساتھ زیادتی ہے اور بظاہر وہ اس سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ میتھو آرنلڈ نے انگلستان کا المانیہ و فرانس سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان دونوں ممالک میں علمی مباحث کی سطح انگلستان سے اس لئے بلند تر ہے کہ وہاں مقابلتاً سخت گیری زیادہ ہوتی ہے، ہندوستان میں نرمی کی نہیں سختی کی ضرورت ہے بلکہ بہتوں سے طنزیہ الفاظ میں نہیں صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں، آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہئے۔ بہتوں کا دماغ جھوٹی تعریف نے خراب کر دیا ہے۔ وہ محققین کی صف نعال میں بیٹھنے کا حق نہیں رکھتے لیکن وہ اپنے کو صف اولین میں ایک ممتاز جگہ کا سزاوار سمجھتے ہیں، ایسے لوگ اپنی اصلاح کیا کریں گے؟ کتنے ہی نرم الفاظ میں اغلاط کی نشاندہی کیوں نہ ہوں۔ وہ معترض کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

مضمون نگار سے میری گذارش ہے کہ میرے مقالے متعلق مصحفی و انشا، (شائع کردہ اردو ادب) کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی ایک شخص کا بھی نام بتائیں جس نے دشت تحقیق کو انشاء و مصحفی کے معرکے کا میدان بنا دیا ہے۔

۱؎ انشائیہ سے کیا مراد ہے؟ اور طنز و تمسخر سے کس طرح اس کا حق ادا ہوتا ہے۔
۲؎ خبط نہیں، نوحت کا محل ہے۔ مگر ممکن ہے چھاپے کی غلطی ہو۔"

(جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۷۷، ص ۲۳۹ - ۲۴۸)

یہ طویل اقتباس ڈاکٹر عابد پیشاوری نے ۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کو خط میں لکھ کر بھیجا۔ انشائیہ کی بات میں نے یونہی لکھی تھی کہ طنز و تعریض سے پھیکی عبارت چٹپٹی اور گرما گرم ہو جاتی ہے۔ جس سے بے رنگ تحقیقی تحریر میں ایک طرح کا انشائیہ پن آ جاتا ہے۔ آج کل میں تحقیق کے فن پر میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں طریق تحقیق پر انگریزی کی کچھ کتابیں نظر سے گذریں۔ میری رائے میں انگریزی میں اس موضوع پر بہترین کتاب HE CRICHAE AL TICB ART OF LITERRRY RESERAN ہے میرے سامنے اس کا ۱۹۶۲ء کا ایڈیشن ہے اس کے دو بیانات خلاصہ یہ ہے۔

"اپنی حقیقت کو بھی پہچانیے، ہم فانی گوشت کے بنے ہوئے ہیں ہم سے تھوڑی سی غلطی تو ہوگی ہی، مکمل پارسائی سے باہر ہے" ص ۱۶-۱۷

"غیر معتدل تنقید نہ کیجئے۔ غلطیاں ہونگی ہی، کسی کی علمی اہمیت پر طنز نہ کیجئے" ص ۸۰

دوسری بہت اچھی کتاب جارج واٹسن کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"مقالے میں بحث و مباحثہ ہوتا ہے دوسرے اسکالر سے خلوص کے ساتھ عدم اتفاق کیجئے لیکن دوسرے کم اہم مصنفین کی بھی سنئے۔

طنز سے کام نہ لیجیے اور جانبداری سے لکھیے۔ (واٹسن)

”دوسروں کی غلطیاں تحمل کے ساتھ بیان کیجیے“ (پارسنس)

”میں نے کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا کہ غلطیوں کی نشان دہی عالمانہ الفاظ میں کی جاتی ہیں کسی کو یہ فتویٰ نہیں دو کہ
کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں۔ کون جانے کہ آگے چل کر یہی کوئی مفید تحقیقی معلومات فراہم کر سکے۔
جہاں تک انشا و مصحفی کے معرکوں کا تعلق ہے، تحقیق میں اعتراضات اور جواب و جواب الجواب کا کوئی نہیں
میں اپنے زمانے کا نام نہیں لوں گا۔ جہاں تحقیقی اعتراضات میں ذاتیات پر حملے کئے گئے ہیں۔ ماضی میں غالب
کا قاطع برہان کا معرکہ یاد کیجیے۔ کیا وہاں تحقیق میں طنز، ہجو اور ذاتیات شامل نہ تھیں۔ صفیر بلگرامی
سخن اور شاد کے یہاں بھی یہی انداز تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اقبال اور نگار النسیم میں علمی بحثوں
کو جھگڑے کے لہجے میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا گیا تھا؟

میں نے اپنے مضمون میں اعتراض کیا تھا کہ قاضی صاحب کی کتابیں ان کے زیر اہتمام، ان کے شہر میں
چھپتی ہیں لیکن ان میں اغلاط طباعت کی تصحیح نہیں کی جاتی۔ آخر میں غلط نامہ لازماً لگایا جاتا ہے۔ قاطع
برہان و رسائل متعلقہ کی تصحیح مالک رام اور رشید حسن خاں نے کی تو یہ جلد غلط نامے سے مبرا ہے۔ انہیں
اس باب میں مالک رام سے سبق لینا چاہیے جن کی مرتبہ کتابوں میں نہ غلطی ہوتی ہے نہ غلط نامہ۔“

(حقائق ص ۳۸)

مالک رام صاحب سے ان کا دل صاف نہ تھا ماضی میں عبد الصمد استاد غالب کے معاملے میں دونوں میں اختلاف ہو
چکا ہے۔ میری تحریر میں مالک رام صاحب سے سبق لینے کی بات انہیں ناگوار گزری۔ میں فروری [illegible] میں پٹنہ گیا میری حماقت
بلکہ حماقت دیکھیے کہ میں ان کے گھر ان سے ملنے چلا گیا۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا

مجھے گمان نہ تھا کہ قاضی صاحب میرے مضمون سے ناراض ہوں گے۔ مجھے خدا بخش جرنل میں ان کے تبصرے کا بھی علم نہ تھا۔ میں
نے کہا کہ میرے مضمون میں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ انہوں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ صرف ایک
شکایت کی کہ آپ نے لکھا ہے کہ مالک رام کی تصحیح کردہ قاطع برہان اور رسائل متعلقہ میں اغلاط کتابت نہیں۔ حالانکہ اس
میں صراحت کر دی گئی ہے کہ غلط نامہ دوسری جلد میں دیا جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے نہیں دیکھا الہ آباد لوٹ کر

---

(1) GEORGE WATSON, "THE LITERARY THESIS" – A GUIDE TO RESEARCH (LONGMAN, LONDON, 1st. ED. 1970) P-35

(2) ROBERT ROSS, RESEARCH, AN INTRODUCTION (N. YORK, LONDON 1ST. ED 1974) P. 233

(3) C.V. PARSONS, THESIS AND PROJECT WORKS – A GUIDE TO RESEARCH AND WRITING (LONDON, 1973) P. 36

دیکھ لوں گا۔ واپس آ کر میں نے لائبریری میں وہ کتاب دیکھی۔ واقعی اس میں تحریر تھا کہ اغلاط کی تصحیح دوسری جلد میں دی جائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دوسری جلد جو حواشی وغیرہ پر مشتمل ہوتی۔ آج تک (شائع نہیں ہوئی) میں نے قاضی صاحب کو خط لکھا کہ آپ درست فرماتے ہیں۔ مجھ سے سہو ہوا۔ مارچ [illegible] میں کالی داس گپتا رضا پٹنہ گئے تو ان سے قاضی عبد الودود نے شکایت کی۔ ڈاکٹر عمیر ورما لون کے مضمون "رضا پٹنہ میں" مشمولہ "تناظر کالی داس گپتا رضا نمبر" بابت جون [illegible] کے صفحہ ۱۴۳ پر یوں ہے:

"قاضی صاحب نے ڈاکٹر گیان چند جین کا ذکر ان کے مضمون بت شکن محقق کے سلسلے میں چھیڑ دیا کہ نہ جانے ڈاکٹر جین کو مجھ سے کیا دشمنی ہے جو اس طرح لکھا اگر ان کو کسی دعوے کی صحت میں شک ہے تو اسے پیش کریں۔ اسناد کی کثرت پر اعتراض ہے اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ غالب کا مطالعہ کس قدر قلیل ہے مگر رضا صاحب نے ڈاکٹر گیان چند کو اچھے طریقے سے DEFEND کیا۔"

مجھے کالی داس گپتا رضا نے لکھا یا ملاقات میں بتایا کہ پٹنہ میں قاضی صاحب پوچھتے تھے بھائی یہ ڈاکٹر گیان چند کیوں میرے دشمن ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے لائف ممبر کیوں نہیں بنے۔ حالانکہ ہمارا قاعدہ ہے کہ جسے غالب انعام دیتے ہیں اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ لائف ممبر بنے گا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کسی نے مجھ سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائف ممبری کے لئے نہیں کہا تھا۔ مجھے یہ قاعدہ معلوم نہ تھا کہ پانچ سو روپے دے کر لائف ممبر بنا جاتا ہے۔ اس طرف میرے توجہ نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ میں دو وجوہ سے غالب انسٹی ٹیوٹ سے مطمئن نہ تھا۔

(۱) اپنی زندگی میں قاضی عبد الودود غالب انسٹی ٹیوٹ کے مختار کل تھے۔ جب فخر الدین علی احمد کے صدر جمہوریہ بننے کا اعلان ہو گیا تو میں دلی میں قاضی صاحب سے ملنے گیا وہ کسی سے ذکر کر رہے تھے کہ اب انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری کسے بنایا جائے۔ انہوں نے ایک وزیر کا نام لیا۔ اب انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری مجھے اعتراض ہے کہ انسٹی ٹیوٹ پر اہل سیاست اور اہل اقتدار کیوں مسلط کئے جاتے رہے۔ افخر ادبی وزراء سے آگے سوچ کر کسی اہل علم پر ان کی نظر کیوں نہیں پڑی۔

(۲) چاہیے تھا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر کوئی ماہر غالبیات ہوتا۔ اگر غالبیات کا ماہر نہ بھی ہوتا تو کوئی بڑا محقق یا نقاد ہوتا۔ قاضی صاحب کا معیار کیا تھا یہ تو ان کے انتخابات سے ظاہر ہے۔ دلی میں مالک رام تھے۔ اگر انہیں ڈائرکٹر بنایا جاتا تو ادارے کا وقار بڑھتا۔ وہ کچھ کر گذرتا۔ پھر نثار احمد فاروقی تھے رشید حسن خاں تھے ماہر بھی کئی قابل قدر حضرات تھے لیکن قاضی صاحب کے دور میں اور ان کے بعد بھی کبھی اس انسٹی ٹیوٹ کا ایسا ڈائرکٹر نہ ملا جو غالبیات، یا تحقیق یا تنقید کی دنیا میں کوئی مقام رکھتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اس ادارے سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ قاضی صاحب کا اعتراض سنا میں فوراً پانچ سو روپے کا چیک بھیج دیا۔ اور اس کا لائف ممبر ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ لائف ممبری کے کیا معنی ہیں۔ میرے پاس ادارے کا رسالہ غالب نمبر ۲۱ آتا تھا۔ حنیف احمد نقوی کا ایک مضمون کسی شمارے میں شائع ہوا۔ میں نے ادارے کو لکھا کہ وہ شمارہ مجھے بھیج دیں۔ جواب ملا حسب ورش قائم مقام ڈائرکٹر کا خط آیا کہ آپ کو شمارہ وی پی سے بھیجا جا سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ اپنے شمارے اور وی پی اپنے پاس ہی رکھیں۔

اللہ تعالیٰ میرا قیام اپنی مرحوم بہن کے یہاں وسنت نگر (جو آج کل نور وجی نگر کہلاتا ہے) میں تھا جو قاضی صاحب کی قیام گاہ سے کم از کم ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ کیا صبح چھ بجے؟ جواب ملا جی ہاں! چھ بجے وقت طے ہوگیا۔

دوسرے دن صبح چھ بجے نور الدین احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ واقعی ایک مسئلہ تھا۔ بہرحال میں ٹھیک صبح چھ بجے بھاگ دوڑ کر بس سے اترا۔ ایک خاکروب سے معلوم ہوا کہ جہاں میں کھڑا ہوں وہی کوٹھی نمبر ۱ ہے۔ بہت بڑا لان لانگ کر برآمدے تک پہنچا اور گھنٹی بجائی۔ دس منٹ کی مسلسل گھنٹی نوازی کے بعد ایک چپراسی نما چیز نمودار ہوئی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ اندر گیا اور کوئی دس منٹ بعد پھر برآمد ہوا۔ "کارڈ دیجئے"۔ اب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اگر اردو میں تحقیق کرنا ہو تو وزٹنگ کارڈ چھپوانا بھی ضروری ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی خوب صورت ڈائری تھی۔ جو میرے بڑے بھائی نے تحفتاً مجھے دی تھی اسی میں سے ایک کارڈ نما ورق کا ٹکڑا پھاڑ کر عابد پیشاوری لکھ دیا۔ چپراسی فوراً واپس آیا اور کہا کہ صاحب باتھ روم میں ہیں انتظار کیجئے۔ اب انتظار کرنے کے لئے وہاں یا تو کھڑے رہئے اور یا بہت چاہئے تو ٹہلتے رہئے۔ (موسم غالباً سردیوں کا تھا) ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یعنی ساڑھے سات بجے (اس سے پہلے کہ بیس پچیس منٹ منہا کر کے ایک گھنٹہ سمجھ لیجئے) بلاوا آیا[1]

ڈرائنگ روم میں ایک چارپائی درمیان میں بچھی تھی جس پر قاضی صاحب تشریف رکھتے تھے۔ اور میرے دائیں طرف ایک کونے میں ایک پلنگڑی سی پہ نور الدین کوئی کمبل وغیرہ لپیٹے پڑے تھے۔ صرف منہ کھلا تھا۔ بیٹھنے کے لئے کہا گیا اور میں سکڑ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ گفتگو کس طرح شروع ہوئی ٹھیک سے یاد نہیں مگر اس سے میں نے اس وقت یہ اندازہ لگایا تھا کہ میرے نام کے ساتھ پیشاوری دیکھ کر قاضی صاحب یہ سمجھتے تھے کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ بہرحال بات شروع ہوتے ہی میں نے عرض کیا کہ چھ ماہ پہلے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا جس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ فرمایا، "جی ہاں میں نے سوچا میں دلی جا ہی رہا ہوں وہاں آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔" (جیسے اخبار میں آپ نے آنے کی خبر چھپوا دی ہو)

"اچھا آپ انشاء پر کام کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"آپ انشاء پر کیا کام کریں گے؟"

"جی ابھی سے کیا کہہ سکتا ہوں، ابھی تو کام شروع بھی نہیں کیا، آپ کے پاس تو اسی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔"

"آپ انشاء پر کیا جانتے ہیں؟"

"جی کچھ نہیں، ابھی تو اس میدان میں قدم ہی رکھا ہے۔"

"یہ سارا دور میرا ہے، میں نے اس پر بیس سال لگائے ہیں۔"

"جی۔"

"کل میں کتاب لکھوں تو کیا یہ لکھوں کہ میں نے یہ تم سے لیا ہے۔"

---

[1] تناظر کالی داس گپتا رضا نمبر میں ڈاکٹر عمیرہ خاتون لکھتی ہیں، قاضی صاحب وقت کی پابندی کے بہت ہی سخت واقع ہوئے تھے۔ ص ۲۰۰

مسعود صاحب دو صفوں ادیبوں میں پاس داری مروت سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لئے اگر وہ فوراً تھے کہ دیگر مسلمان ہوگئے تھے تو تعجب کا کیا ذکر نہیں، یہ سوال ہے کہ دیگر مسلمان ہوگئے تھے یا نہیں؟ مذہبی مسائل سے نہیں، مگر اسے کیا کیجئے کہ کنگ ارنسیم کی بحث مذہبی مسئلہ بن گئی تھی۔ بدقسمتی سے مغربی تعلیم کا اس ملک پر جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔

یاد نہیں کہ میں نے آپ کو کبھی لکھا ہے یا نہیں کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا اور یہ بالاعلان کہتا ہوں ــ

"

رضا صاحب نے جو آخری فقرہ نہیں لکھا وہ بالیقین یہی ہے ”میں مسلمان نہیں ہوں“ رسالہ معاصر شمارہ ۳۷ بابت ۱۹۸۲ء میں قاضی صاحب نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا ہے

”میں لا مذہب ہوں مذہبی آدمی ہونے کا تو سوال ہی نہیں“ ص ۱۶

میں ایسے عقل پرست کو کیونکر فرقہ پرست سمجھ سکتا تھا؟

اس پس منظر کے ساتھ معاصر کا شمارہ ۳۷ بابت ۱۹۸۲ء آیا۔ اس میں قاضی عبدالودود نے ایک طویل مضمون لکھا ”معاصر قاضی عبدالودود نمبر“۔ اول تو یہی بات غلط ہے کہ جس شخص کے بارے میں رسالے کا خاص نمبر نکلے یا جسے یادگاری جلد پیش کی جائے وہی اس پر تبصرہ کرے، دوسرے یہ کہ اس جائزے میں قاضی صاحب نے اپنا رنگ برقرار رکھا۔ ان کا رنگ کیا ہے؟، ڈاکٹر محمد حسین نے اپنے مضمون میں لکھا تھا

”قاضی عبدالودود کی نظر و فکر کسی کی استقامت یا وجاہت نہ دیکھ سکی، واحد تا بتحریر ہو یا تکلم وہ آج تک کسی فرد کو تعریف و تحسین کے دو جملے نہیں دے سکے“ ص ۲۲۲

قاضی صاحب نے اپنے جائزے میں کسی مضمون کی کسی خوبی کا ذکر نہیں کیا۔ کسی کے بارے میں شکریہ کا ایک لفظ نہیں کہا۔ مضمون نگاروں نے جس مبالغہ کے ساتھ ان کی تحسین کا حق کسی کے لئے اخلاقاً یہ نہیں کہا کہ وہ ان الفاظ کے مستحق نہیں۔ جائزے میں محض خردہ گیری سے سروکار رکھا۔ ہر ایک کی شکایت کی، افسوس ہے کہ انہوں نے جس غیر علمی لہجے سے کام لیا وہ ان کی علمی حیثیت پر ایک داغ ہے۔ میرے بارے میں جو گل فشانی کی اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ ملاحظہ کیجئے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ علمی بحثیں کس زبان میں ہوتی ہیں۔

”ڈاکٹر گیان چند جین صفحہ ۹۴ تا ۱۱۹ کے مقالے کا عنوان بت شکن محقق ہے وہ خود اپنا نام حق شکن بت رکھ لیں تو ناموزوں نہ ہوگا حق شکنی اس لئے کہ وہ حق شکنی کی کوشش کرتے ہیں، بت اس لئے کہ بت خاموش رہتا ہے۔ ڈاکٹر جین خاموش نہیں رہتے لیکن وہ کتنا ہی طول کلام سے کام لیں، نتیجہ وہی ہوتا ہے جو خاموشی سے ہوتا ہے“ ص ۱۱

گویا انہوں نے خود کو حق کا مجسمہ قرار دیدیا۔ جو ان پر تنقید کرے وہ حق شکن ہے میرے بارے میں بت کی پھبتی یا تشبیہ کو وہ نباہ نہ سکے، بت خاموش رہتا ہے اور میں ان کے بقول طول کلام سے کام لیتا ہوں۔ پھر مجھ میں بت کا لازمی وصف تو موجود ہی نہیں۔

دوسرے حصے میں میرے اسی خط کا ذکر ہے جو میں نے پٹنہ سے واپسی کے بعد انہیں لکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اس میں

[illegible] کیا

میرے متعلق ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اتنی غلط باتیں لکھی ہیں ، سب کی تردید کی جائے تو یہ بہت جگہ لے گی میں
مجملاً لکھتا ہوں کہ ان کی کوئی بھی بات جب تک میں اس کی تصدیق نہ کروں یا معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق نہ ہو
قبول نہ کی جائے ،، ص ۱۱

ڈاکٹر محمد حسین کے بارے میں لکھتے ہیں

" ڈاکٹر محمد حسین (ص ۲۳۲ تا ۲۵۰) حسین واحد نہیں تثنیہ ہے وہ بظاہر ایک لیکن دراصل دو ہیں ۔
ایک حسین وہ جو اسے مقالہ (داستانی اور دوسرے مقالات) میں نظر آتا ہے دوسرا وہ جو پی ایچ ڈی کی
سند حاصل کرنے کے بعد ایک یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہے اور کچھ تعجب نہیں اگر یہ پروفیسر بھی ہو
جائے ،، ص ۱۷

" ڈاکٹر محمد حسین کے مقالے میں اور بہت کچھ ہے جو صحیح نہیں ، کہاں تک تصحیح کروں ، مختصر یہ ہے کہ وہ
کوئی بات میرے متعلق کہیں تو جب تک میں اس کی تصدیق نہ کروں ...... اسے قبول نہ کیا جائے " ص ۲۲

گویا انھوں نے یہ اصول قائم کیا کہ کسی ادیب پر مضمون لکھا جائے تو اسی کی نگرانی میں لکھا جائے ۔ معاصر ۱۹۸۶ کے مضمون
قاضی صاحب ایک مغلوب الغضب انسان نظر آتے ہیں جو خود پر لکھنے والوں سے غیر مشروط مداحی کا مطالبہ کرتا ہے ۔ اگر کوئی اد
کی ۵۰ فیصد تعریف اور ۵۰ فیصد تنقید کرتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو کر بدزبانی پر اتر آتے ہیں ۔ رشید احمد صدیقی نے ایک
جگہ لکھا تھا کہ خواہ کیسا ہی PROVOCATION ہو ، تحریر میں شرافت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیجئے ۔ قاضی صاحب
[illegible] علمی لہجہ ان کے لئے ضعیفی اور بیماری ہی کی دین نہیں ، بہت پہلے بھی اس کے شرارے نظر آتے ہیں ۔

مالک رام نے غالب استاد عبدالصمد کا وجود خارجی تسلیم کیا ہے اس کے بارے میں حالی و شیفتہ کی تحریروں سے
شہادت دی تھی ۔ اس سلسلے میں فسانۂ غالب میں مالک رام لکھتے ہیں ؎

اس پر جناب قاضی صاحب استہزا اور طنز فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" افسوس کے ساتھ اگر وہ (یعنی مالک رام) یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات بھی کی تھی
تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا ،،

مجھے واقعی سخت حیرت ہے کہ انھوں نے ایک سنجیدہ گفتگو میں یہ لہجہ اختیار کیا ۔ یہ بحث ۱۹۵۶ کے قریب کی ہے [illegible]
میں ایک ملاقات میں میں نے مالک رام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ اپنا مرتبہ کلیات غالب فارسی کیوں نہیں شائع [illegible]
انھوں نے انکشاف کیا کہ ایک زمانہ ہوا قاضی عبدالودود ان کا مرتب کردہ مسودہ یہ کہہ کر لے گئے کہ وہ اسے شائع کر دیں
[illegible] نہیں شائع کیں ۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے ۔ دس سال بعد مسودہ اس شکل میں واپس کیا کہ اس کے بیچ
سے چالیس اوراق (یا صفحات) غائب تھے ۔ ستم یہ تھا کہ معذرت یا افسوس کا ایک لفظ نہ لکھا ۔ اب مالک رام صاحب
یہ ہمت نہیں کہ دوبارہ مآخذ فراہم کر کے از سر نو ان اوراق کو مکمل کریں ۔ اس طرح ان کے تقریباً عمر بھر کا کام یعنی کلیات غالب فارسی
کا کام [illegible] یہ کتاب کبھی شائع ہونے والی نہیں ۔ افسوس ۔
ایک محقق سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مخطوطات بالخصوص دوسروں کے مسودات کی دل و جان سے حفاظت کرے ۔

[illegible] عبدالصمد ، استاد غالب ، مشمولہ فسانۂ غالب [illegible] ص [illegible]

نہ کہ کمال بے نیازی سے اسے تلف کر دینے گا۔ مالک رام صاحب کا ظرف ہے کہ کسی تحریر میں اس ادبی غارت گری کا شکوہ نہیں کیا۔
ان کا قاضی صاحب کے لئے کیا رویہ ہے ملاحظہ ہو۔ ان کے میرے نام کے خط مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۸۳ء میں۔

"قاضی صاحب مرحوم اب اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اس عدالت عالیہ میں پہونچ چکے ہیں جہاں ہم سب کو زود یا بدیر جانا ہے ہم سب کو ان کی عاقبت بخیر کے لئے دعا کرنا چاہئے، میری یہ دعا ہے کہ خدائے برتر وکریم ان سے (اور ہم سب سے بھی) عفو وکرم کا سلوک کرے آمین۔"

گیتا رضا صاحب کے پاس ایک بیاض جبیل ہے جس میں وہ ادب کے شائقین سے عموماً اور ماہر غالبیات سے خصوصاً کچھ لکھا کر ان سے دستخط لے لیتے ہیں۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۹ء کو قاضی عبدالودود سے لکھایا، انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق لکھا۔

"غالب کے سینکڑوں اشعار مجھے پسند نہیں ان میں سے چند اس جگہ درج ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے گیارہ شعر لکھے، رضا صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ ان میں سے بیشتر اشعار اہل ذوق کو پسند ہیں، قاضی صاحب نے جواب دیا کہ "اس بات کا کیا کیا جائے کہ غالب کے جو بہت سے اشعار مجھے پسند ہیں۔ وہ اہل ذوق کو پسند نہیں۔"

یہ اشعار اور مکالمہ رضا صاحب نے اپنی کتاب غالبیات چند عنوانات (بمبئی ۱۹۸۲ء) میں صفحہ ۸۶ تا ۸۸ پر چھاپ دیے ہیں۔ قاضی صاحب نے یہ کتاب دیکھ کر اپنے مکتوب بنام رضا مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۸۲ء (۲۳ء چاہئے تھا سہواً ۸۲ء لکھ دیا) میں لکھا کہ یہ آپ نے کیا چھاپ دیا ہے۔ غالب کے یہ اشعار تو مجھے بہت پسند ہیں۔

"آپ کی جگہ آپ کے دوست گیان چند ہوتے تو سمجھتا کہ یہ ارادی کوشش مجھے بدنام کرنے کی ہے۔"

قاضی صاحب نے یہ خط ڈاکٹر حمیرہ خاتون کی معرفت بھیجا تھا۔ رضا صاحب نے ستمبر ۱۹۸۲ء کو حمیرہ خاتون کو لکھا۔

"قاضی صاحب قبلہ نے ڈاکٹر گیان چند کو طنزاً میرا دوست لکھا ہے یہ قطعی صحیح ہے کہ ڈاکٹر گیان چند میرے دوست ہیں مگر وہ قاضی صاحب کے بھی قطعاً خلاف نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا کوئی دوست قاضی صاحب قبلہ کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ ایک اور بات بھی بتا تا چلوں ڈاکٹر گیان چند نے مجھ پر دو مضمون لکھے ہیں اور دونوں میں مجھ پر خاصی نکتہ چینی کی ہے۔ میں نے اس کا برا نہیں مانا، اور مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے کوئی بات قاضی صاحب کے خلاف عداوت کی بنا پر نہیں لکھی ہوگی۔"

اس کے جواب میں حمیرہ خاتون نے ۱۷ ستمبر ۱۹۸۲ء کو رضا صاحب کو لکھا۔

"میں خط لے کر چچا (قاضی صاحب) کے پاس چلی گئی۔ پہلے خود پڑھ کر سنایا، پھر قاضی چچا کو پڑھنے کو دے دیا .... انہوں نے کہا .... جہاں تک گیان چند صاحب کی بات ہے اگر وہ علمی اعتراضات کرتے تو مجھے مطلق تکلیف نہ ہوتی لیکن ان کے اعتراضات معاندانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً غلط نامہ والی بات ....

بات یہ ہے کہ کچھ عمر کا تقاضا اور پھر بیماری مسلسل بیماری، چچا (قاضی صاحب) کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے، ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے۔"

اگر قاضی صاحب علمی اختلاف بھی ایسا کو سمجھتے ہوں جس میں کم از کم واقعاتی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہو تو دوسری بات ہے۔ وہ انداز تحریر، موضوع تحقیق اور طریق تحقیق کو خاصی شکست دینے کی علمی اعتراض ہے۔ میں نے اپنے مضمون کو

[illegible] سامنے پیش کیا

[illegible] صاحب کی ذات پر تو نکتہ چینی کی نہیں گئی۔ میرے اعتراضات یہ تھے۔

(۱) عیار ستان میں اصطلاحات کے تجزیہ والا باب بہت خلفشار ہے
(۲) کتاب میر تقی میر حیات اور شاعری پر ان کا تبصرہ دیکھنے کے بعد یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ
عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔
(۳) اقتدر سوزن میں سرورق پر سنہ طباعت ۱۹۶۵ء درج ہے اندر کے صفحے پر ۱۹۶۴ء
(۴) غالب بحیثیت محقق میں اسناد کی کثرت بعض اوقات غیر ضروری مشقت کے مترادف ہو گئی ہے۔
(۵) وہ بعض اوقات تن آسانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ حوالے نہیں دیتے۔ یا کمزور و ناکافی حوالے دیتے ہیں۔
(۶) اپنی سابقہ تحریروں کو بارہا کالعدم قرار دیدیتے ہیں۔ اصل تحریر دیکھنے والے کو کیونکر معلوم ہو کہ ان مضمون کی کون سی بات منسوخ کر دی ہے۔
(۷) ان کی تحریر میں بے ترتیبی ہوتی ہے۔ آج کل کے اردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء میں اصول تحقیق پر مقالہ لکھا تو ابتدا میں لکھ دیا چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں گی قلم بند کر دی جائیں گی " ان کے مضامین میں ایک منظم کلامی کا در و بست نہیں ہوتا۔ وہ ریزہ خیالی کی شکل پیش کرتے ہیں۔
(۸) تنقیدی شعور کی کمی کی وجہ سے غیر اہم موضوعات پر لکھ جاتے ہیں۔
(۹) دوسروں کی غلطی کی نشاندہی کرنے میں طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔
(۱۰) مرکبات کے اجزا کو ملا کر لکھتے ہیں۔ جبکہ ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات اس کے برعکس ہیں۔
(۱۱) تحریروں میں اودیا کر مخففات کا استعمال کرتے ہیں جن کی کنجی کسی مخصوص مقام پر نہیں دی ہوتی۔ ان کے مخففات اور علامات کی وجہ سے ان کی تحریر نہ صرف مبہم بلکہ مہمل جیسی معلوم ہونے لگتی ہے اسی لئے ان کے اختلاف نسخ اور غلط نامہ وغیرہ بیتال کے انداز میں ہوتے ہیں۔
(۱۲) کبھی کبھی شعر کو نثر کے ساتھ مسلسل لکھ دیتے ہیں، پیراگراف نہیں بناتے،
(۱۳) مضامین میں ان کی فہرست سازی کھتونی سازی کی انتہا ہوتی ہے
(۱۴) ان کے مضامین کی ابتدا اور خاتمہ یکایک ہوتے ہیں۔
(۱۵) ان کا اسلوب نامانوس قسم کا ہوتا ہے۔ جو چیخ چیخ کر پکارتا ہے " مجھے نہ پڑھو "
(۱۶) انہوں نے دوسروں کی غلطیاں نکالنے کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی اہم کام نہیں کیا۔

ان میں سے نمبر (۲) اور (۳) کتاب کے تحسینی پہلو سے سروکار رکھتے ہیں۔ بقیہ سب اسلوب تحقیق یا شاذ موضوع تحقیق سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کونسا اعتراض احمقانہ یا غیر علمی ہے بتا دیا جائے۔ یہ اس لئے غیر علمی دکھائی دیتے ہیں کیونکہ انہیں آئینہ دکھا دیا گیا ہے اور بہتوں کو آئینہ میں اپنا اصلی چہرہ اچھا نہیں معلوم ہوتا جیسے میں نے اپنے بارے میں یہ شعر کہا ہے

یہ کیا آئینہ ہے؟ جب بھی دیکھتا ہوں اسے
کوئی خبیث سا بڈھا دکھائی دیتا ہے

[illegible] ان کے بارے میں اپنی قدر پیمائی (ASSESSMENT) پیش کرتا ہوں۔

(۱) وہ اردو تحقیق کے عناصر خمسہ میں سے تھے۔ بقیہ چار ہیں حافظ محمود شیرانی، مسعود حسن رضوی، امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام۔

(۲) انہوں نے تحقیق میں جس حزم و احتیاط سے کام لیا ویسا کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ اسی طرح انہوں نے اردو تحقیق کو جتنا متاثر کیا ہے اتنا کسی دوسرے نے نہیں کیا۔ ہم ان کے تحقیقی فیصلوں پر جس اطمینان سے بھروسا کر سکتے ہیں۔ دوسروں کے فیصلوں پر اس قدر نہیں۔

(۳) ہندی کی ادبی تحقیق اردو تحقیق سے پیچھے ہے وجہ یہ ہے کہ وہاں کوئی قاضی عبدالودود پیدا نہیں ہوا۔

(۴) وہ تحقیق کے عالم تھے، تنقید میں نظر نہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے اہم اور غیر اہم میں تمیز نہ کر سکے۔ انہوں نے تدوین متن کے لئے قطعات دلدار، دیوان رضا وغیرہ کا انتخاب کیا۔ ہر بڑی لائبریری میں متعدد غیر مطبوعہ دواوین، مثنویاں اور داستانیں وغیرہ بھری پڑی ہوتی ہیں۔ اردو ادب کے مادی وسائل اور اردو محققوں کے ذہنی وسائل ان سب کی تدوین کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ انہیں غیر مطبوعہ متنوں کو اشاعت کے لئے ترجیح دی جائے جن کی اردو ادب کو زیادہ ضرورت ہے قاضی صاحب کی تدوین کے بعد بھی کل ہند نقشے میں دلدار اور رضا کو کون سا مقام مل سکا۔ انہوں نے مصحفی کے دیوان کیوں نہ مرتب کئے جس پر وہ تمام عمر تحقیق کرتے رہے۔

رسالہ معاصر پٹنہ شمارہ ۱۸ بابت جولائی ۱۹۶۲ء میں قاضی عبدالودود کی تحریر تعیین زمانہ شائع ہوئی۔ اس میں کثرت سے ایسے ادیبوں سے متعلق سنین کی (عموماً سن وفات) تعیین کی گئی ہے جن کی ادب میں کوئی اہمیت نہیں۔ مثلاً کہیں کہیں سے معلوم کر کے ذیل کے اصحاب کا سن وفات درج کیا ہے۔

مرزا محمد صالح آشفتہ، غلام یحییٰ الصاف، میر غلام علی اظہر، محمد علی خاں انجم، محمد فاضل آزادی احمد آبادی، آغا خاں ترک جنگ دیکھ، محمد واصل خاں کشمیری، خدا معلوم یہ کون لوگ ہیں، تاریخ ادب میں ان کا کیا مقام ہے ان کی تاریخ وفات کی کس تحریر میں ضرورت پڑے گی؟

(۵) ان کے پاس مواد تھا، لیکن ان کا ذہن اس کو ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے وہ کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ لکھ بھی نہیں سکتے تھے، کتاب تو درکنار وہ ایک مسلسل منضبط مضمون لکھنے کے لئے بھی ذہن کو مرکوز نہ کر سکتے تھے۔

رسالہ آج کل کے اردو تحقیق نمبر میں اصول تحقیق کے جیسے بالشان مضمون کی ابتدا میں صراحت کرتے ہیں،

"اصول تحقیق پر کوئی مقالہ لکھنا مد نظر نہیں چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں گی قلمبند کر دی جائیں گی"۔

کیوں وہ مرتب کر کے منطقی مدولبت سے کیوں نہیں پیش کی جائیں گی۔ وجہ صاف ہے کہ وہ تحقیق میں غزل کا ریزہ خیالی سے بڑھ کر ترتیب کی منزل تک نہیں پہونچ سکتے تھے۔

(۶) ڈاکٹر خلیق انجم نے پتے کی بات لکھی ہے۔

"اردو میں کچھ لوگ تحقیق کرتے ہیں اور کچھ ان کی غلطیاں نکالتے ہیں"۔[1]

---

[1] ادبی تحقیق اور حقائق، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق، مرتبہ عبدالستار دلوی ص ۱۹۰

قاضی صاحب نے فوائد کو حمل کی بہترین مثال ہیں۔ دوسروں کی غلطیاں نکالتے رہے۔ ان کی اہمیت مسلم، لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کچھ کر کے نہیں دیا۔ وہ کیا اس کی چنداں اہمیت نہیں۔ خلاف مرتب کردہ بیشتر متنوں میں محض متن کو چھاپ دیا ہے اس پر نہ کوئی تحقیقی مقدمہ لکھا اور نہ حواشی، وعدہ ہوتا رہا کہ حواشی لکھے جائیں گے لیکن ایسا کر کے نہیں دیا۔

(۷) وہ تحریر میں مہذب انداز گفتگو کے قائل نہ تھے، دوسروں کی حرف گیری میں جی بھر کے طنزیات و مضحکات سے کام لیتے تھے۔ اپنے اوپر ذرا سا اعتراض بھی برداشت کرنے کا یارا نہ تھا۔ کاش علم کے ساتھ ساتھ انہیں حلم سے بھی کچھ بہرہ ملا ہوتا۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا، اس سے خوش رہتے، جس نے ذرا بھی اختلاف رائے کی جرأت کی اس پر بپھر جاتے تھے۔ جب یہ رسالہ معاصر میں "عبدالحق بحیثیت محقق" کا سلسلہ بن رہے تھے۔ قومی زبان کراچی میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے قاضی عبدالودود بحیثیت محقق کا جائزہ لینا شروع کیا، پہلی قسط ہی شائع ہوئی تھی کہ مولوی عبدالحق نے اسے روک دیا۔ یہ مولوی صاحب کا ظرف تھا، وہ قاضی صاحب کا۔

(۸) قاضی صاحب کا اسلوب تحریر بے رس ہوتا تھا۔ تحقیق اور محقق پر جو طنز کئے جاتے ہیں ان کی ذمہ داری قاضی صاحب ہی کے انداز پر ہے۔ ان کا دیکھا دیکھی اردو میں بڑے بڑوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ تحقیق کو غیر شگفتہ اور غیر دلچسپ انداز میں لکھنا چاہئے۔ لیکن ایسا کیوں؟ انگریزی اسکالر رابرٹ اسپلیر (SPILLER) نے اپنے مضمون ادبی تاریخ میں لکھا ہے

"ادبی تاریخ کا موضوع ادب ہے اس لئے یہ ادبی انداز میں لکھی جانی چاہئے۔ اور چونکہ یہ خود ادب کی ایک صنف ہے اس لئے یہ آرٹ ہے، سائنس نہیں[1]"

انگریزی بالخصوص امریکی مصنفوں نے تحقیق کی زبان کی شگفتگی پر خاص زور دیا ہے وہ سب بار بار REA-DABLE کے لفظ کا استعمال کرتے ہیں جارج واٹسن کی کتاب میں مشہور فنی نقاد مک کیرو کا مضمون ہے وہ کہتا ہے کہ بعض تحقیقی مضامین میں مفید معلومات ہوتی ہیں لیکن محدود خصوصی قارئین کے لئے ذرا سی کوشش سے انہیں زیادہ ہی قارئین کے پڑھنے کے لائق بنایا جا سکتا ہے[2]

موڈرن لنگویج ایسوسی ایشن آف امریکہ کا کتابچہ ایم ایل اے اسٹائل شیٹ تحقیقی زبان و بیان کا مستند ترین صحیفہ ہے اس کے کئی کئی لاکھ کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں، سینکڑوں یونیورسٹیاں، کالج، رسالے اور ناشر اس کا تتبع کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا ہی میں تحقیق کی زبان کو سلیس و شگفتہ بنانے پر زور دیا گیا ہے لکھا ہے

تحقیقی تحریر میں پہلا وصف اس کے خواندنی (READABLE) ہونے کا ہے۔ پچھلی ربع صدی میں (۱۹۴۵ تا ۱۹۷۰) امریکی تحقیق حقائق برائے حقائق اور متن سے بے نیاز حواشی کے نظام سے

---

(1) ED. James Thorpe The Aims and Methods of Scholarship in modern languages and literatures (2nd Ed. Aug 70 Reprint 1972 A.S.R.C. Hyderabad) P. 57

(2) R. B. Mc. Kerrow "Form and matter in the Publication of Research" included in the Literary Thesis. ed. George Watson (London 1970) P. 159

دور بینی بھی ہے ...... کامیاب محقق کو دو خوبیاں پیدا کرنی ہوتی ہیں۔ (الف) زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور خواندگیت ۔ (ب) زیادہ سے زیادہ صحت اور استدلال ۔" ص ۳

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ انگریزی میں طریق تحقیق کی بہترین کتاب رچرڈ ایلٹک کی دی آرٹ آف لٹریری ریسرچ ہے وہ عالمانہ اور بوجھل اسلوب کا شدید مخالف ہے ، لکھتا ہے ۔

"کہا جاتا ہے کہ محقق اچھی زبان نہیں لکھ سکتے ۔ ناشر کہتے ہیں کہ کسی اہم موضوع پر ایسا مسودہ دیکھئے ۔ جو اچھی طرح لکھا ہوا ہو (CHAT IS WELL WITLER) یونیورسٹی پریس خاص طور سے ایسا کہتے ہیں ۔" ص ۱۸۲

"تحقیق کو جمالیاتی تجربے کا اظہار نہیں ہونا پڑتا لیکن اسے بے رس اور غیر ضروری طور پر پیچیدہ بھی نہیں ہونا چاہئے ، کوئی ضروری نہیں کہ مقالے کا اسلوب عام انگریزی اسلوب سے مختلف ہو ۔

"THONGH THERE UNQUESTIONOLLY IN SUCH A THING AS ACADEMESE OR DISSUTATION STYLE IT HAS NO REASON TO EXIST AND EVERY SCHOLARLY WRITER SHOULD AVOID IT" P. 183

(ترجمہ : گو بے شک ایک معلمانہ تیر مقالے کا اسلوب ہوتا ہے لیکن اس کے وجود کا کوئی جواز نہیں ، ہر محقق کو اس سے احتراز کرنا چاہئے ۔)

"اچھے تحقیقی اسلوب اور انگریزی اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہوتا ، اچھے اسلوب کی خوبی وضاحت ہے ۔" ص ۱۸۳ ، ۱۸۵

"تحقیق پر الزام ہے کہ اسکالرشپ (تحقیق) کی سب سے بڑی کامیابی یہ رہی ہے کہ اس نے ادب کو زندگی کے تعلق سے آزاد کر دیا ہے ۔ کیا ضروری ہے کہ ادب کے بارے میں لکھتے وقت سیاہ لباس پہن کر ماتمی رویہ اپنایا جائے ۔" ص ۱۹۴

"تحقیق کو شگفتہ انداز میں لکھنے والے کے لئے ایک انعام رکھنا چاہئے ، اگر کوئی ذومعنین یا مزاحیہ فقرہ ذہن میں آجائے تو غور کیجئے کہ اسے لکھ دیا جائے کہ نہیں ۔" ص ۱۹۶

اگر غیر شگفتہ انداز میں لکھنے کا کوئی انعام ہوتا تو وہ یقیناً ڈاکٹر عبدالودود کو ملتا ۔ انہوں نے سب سے ناکام اسلوب میں لکھا اور افسوس یہ ہے کہ ان کی وجہ سے یہ غلط نظام ہو گیا ۔ کہ علمی اسلوب کے معنی روکھے پھیکے اسلوب کے ہیں ۔

سینے پہ چھالے اذیتوں کے
داغ جیسے جراحتوں کے
یہ روگ مرگ کا بہانہ بنا آخر
دردِ زیست کا فسانہ بنا آخر

کشن فریدہ کول۔ کشمیر

چرخہ

ایک پیش افتادہ چرخہ
میری خالقانہ پرچھائی کا ورثہ
کتنا خودبیں و خودنگر — وہ چہرہ
جھیل سی آنکھوں میں زندگی کی رمق
بے غازہ چہرے پہ جیسے کہکشاں کی شفقت
سیہ مخمل بال مگر خم دار
ہلکی سی ہنسی پہ آنکھیں نم دار
میری گمشدہ یہ پرچھائی بھی
عیش کی بزم میں پلی بڑھی
لیکن تقدیر کی ستم گاری نے
تدبیر کی نارسائی نے
سرِ بازار کی چوکھٹوں پر
صعوبتوں کے چوراہوں پر
زخمی بنا کے رکھ دیا
روگی بنا کے رکھ دیا
ریزہ ریزہ رشتے کا تن
لہولہان سارا بدن

جنگل لے گیا اس کا رنگِ وجود
اڑا کے لے گیا اس کا ہست و بود
اب یہ چرخہ
ورثہ داروں کے لئے اک یادِ فروزاں
پیاروں کے لئے ماتا کا نشان
اور مجھ جیسے اک محروم کے لئے —
ماتا کی اک تصویر
آج برسوں کے بعد یہ چرخہ میں نے دیکھا
بے صوت و صدا خستہ میں نے دیکھا
عین کتبہ کی خستگی کی طرح

○

دائرہ

گھنے جنگلوں سے یہ ہتھیلیاں
غالباً مقدر کے نشیب و فراز
کوئی بچ کے جائے کہاں
سامنے خمدار دائرے فقط
نہ راہ کوئی نہ نقشِ پا
بس اک سفرِ مسلسل
دائروں کا چکر
زیست کی تھکان اور بیزاریاں
ٹوٹتے لمحے اور گہری اداسیاں
حزن آلودہ چہرے پیلے پیلے
ہر کوئی متحیر اور متلاشی
خودی کا روگ لئے
پھر بھی زیست کے ساغر میں [illegible]
زندگی بس — روح میں اترنے کا نام
زندگی بس — گردشِ زہر پینے کا جام
کربِ گھٹن اور تلاشِ ذات
ان خمدار دائروں کی سوغات
دائرہ مقدر کا عکس و پیامبر
دائرہ گرتے لرزتے خواب کا پیکر
ہر پل کے دامن سے الجھی تعبیریں
زیست کا اطمینان پانے کی خاطر

○

گوہر شیخ پوروی

غمِ دوراں سے راحت ہر قدم پر ہم نے حاصل کی
کہ جب ہر چند منتِ زندگی طوق و سلاسل کی

کبھی سورج کی کرنیں اس میں اتری ہیں نہ اتریں گی
کوئی تاریکیاں تو دیکھیے خانۂ دل کی

کبھی نادار کی یہ بھی تو توہینِ سراسر ہے
کہ اس کی داستانِ غم سے لذت تم نے حاصل کی

مرے چہرے پہ عنوانِ مسرت ڈھونڈنے والو
ابھی تک اپنے بچوں کی نہ میں نے فیس داخل کی

جو برساتا رہا شاخِ قلم سے پھول برسوں تک
رہِ ہستی میں اس نے بھی فقط نفرت ہی حاصل کی

ہمارے دل کی دیواروں پہ آویزاں ہیں تصویریں
غموں کی رنج کی، دکھ درد کی، آلام و مشکل کی

نجات اس نے دلائی ہے غمِ افکار سے ہم کو
شکایت کر نہیں سکتے ہم محشر میں بھی قاتل کی

بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے
یہ گوہر جو عزت ہم نے حاصل کی

غزلیں

تسنیم فاروقی

سُروں کے پھول کھلے دل جو باغِ نغمہ ہوا
نشاطِ لمسِ رخِ گل دماغِ نغمہ ہوا

یہی نہیں ہے کہ دل آتشِ غزل سے جلا
سلگ کے سینۂ ہر ساز داغِ نغمہ ہوا

کچھ انگلیوں نے مجھے جل ترنگ کہہ کے چھوا
میں آبِ سادہ تھا لیکن ایاغِ نغمہ ہوا

وہ اک گلاب سا چہرہ جو مثلِ شعلہ اٹھا
اتر کے شیشۂ دل میں چراغِ نغمہ ہوا

یہ شہرِ سنگ میں مدفون گونگ آہن تھا
[illegible] تو حسبِ سراغِ نغمہ ہوا

تو ہم بھی لفظوں کا سرگم سجائیں گے تسنیم
اگر نصیب ہمیں کچھ فراغِ نغمہ ہوا

غزلیں

سرفراز نواز (بنارس)

وہ قبیلے کا سردار ہے
ہاتھ میں جس کے تلوار ہے

شہر کا شہر بازار ہے
کوئی کس شے کا خریدار ہے

یہ مکاں جو ہوادار ہے
آندھیوں میں گرفتار ہے

خون میں ڈوبا اخبار ہے
چین سے سوئی سرکار ہے

جیت تیری مری ہار ہے
واقعی تو سمجھدار ہے

پتھروں کو جو ہیرا کہے
اس صدی کا وہ فنکار ہے

تم اندھیروں سے ڈرتے ہو کیوں
میرا سایہ بھی خوددار ہے

تیرتے تیرتے تھک گیا
کوئی تنکا مددگار ہے

دیکھو سورج کی پہلی کرن
بس یہی صبح کی یار ہے

پھر اسی موڑ پہ ہوں کھڑا
آؤ گر تمہیں پیار ہے

میں سمندر سے پیدا ہوا
میرا موتی کا بیوپار ہے

جس نے سینچا لہو سے چمن
آج وہ شاخ پہ بار ہے

○

حسیب سوز

وہ لوگ جو اظہارِ تمنا نہیں کرتے
حالات کو اپنے کبھی رسوا نہیں کرتے

رونا ہے تو گھر بیٹھ کے تنہائی میں رونا
چوراہوں پہ آ کر یہ تماشا نہیں کرتے

کس چیز سے تولو گے ہم خانہ خرابوں کو
ہم اس کے سوا اور کو سجدہ نہیں کرتے

حالات نے شاخوں سے جدا کر دیے پتے
دو دن میں ہرے پیڑ تو سوکھا نہیں کرتے

اب گھر میں کوئی آس میں بیٹھا بھی نہیں ہے
اب ہم بھی کبھی رات کو لوٹا نہیں کرتے

کم ظرفوں کی تعداد تو اک لاکھ بھی کم ہے
جگنو کبھی راتوں کو اجالا نہیں کرتے

○

شیریں سحر

تنہا گزری ہے رُت بھی ساون کی
پھول کب بن سکی کلی من کی

آسماں ہو رہا ہے خوں آلود
تتلیاں جل رہی ہیں آنگن کی

خود کلامی میں محو ہیں ہم تم
کون سمجھے گا بات درپن کی

اس کا جلوہ سبھی پہ روشن ہے
رُت ہو گرمی کی یا ہو ساون کی

رقص کرتے تھے جو بدن حسین
لکڑیاں جل رہی ہیں چندن کی

مجھ کو شیریں یقیں نہیں آتا
جانتا بات ہے مرے من کی

○

نریندر

کامریڈ پرگٹ سنگھ

میں آج ہی پانچ چھ مہینے بعد باہر سے لوٹا ہوں۔
میری بیوی نے پہلی خبر کامریڈ پرگٹ سنگھ کے حادثے کی دی میں تو سُن ہو کر رہ گیا۔ اس کے الفاظ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹ کی سے لگنے لگے۔ کامریڈ پرگٹ سنگھ ...... میرے سامنے جیسے وہ مجسم آکر کھڑا ہو ...... وہ کیا تھا اور کیا بن گیا میں خیالات میں بھٹکتا ہوا بیس پچیس سال پیچھے لوٹ جاتا ہوں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑا آرام کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ لو کے گرم جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غصے میں لگتا تھا۔

"میرے بابا مجھے کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں کالج سے نکل کر سیدھا کسی دفتر میں کلرکی کا دھندا شروع کر دوں۔ اور ساری عمر قلم گھستا رہوں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔"
وہ آتے ہی اس قسم کی باتیں کرنے لگتا تھا۔

کالج میں داخل لینے کے فوراً بعد ہی وہ طالب علموں کی انقلابی تحریک میں شامل ہو گیا تھا۔ کالج میں پڑھائی کے دوران ان کے اکنامکس کے پروفیسر نے ان میں انقلابی کتابیں پڑھنے کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔ اس کے دل میں پڑی چنگاری سی چنگاری کو ہوا دے دی تھی۔ کالج کے ماحول نے اس آگ کو شعلوں میں بدل دیا تھا۔ وہ پڑھائی اور سارے کام کو بھول کر طالب علموں کی تحریک میں کام کرتا رہا۔ آج کالج میں میٹنگ ہے تو کل گاؤں میں کسی کامریڈ کے گھر میٹنگ ہے۔ کبھی طالب علموں کی مانگوں کے لئے ہڑتال ہے تو کبھی بسوں کے کرایوں میں اضافے کے خلاف ہڑتال ہے۔ یہ ایک سلسلہ بن گیا تھا۔ ان سب سرگرمیوں میں کامریڈ پرگٹ سنگھ سب سے آگے ہوتا۔ کئی بار جیل جانا پڑا۔ کئی بار لاٹھی چارج میں چوٹ آئی۔ وہ اس تحریک میں اس طرح کھو گیا تھا کہ اس نے گھر کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔

اس کا باپ ایک چھوٹا سا کسان تھا۔ وہ کھیت ٹھیکے پر لیتا تھا۔ اور اس سے ان کا بمشکل خاندان کا تنگی ترشی سے پیٹ بھرتا تھا۔ کامریڈ پرگٹ سنگھ سے اس کے باپ کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ سال کامریڈ پرگٹ سنگھ کے ایم اے کا آخری سال تھا۔ وہ اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کی اچھی نوکری کے خواب دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹا جب کمانے لگے گا تو [illegible] سنبھالے گا اور وہ ان کے چہرے سے [illegible] سوچ کر وہ اپنے

ہر بوجھ کو ہلکا محسوس کرتے لگتا

لیکن کامریڈ پرگٹ سنگھ کے ارادے کچھ اور ہی تھے وہ روسی انقلابیوں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر جوش میں بھرا ہوا تھا نوکری کرنی، صرف اپنے خاندان والوں کے لئے زندہ رہنا اسے بے معنی سا لگتا تھا۔ یہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ نوکری کرو، شادی کرو، بچے پالو اور مر جاؤ۔ اس نے اپنے جی میں ٹھانی تھی کہ وہ اپنی زندگی کو لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا راستہ بھی اس کے سامنے صاف تھا۔ اس نے کسان دل کا ہول ٹائمر بننے کا ارادہ کر لیا تھا ضلع سکریٹری کامریڈ سندھو کے ساتھ اس نے بات بھی کرلی تھی کہ امتحان کے بعد وہ ہول ٹائمر بن جائے گا۔ اور کسان دل کے اخبار میں کام کرے گا یہ بات جب اس نے اپنے باپ کو بتائی تھی تو اس کے باپ کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اور اسے لگا تھا کہ وہ ایک بھاری بوجھ تلے دبا چلا جا رہا ہے۔ اس فیصلے کے بارے میں باپ بیٹے میں روز بحث ہوتی رہی۔ مگر کامریڈ پرگٹ سنگھ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس دن بھی اسی بات پر کامریڈ پرگٹ سنگھ اپنے باپ سے جھگڑا کر کے آیا تھا۔

"کسان دل کا کام کیا تم نوکری کے ساتھ نہیں کر سکتے۔" میں نے پوچھا تھا۔ میں کلاس میں اس سے ایک سال پیچھے تھا۔ میں سیاست سے دور تھا مگر اس کے خیالات سے دور نہیں تھا۔ میں اس کو اکثر ایسی کتابیں اور رسالے دیتا رہتا تھا جن کو وہ پسند کرتا۔ اس لئے اس سے ہماری اچھی بنتی تھی۔ اور اسی لئے وہ مجھ سے اپنے دل کی بات بتا کے ہلکا ہو لیا کرتا تھا۔

"نہیں، میری زندگی کا مقصد کسان دل ہی ہے میں بورژوا نظام کی نوکری نہیں کروں گا۔" اس نے جھلا کر کہا تھا۔

"تمہیں اپنے گھر والوں کا کوئی خیال نہیں؟ تمہارا باپ بیمار رہتا ہے تمہارے چھوٹے بھائی ابھی کچھ کر نہیں سکتے۔ اور تم انقلاب لانے میں لگ گئے ہو۔۔۔ کچھ تو۔۔۔"

"تم بھی مجھے روکتے ہو۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا تھا۔ "تجھے نہیں معلوم کہ میں کس لئے کرنا چاہتا ہوں! تم کیا سوچتے ہو کہ مجھے اپنے بھائیوں کی فکر نہیں ہے۔ اور ہم کو اپنے باپ سے پیار نہیں ہے؟" وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تھا۔

باپ بیٹے میں کئی دن بحث ہوتی رہی۔ جب کامریڈ پرگٹ سنگھ بالکل نہ مانا تو ایک دن اس کا باپ کامریڈ سندھو سے جا کر ملا تھا۔ کامریڈ سندھو کا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ کسان دل کے اکثر کام ایسے ہوتے جن پر وہ کامریڈ پرگٹ سنگھ سے بات چیت کرنے ان کے گھر آ جاتے کبھی اور ساتھی بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ وہ کافی کافی دیر تک بیٹھے سیاست اور دوسرے موضوعات پر باتیں کرتے رہتے تھے۔

"تم سب میرے بیٹے کو بگاڑ کر چھوڑو گے۔ یہ گھر کا سہارا نہ کمائے گا؟" اس کا باپ ان لوگوں کو جیسا دیکھ کر کہتا ہے۔

"باپو اگر بگڑا کہتے ہو تو اس طرح بگاڑ کر دیکھنا چاہئے۔۔۔ یہ تو بہت پیارا کامریڈ سندھو جواب دیتا ہے۔

"پھر کیا بھلا کیا ہوگا۔۔۔ سارے کا سارا ساتھ دشمن ملک سے کمی ہے۔ کبھی سرخ کے پیچھے پڑ جائے گا

کہ وہ پنچایت کے روپے کھا گیا ہے کبھی نمبردار کے پیچھے پڑ جائے گا
کہ وہ نہر کا پانی چوری کرتا ہے ...... میں کہتا ہوں کہ تو
پڑھائی میں دھیان دیا کر۔ اگر یہ تو انقلاب لائے گا .....
انقلاب ......" وہ بہت کچھ برا بھلا کہتا رہا اس کی سب
باتوں کا جواب کامریڈ کچھ ہی دیتا رہا۔ کئی بار یہاں تک ہوا کہ بالپو
اور کامریڈ سدھو کی بحث بہت بہت گرم ہو جاتی تھی تب بالپو غصے
سے کہتا تھا۔

"بیٹا تیرے پاس تو زمین ہے باپ اور بھائی مٹی
سے سر کھپاتے رہتے ہیں تجھے لیڈری کرنے کی چھوٹ دے رکھی
ہے ہمارا گھر کیوں جلاتا ہے؟" وہ کہتے کہتے طیش میں آ جاتا اور
کہتا ہمارے گھر نہ آیا کر۔ آخری بار کہے دیتا ہوں۔"

کامریڈ سدھو کچھ نہ کہتا چپکی سادھ لیتا، کامریڈ
پرگٹ سنگھ خاموش بیٹھا رہتا۔ اسے لگتا کہ بالپو کی تو یہ عادت
ہی ہے چیخ پکار کر کے چپ ہو جائیں گے ان میں سچ مچ ٹھہراؤ آ
جاتا تھا جیسے سیلاب کے بعد ندی میں آ جاتا ہے۔

کچھ دن پہلے ہی وہ بالپو سے جھک جھک کر کے گیا
تھا کام میں مصروف رہا یا کوئی اور وجہ ہوئی۔ وہ گھر نہیں آیا۔

بالپو کے تیور دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا وہ بالپو کی
بات ماننے کو تیار نہیں تھا جی جان سے لوگوں کی خدمت کرنے
والے ورکر وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ساری تحصیل کا کام وہ
کالج میں پڑھتے ہوئے بھی کر رہا تھا ہول ٹائمر ہونے کے بعد تو
...... لیکن بالپو نے اپنی گرتی ہوئی صحت گھر کی بری حالت
لوٹتے جانے والے قرض بچوں کی پڑھائی اور گرہستی کی
بہت سی مشکلات کا ذکر کیا تو کامریڈ سدھو نرم پڑ گیا اس نے
پرگٹ سنگھ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد پرگٹ سنگھ ہول ٹائمر نہیں بنے۔

ایم اے کے بعد وہ بی ایڈ کر کے ٹیچر بن گئے۔ لیکن
ہول ٹائمر نہ ہونے کا کانٹا ان کے دل میں چبھتا رہا۔ انہوں نے
ٹیچر یونین میں تندہی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اسے
محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنا وقت فضول گنوا رہا ہے۔

اسی طرح کچھ سال بیت گئے ان برسوں میں ماں
اور بالپو سال ڈیڑھ سال کے فرق سے پرلوک سدھار گئے
تھے دونوں چھوٹے بھائی بی اے کر کے کام سے لگ گئے تھے
کامریڈ پرگٹ سنگھ دو بیٹوں کے باپ بن چکے تھے۔ اس عرصے
میں وہ گھر گرہستی میں اس طرح لگا رہا کہ کچھ دنوں تک یونین
کا کام بالکل ہی نہ کر سکا۔ وہ اپنے آپ پر غصہ کرتا رہتا تھا
اکیلے بیٹھا سوچا کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی بے
مصرف ہے ان دنوں اسے بالپو پر بہت غصہ آتا تھا۔ اگر کوئی
پوچھتا "کیا حال ہے کامریڈ صاحب؟"

"مر گیا کامریڈ" وہ جواب دیتا اور پوچھنے والا اسے
حیرت سے تکتا رہ جاتا۔

وقت بیتتا گیا۔ اس کی عمر گھٹتی گئی، بیٹوں کی عمریں
بڑھتی گئیں۔ وہ جوان ہو گئے ...... اور پرگٹ سنگھ پھر میدان
میں کود پڑا۔ اب پھر سے گھر میں محفلیں جمنے لگیں۔ فرق اتنا تھا کہ
اب کامریڈوں کے علاوہ دماغی جگالی کرنے والے ماسٹر بھی
محفل کی رونق بڑھانے لگے۔ باتیں ہی باتیں تھیں مہنگائی
کی، روسی انقلاب کی، ویتنام کی، موگا میں مارے گئے لڑکوں
کی، لگاتار باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور یہ ختم ہوتی تھی گرم دل
والوں پر آ کر۔

"بھائی ان لڑکوں کی ہمت کی تو داد دینی چاہیے
لیکن بات ایسے بنے گی نہیں کوئی کہتا۔"
ہاں طبقاتی دشمن سے لڑ کر تو سمجھنا ہوگا اس کے

لئے لوگوں کو جگانا پہلی شرط ہے...... مارکس نے کہا؛

"مارکس نے کیا کہا تھا؟" کامریڈ پرگٹ سنگھ بیچ کی بات کاٹ کر پوچھتا۔ مارکس نے یہی کہا ہے نا کہ لوگوں کو جگاؤ۔ لیکن جب لوٹنے والوں کو ایک ایک کر کے مارا جائے گا تو کیا لوگ نہیں جاگیں گے۔ انہوں نے ہمارے ٹیڈس والے گاؤں کے سردار کو مارا تھا تب لوگ کیا خوش نہیں ہوئے تھے؟ میں نہیں کہتا کہ ہم بھی یہی راستہ اپنائیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہمارے کسان دل نے اب تک کیا کیا ہے؟ کبھی موگے میں لڑکے مروا دئے اور کبھی جگہ جگہ گیہوں کی بلی چڑھا دی...... اسمبلی میں چار سیٹ بھی نہیں۔ یہی راستہ...... اور کوئی چارہ بھی تو نہیں..."

وہ بولتا رہتا۔ بس بولتا جاتا۔ بحث میں گرمی آجاتی، کبھی کوئی گرم دل والوں کی حمایت کرتا۔ تو فوراً ہی کوئی دوسرا ان کی کوتاہیاں گنانے لگ جاتا لیکن کامریڈ پرگٹ سنگھ کہتا۔

"میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہی راستہ صحیح ہے،، اس کورٹ سی لگ جاتی وہ یہی دہراتا رہتا۔

بحث چلتی رہتی اور اس کے دونوں بیٹے کرانتی پال سنگھ اور سنگرام پال سنگھ چائے پانی لاتے رہتے۔ کبھی کبھی کرانتی پال سنگھ بھی بحث میں حصہ لینے لگتا۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی بات کی ہی تائید کرتا تھا۔

کرانتی پال سنگھ اور سنگرام پال سنگھ کو باپ کی طرح ہی پڑھنے کا شوق تھا۔ گھر میں پڑی انقلابی کتابیں وہ بہت غور سے پڑھتے کالج کی یونین میں حصہ لینا تو وہ بالکل فطری بات تھی اب یہ حالت [illegible] ایک طرف پرگٹ سنگھ [illegible] کی [illegible] کے لئے جیل میں جاتا تھا اور دوسری طرف کرانتی پال سنگھ گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش ہوتا تھا۔

ایک [illegible] دن ایسا [illegible] پولس دونوں بیٹوں کو کھینچ کر لے گئی۔ دو دن دو راتیں ان پر تشدد ہوتا رہا۔ پولس ان گرم دل کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ مار کھاتے رہے اور اپنا خون کھولاتے رہے۔ وہ چھوڑ دیے گئے لیکن ان کے اندر ایک آگ دھدھک رہی تھی۔ وہ [illegible] سمجھ رہے تھے۔ کہتے ہیں گرمی کا علاج گرمی ہے انہوں نے بھی اپنی آگ بجھانے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ ان کا راستہ تھا جسے وہ ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن یہ راستہ اب ان کا تھا۔ یہ گرم دل والوں کا راستہ تھا۔

کامریڈ پرگٹ سنگھ اس خیال کے تصور سے تھرا اٹھا تھا۔ وہ تصور میں گولیاں چلتی سن رہا تھا۔ لاشیں گرتی دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کا چھلنی سینہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے آگے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔

اس نے انہیں اس راستے سے ہٹانے کی بہت ہی کوشش کی۔ لیکن اب وہ لوٹنے والے نہیں تھے۔ باندھ ٹوٹ جائے تو دریا کا طوفانی بہاؤ کب رکتا ہے۔ وہ اپنی بڑی ہر چیز بہالے جاتا ہے۔

وہ اب گرم دل کے ہو گئے تھے جہاں "ایکشن" ہوتا وہاں ان کا نام ضرور لیا جاتا۔ روز اخباروں میں ان کا نام چھپتا۔ کوئی [illegible] کی واقعہ اور حادثہ ان کے نام سے جڑتا۔ پولس ان کے پیچھے تھی [illegible] کا سایہ ہمیشہ پولس کی [illegible] پہنچتا تھا۔

[illegible] رسول پور میں ان کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ کسی نے پولس کو خبر کر دی تھی۔ پولس نے گھیرا ڈال دیا جنگ [illegible] جگہ پر آ [illegible] تمام [illegible] کر لئے [illegible] پولس نے [illegible] کیا۔ [illegible]

کی خبر دیتا ہوا دستگرام سنگھ ڈھیر ہو گیا۔ اس کے دو ساتھی
بھاگ نکلے۔ بھائی اور ساتھیوں کو تڑپتا دیکھ کر کرانتی پال
سنگھ سناٹے میں آ گیا۔ خون کے فوارے زمین کو لال کر رہے
تھے اور وہ مبہوت کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔
اسے ہوش تب آیا جب وہ گرفتار کر لیا گیا۔ وہ پولس کے
ہاتھوں سے بچ نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس جال سے
نکل جانا شیر کے لئے آسان نہیں تھا۔

تھانے میں ان کی مرمت کی گئی۔ وہ اوپری مار
سہہ سکتا تھا لیکن ایک گھاؤ اندر لگا تھا وہ برابر درد کر
رہا تھا۔ بھائی کی لاش اس کے سامنے تڑپتی رہتی تھی۔ ساتھیوں
کا خون کا فوارہ اسے تر بتر کرتا رہتا تھا۔ گہری چوٹ مرہم
کو بھی نہیں۔ آنسوؤں کا چھینٹا بھی نہیں۔ وہ اوٹ پٹانگ
باتیں کرنے لگا ...... وہ پاگل ہو گیا۔

"انہیں تو کرانتی پال سنگھ کو بھی مارنا تھا" میری بیوی
مجھ سے کہتی ہے

"پھر وہ بچا کیسے؟" میں یکایک اس دنیا میں آ جاتا
ہوں اور پوچھتا ہوں۔

"بچتا کیسے! تھانیدار کی جیب گرم کر لی۔ بڑی بہن
جی کے زیورات بک گئے۔ چالیس ہزار دینے پڑے ......
ان کا تو سارا خاندان ہی مر گیا۔ بہن جی کی طرف دیکھو تو دیکھا
ہی نہیں جاتا ......" وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

میں پرگٹ سنگھ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے
بیٹھک میں دیوان پر نیم دراز تھا۔ اس کی داڑھی کھلی ہوئی تھی
[illegible] لگ رہی تھی جیسے [illegible] ہو گیا ہو۔ اس
کی [illegible] اس ماحول کو اور اداس بنا رہی تھی۔ اس
کی آنکھوں میں [illegible] اندھیرا [illegible] کتابوں پر دھول کی

تہہ جمی تھی۔ اس کے پراگندہ حنا اور بکھرے بیٹھک کی ہر چیز بکھری
ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ
چپ رہتا ہے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے۔ پھر
سامنے پڑی انقلابی کتابوں کو گھورتا ہے۔ انہیں ایسی حیرت
سے دیکھتا ہے جیسے لفظ بے معنی ہو گئے ہوں۔ سیدھا الٹا
راستہ بتانے والے سارے مجلے کہیں گھپ اندھیرے میں
گم ہو گئے ہوں۔ وہ ان پر ہاتھ پھیرتا ہے جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو
لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

اندر سے کرانتی پال سنگھ کی آواز آ رہی ہے، کبھی وہ
ہنستا ہے کبھی وہ روتا ہے۔ نعرے لگاتا ہے، انقلاب زندہ
باد، ...... ایکتا کے دشمن مردہ آباد۔ صحیح راستہ، یہی
راستہ، ...... پرگٹ سنگھ گم سم سنتا ہے۔ کچھ بڑبڑاتا
ہے جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ لیکن اس کا سر گردوارے کی
طرف مڑ جاتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر وہ سر جھکا دیتا ہے۔

—— ۰ ——

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے خواہاں اپنی کتب و رسائل کی دو جلدیں بھیجا کریں۔ (مدیر)

...اب : افکارِ گریزاں

...کار : ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی

...صفحہ : ۲۱۶۰

...ت : پچاس روپے

...ر : "شانِ ہند" فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ ،

...نج ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

...نگار : ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

"افکارِ گریزاں" ایک اس نوعیت کی شعری ...ہے جس پر تبصرہ کرنا نہایت مشکل و دشوار ...ہوتا ہے۔ کیونکہ جن خیالات و تصورات کو شعری ...میں کیا گیا ہے ان پر جب تک بھرپور روشنی نہ ڈالی ...بات فی البطن تبصرہ نگار ہی ہو کر رہ جائیگی۔ ایک تبصرہ میں تعارفِ مشمولات نیز تخلیق کار کے باہر ...گلشن ریختہ" کو پار کرنے کے مترادف اقدام ہوگا "افکارِ گریزاں" میں ۵ نظمیں، ۵ غزلیں، ۵ ...چند قطعات کو باحتیاط و التزام حسن و خوبی ...اور مصوری کی آرائشوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ...گنجینۂ معنی ... ۱۹۸۰ ... [illegible]

کارنامہ ہے، بلکہ شاہکار ہے۔ شاعر محض ... شاعر نہیں ہے۔ شاعر حقیر آستانی ایک جہاں گرد (GLOBE TROTTER) نیز جہاں دیدہ ہستی ہے۔ ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی اور ایک امریکن یونیورسٹی کے ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی ہیں۔ سات سال بمبئی یونیورسٹی میں پروفیسر رہنے کے بعد امریکہ کی دو تین یونیورسٹیوں میں بھی پروفیسر رہے اور آج کل ورلڈ بینک (WORLD BANK) اور یو این ڈی پی (U.N.D.P) ایسے بین الاقوامی تنظیم و ہستا سے بہ حیثیت مشیر (CONSULTANT) وابستہ ہیں۔ بایں ہمہ ان کا فن کارانہ ادراک (ARTISTIC COGNITION) بہت حساس و فعال ہے۔ حقیر آستانی کی شاعری ایک منفرد بین الاقوامی شہرت سے متصف دانشور کی شاعری ہے اور ایسے دانشور کی شاعری ہے جو زندگی کی بہار و خزاں دونوں کا بھرپور وقوف رکھتا ہے ؎

کیا مرہ بود و باش ہے پیارے
ہر نفس جاں خراش ہے پیارے
اپنے اندر بھٹک رہا ہوں میں

مجھ کو اپنی تلاش ہے پیارے

یعنی نفس نفس خود احتسابی سے مخاطب ہے۔ افلاطون کا یہ مقبالہ (AN UNEXAMINED LIFE IS NOT WORTH-LIVING) کہ بے احتسابانہ زندگی بسر کرنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اسی خود احتسابی و ژرف بینی نے قلم حقیر آستانی کو۔ قلم سے خطاب کرتے ہوئے حقیر صاحب نے منجملہ دیگر خیالات پیش کرائے ہیں ؎

کبھی تو رفعتِ پرواز ہے تو
کبھی ڈوبی ہوئی آواز ہے تو
کبھی سرچشمۂ سطوتِ جوانی
کبھی ہے مبتلائے نوحہ خوانی
کبھی اہلِ دول کی چیرہ دستی
کبھی افلاس کی خستہ کہانی

خود احتسابی کا ذکر جو ہو رہا ہے تو ورق گردانی ہی سے تخلیق بے تحاشہ" نظم کے پہلے دو بند شاعر کی دروں بینی اور زندگی و کائنات پہ غور و خوض کے آئینہ دار نظر آئے ؎

میری ہستی کی ابتدا کیا ہے
میری ہستی کی انتہا کیا ہے
کیا تعلق ہے میرا عالم سے
میری ہستی کا مدعا کیا ہے

اکثر اوقات سوچتا ہوں میں — میں نہ ہوتا تو کیا بگڑ جاتا
ارتقائے نظامِ قدرت میں — کیا یہ ممکن ہے کہ فرق پڑ جاتا

اور یہ حساب و دل اس حقیقت پر منتج ہوتا ہے کہ ذاتِ آدم ؎

ایک موہوم سی حقیقت ہے
ایک تخلیق بے تحاشہ ہے

"تخلیق بے تحاشہ" ہے کی ترکیب معنی خیز ہے Big Bang theory یعنی یکایک تخلیقی دھماکے کا نظریہ کا ترجمہ "تخلیقِ بے تحاشہ" سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔

آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ رگِ وید کے متعدد منڈلوں کو اُستاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے بھوشن میں اُردو میں منتقل کیا تھا، اس کا ایک منڈل اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

دیوتا خلق ہوئے ارض کی تخلیق کے بعد
کون ہے پھر جو کرے منکشف اسرارِ شہود
(مترجم رگِ وید)

اس تناظر میں حقیر صاحب کہتے ہیں ؎

جو ہے فریب راہ میں — فتور ہے نگاہ میں
فریب تو نظر کا ہے — قصور تو بشر کا ہے
کہ دائرہ ہے دائرہ — نہ ابتدا، نہ انتہا
(از نظم "دائرہ")

فلسفہ و الہٰیات کے نکات پر شاعر کی نگاہ بھی مرکوز ہے ؎

کیا پتہ مقصودِ ہستی مجھکو حاصل ہو نہ ہو
کیا پتہ مجھ کو غمِ ہستی کا احساس ملا ہو نہ ہو
ایک نغمہ زندگی ہے — دیکھئے کب تک رہے

پر کمال نقد کیا ہے جو ان کے اعلیٰ پائے کی ناقدانہ
حیثیت پر دال ہے۔ تبصرے کے تحت اسلوب
انصاری کا مضمون "آتی جاتی لہریں" ہے۔ جس میں انہوں
نے اس کتاب کے مضامین کا تجزیاتی مطالعہ بڑی
دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ اور مظہر امام کی
ناقدانہ حیثیت کا تعین بھی کیا ہے۔ تاثرات کے
ذیل میں دو مختصر مضامین شامل ہیں۔ پہلا انتظار حسین
کا "مظہر امام غزل آزاد کے بانی" ہے۔ اور دوسرا
کرشنا ناہید کا "مظہر امام اور رشتہ گوپال"
ہے۔ دونوں قلمکاروں نے مظہر امام کی شخصیت
اور شاعری کو تاثرات کے آئینہ میں پرکھنے کی
کوشش کی ہے۔ ایک نے مظہر امام کو آزاد
غزل کا امام قرار دیا ہے۔ دوسرے نے انہیں
آزاد نظم کا کامیاب شاعر ثابت کرنے کی سعی
کی ہے۔ جو قابلِ ستائش ہے۔

گوشۂ مظہر امام کے آخر میں "ایک مکالمہ"
درج ہے۔ جس کا عنوان "مشہور بہاری شاعر اور
نقاد مظہر امام" ہے۔ "مکالمہ" مظہر امام کے انٹرویو پر
مشتمل ہے۔ جو جناب سعادت سعید حسن رضوی نے ان
سے لیا ہے۔ اس انٹرویو کو راقم "ادبی انٹرویو" سے
موسوم کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں اوّل سے آخر
تک مظہر امام کی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی
تحریکات، رجحانات، امکانات پر بھی روشنی
[illegible] کہ اس انٹرویو میں مظہر امام

قدر سے اپنے ماحول کے پس منظر میں نمودار ہوتے ہیں۔
مدیر اس گوشہ کے سبھی قلمکاروں نے انکی
زندگی اور شخصیت کے پردوں کو بے نقاب تو کیا
ہے لیکن کسی نے اس امر پر روشنی نہیں ڈالی کہ
مظہر امام کو ماحول کیسا ملا؟ ماحول نے ان کی فکر
کو کس طرح متاثر کیا؟ میرے خیال میں ان بنیادی
پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا بھی لازمی تھا۔ پھر بھی
ان چند کمیوں کے باوجود یہ مخصوص گوشہ مظہر امام
شناسی میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ ان کی
فنی و فکری زندگی پر پڑے ہوئے دبیز پردے یکے بعد
دیگرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے وہ
مظہر امام آجاتے ہیں جو ایک کامیاب شاعر اور بہترین
نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مٹھائیاں
اور
ٹافیاں

SPECIAL
GUL
HOWRAH
A R
TRADE MARK
M/S. A. RAHIMKHAN & SONS
سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے آر چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈمارک)
ہمیشہ استعمال کیجے

The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya - 823 001
'ears of Publication Phone : 21573

بے رنگ زندگی کو رنگین بنائیے!

تاہم تقسیم ہند کے وقت شاید
مغلوب کو ہم آمیزی کے وقت کا سب
سے بڑا المیہ بنا دیتے تھے۔ پرانی تہذیب
کا سانچہ ٹوٹ رہا تھا۔ نئی تہذیب کا
ہیولا ابھر رہا تھا۔ یہ عہد کی کیفیت بھی
کچھ بغاوت کچھ انقلاب کے احساسات
و جذبات کے مثالی پیکر کچھ مبالغے کے
ساتھ اعلیٰ متوسط طبقے میں پائے جاتے
ہیں؛ اس لئے کہ نچلا طبقہ یا نچلا متوسط طبقہ
ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔"

(قرۃ العین حیدر کا فن) ص ۶۳

یہی نہیں کہ عبدالمغنی کا طبقاتی شعور طبقوں میں
بٹے ہوئے ہندوستانی سماج اور طبقوں کے وجود سے
واقف ہے بلکہ وہ طبقوں کی نفسیات اور طبقاتی مفاد
(CLASS INTEREST) کے رجحان سے بھی واقف ہیں۔
وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ ہندوستانی سماج اور تعلقدار
اور اعلیٰ انگریزی سامراج اور اس کے نوآبادیاتی نظام
کا حاشیہ بردار ہے ہم نوا اور حصہ دار بھی ہے۔ انڈین
نیشنل کانگریس کے زیر قیادت ہندوستان کو جو آزادی
ملی وہ اعلیٰ طبقہ کی میراث ہونے والی تھی جو
تعلیم و تربیت و لباس کے اعتبار سے مغرب زدہ اور
انگریزی سامراج کے نوآبادیاتی نظام کا وفادار
تھا۔ اس طبقے کے طبقاتی کردار (C-ASS CH-ARACTER)
کے سلسلہ میں چارو مجمدار لکھتے ہیں:

اور اس تازہ نوآبادیاتی نظام کے قائم ہو جانے سے بھارت
کے اس نیم جاگیردارانہ اور نیم نوآبادیاتی طبقے نے
برطانوی سامراج کی جو مدد کی ہے اور حق وفاداری کا ادا
کیا ہے، تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ عبدالمغنی نے
اسی تاریخی پس منظر میں قرۃ العین حیدر کے فن کا جائزہ
لیا ہے کیونکہ ان کا تنقیدی نظام سراسر جدلیاتی ہے۔
ان کا تاریخی مطالعہ اور تاثر مارکس کی جدلیاتی اور
تاریخی مادیت کے قریب ہو یا نہ ہو ابن خلدون اور
مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخی دانشوری اور
بصیرت افروزی سے قربت ضرور رکھتا ہے۔ یہ لوگ
تاریخی تجزیاتی خیالات اسی فکر کی جلوہ گری کرتے
ہیں :-

"نوآبادیاتی سامراج کے تسلط سے
آزادی کے بعد اسی طبقے اور حلقے کی میراث
میں حکومت کے بڑے بڑے عہدے آنے
والے تھے، اور اس کے ارکان کو سماج کی
راہ نمائی کا اعزاز ملنے والا تھا۔ اس لیے
کہ انھوں نے فرنگی آقاؤں کی تعلیم گاہوں
اور انہی کی تربیت میں پرورش پائی
تھی۔ اور اپنے فکر اور طرز معاشرت میں
بالکل انہی کے مشابہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ
انگریزوں کو ان مغرب زدہ ہندوستانیوں
پر بڑا اعتماد بلکہ ناز تھا۔ معیشت، سیاست،
مذہب، ادب، معاشرت کے دائروں میں

AFTER WORLD WAR II
AND EVEN DURING IT THE
RE APPEARED A HIGH
TIDE OF REVOLUTIONARY
UPHEAVAL OF WORKER
AND PEASNT MASSES
WICH FORCED THE BR-
ITISH IMPERIALIST TO
CHANGE THEIR TAC-
TICTS, THEY TURNED
COLONIAL INDIA INTO
A SEMI-COLONIAL
AND SEMI-FEUDAL
COUNTRY AND FORC-
ED THE RULE OF CO-
MPRADOR BUREAU-
CRAT CAPITALISTS
AND BIG LAND-LORD
ON INDIAN PEOPLE.
THEY STARTED THE
PROCESS WICH CHAN-
GED INDIA FROM A
COLONY INTO A NEO-
COLONY. (Liberation Nov 1964. P-7)

کیا

رب زدہ ہندوستانی اینگلو انڈین
یت کے حامل تھے۔"

(قرۃ العین حیدر کا فن ص۹۳)

منی کا یہ تاریخی ادبیت کی بصیرت افروزی
یاتی فکر کی آئینہ دار ہے۔ ان کے خیال کے
کی روحانی جدلیات ہے۔ لیکن کیا مجرد روحانیت
جود رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

ب کے آپ کے رب نے فرشتوں
ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک
، انسان بنانے والا ہوں۔ پس جب
نے اس کو برابر کیا اور اس میں اپنی
ح پھونک دی پس وہ سجدے کے لئے
گئے۔" (سورۂ ص رع ۴ ۱ پ ۲۳)

مجرد روحانیت کا تصور اسلام میں روا نہیں
میں روحانیت کی بات کرتے ہیں وہ دراصل
تہذیب یافتہ' مربوط اور تزکیہ شدہ مادیت
برتے ہیں۔ یہ تہذیب یافتہ' مربوط اور تزکیہ
یت کیا ہے' قرآن کریم اس وضاحت سے
ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اسلام کے اسی
م زندگی کو شہنشاہیت کے دلدادہ نے استحصال
بنا کے حضرو دیشی" بنا دیا۔

سال کے عہد میں مشرق نو آبادیاتی نظاموں
سوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ مشرق شہنشاہیت
اور نو آبادیاتی نظاموں کی

چیرہ دستیوں نے جسم مشرق کو لہولہان کر دیا تھا۔ اقبال
کی پوری شاعری ان نظاموں کے خلاف آہنگ بیداری
ہے لیکن قرۃ العین کے فکشن میں وہ مغرب زدہ جاگیردارانہ
نظام کی واپسی کا بے تابانہ حرفِ تمنّا اور والہانہ اظہار:

جس ماضی قریب کی اقدارِ حیات کے گم
ہونے کا انہیں صدمہ ہے' وہ کوئی مشرق
کے دورِ عروج کا شاندار ماضی نہیں ہے'
بلکہ اودھ کی وہ زوال پذیر معاشرت ہے
جس میں انگریزی تمدن کے زیر اثر ہند مسلم
عیسائی تہذیب کا ایک مخلوط سا نچوڑ
بن رہا تھا۔ یعنی قرۃ العین حیدر کو نئی
ہندوستان کے کلچر کی شیدا ہیں۔"

(قرۃ العین حیدر کا فن ص۱۴۲)

"گم شدہ زمانوں کی تلاش قرۃ العین حیدر
میرے بھی صنم خانے میں کرتی چلی آرہی
ہیں۔ کبھی سفینۂ غمِ دل میں بیٹھ کر کبھی
آگ کا دریا میں ڈوب کر۔" ص۱۵۲

لیکن جن گم شدہ زمانوں اور جس ماضی قریب کی اقدار
حیات کے گم ہونے کا انہیں صدمہ ہے اُن کی خصوصیات
اور تاریخی سچائی Clemenceau کے الفاظ
میں ملاحظہ فرمائیے:

"THE WAR OF THE EN-
TENTE IMPERIALIST
AGAINST THE NATIONAL

LIBERATION MOVEMENT IN TURKY 1919-22; THE SUPPRESSION OF UPRISING IN KORIA IN 1919 BY JAPANESE; COLONIALISTS IN INDIA (THE AMRITSAR MASSACRE IN 1919 AND THE BLOODY REPRISATS AGAINST THE MALABAR PEASANTS IN 1921) THE WAR AGAINST THE CHINESE REVOLUTION IN 1925-27, THE CRUSHING OF THE POPULAR UPRISING IN JAVA AND SUMATRA IN 1926-27; THE COLONIAL WAR OF THE FRENCH AND SPANISH COLONIALISTS IN MORACCO IN 1925; THE CRUEL SUPPRESSION OF THE POPURAL MOVEMENT IN SYRIA; THE BARBARIC BOMBING OF DAMASCUS BY THE FRENCH; THE U.S. INTERVENTION IN NICARAGUA IN 1927; THE REPRISALS BY BRITISH PUNITIVE FORCES IN A NUMBER OF AREAS IN INDIA AND BURMA IN 1930-32; THE JAPANESE AGGRESSION AGAINST CHINA SINCE 1931; ITALY'S WAR AGAINST ETHIOPIA IN 1937; THE SEIZURE OF PHILIPINES, INDONESIA AND OTHER COUNTRIES BY JAPAN DURING THE YEAR OF THE SECOND WORLD WAR ETC."

(ADVOCATES OF COLONIALISM. PAGE 221)

ان تفصیلات کی روشنی میں بلا تامل یہ کہہ سکتا
ہوں کہ عبدالغنی کا تجویز کردہ نظام خالص اسلامی ہے' وہ
اسلام جس کا اشتراکیت سے کوئی تعلق نہیں؛ اگر

وصول ہوگیا

ہے تو بادشاہوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں
پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ اسلامی نظامِ معیشت
طبقاتی مفاد کا مخالف ہے۔ سید ابو الاعلیٰ
مودودی لکھتے ہیں:

"اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری
کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس کے سب سے بڑے
ہتھیار کو کند کر دیتا ہے، جس کے ذریعے
سے سرمایہ دار محض اپنے سرمائے کے بل پر
آس پاس کی معاشی دولت کو سمیٹتا چلا
جاتا ہے۔"

(انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ص ۳۵)

"اسلام نے زائد از ضرورت دولت جمع
کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔" (ایضاً ص ۳۶)

زائد از ضرورت دولت وہی ہے جسے مارکس نے قدرِ
زائد (SURPLUS VALUE) کہا ہے اور اس قدر
زائد پر محنت کشوں کا حق ثابت کیا ہے۔ قرآنِ حکیم
کا ارشاد ہے:

"اے پیغمبر! ان لوگوں کی دولت میں سے
صدقہ لیکر اس کے ذریعے انہیں پاک
کر دو۔" (سورۂ توبہ پ ۱۱، رکوع ۲)

"جو اپنے مال راہِ خدا میں اس لئے خرچ
کرتے ہیں تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل
کریں اور ان کے اپنے دلوں میں ایمان کی جڑیں
مضبوط ہوں۔" (سورۂ بقرہ پ ۳، ع ۴)

"حکومت ان تمام لوگوں کی کفیل ہے جن کا کوئی
کفیل نہ ہو۔" (حدیث شریف)

("اسلامی نظامِ معیشت" مصنفہ مولانا صدر
الدین اصلاحی) —

جو تفصیلات CHAIRMAN نے ۱۹۶۸ء میں
پیش کی ہیں، عبد المغنی ۱۹۸۵ء میں لکھ رہے ہیں:

"مصنفہ کو احساس نہیں کہ جس طبقے کی خوب
صورت دنیا کا عکس وہ اپنے افسانوں میں
دکھلانا چاہتی ہیں، وہ در اصل اپنے سماج
اور وقت دونوں سے کٹا ہوا، ایک ایک
گذری ہوئی خیالی دنیا میں سانس لے رہا
ہے، یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ
پر تباہیاں ہو رہی ہیں، ہندوستانی
سیاست ایک آتش فشاں کے دہانے
پر کھڑی ہے، قتل و خون کا بازار گرم ہونے
والا ہے گنگا جمنی تہذیب کے پرخچے
اڑنے والے ہیں اور قرۃ العین حیدر کے
افسانوں کے ایک نمایاں کردار اپنی
فارغ البالی میں گم ہیں۔"

(قرۃ العین حیدر کا فن ص ۱۳)

تفکر، تخیل اور تشدد کی یہ یکسانیت شرمناک کمی
یہاں اشتراکی حقیقت نگاری اور عبد المغنی کی تنقید میں
اسلامی حقیقت نگاری ہے۔

ادب میں اشتراکی حقیقت نگاری کی وضاحت

گیا

کامریڈ رونن آل لکھتے ہیں :
کامریڈ اسٹالین نے سوویت آرٹ کو اشتراکی
حقیقت نگاری کا آرٹ قرار دیا ہے "۔۔۔
اشتراکی حقیقت نگاری فن حقیقت
نگاری کی سب سے ترقی یافتہ شکل ہے،
یہ فن کار کو سماجی زندگی کے محرکات سے واقف
کرا کے نئی بینائی عطا کرتی ہے اور وہ طبقات
کی جدوجہد اور تاریخ میں عوامی کارناموں
کو دیکھ سکتا ہے، سیاسی جدوجہد کی اہمیت
کو دیکھ سکتا ہے۔ اس طرح سرمایہ داری کے
خلاف اشتراکیت کی عالمگیر جدوجہد میں ادب کے
کے صحیح مقام کا تعین ہوتا ہے۔"

(علم و دانش، ستمبر ۱۹۴۹ء ص ۳۴)

عبدالمغنی لکھتے ہیں :۔
"فنکار کے لئے زیادہ اہمیت کس چیز کی ہے؟
مواد کی یا ہیئت کی، عام طور پر جدید فنکار
مواد کی قیمت پر ہیئت کو اہمیت دینے کی
طرف مائل ہیں، یہ ایک غلط انداز فکر و عمل
ہے،..... جس فن کار کے پاس کہنے کو کچھ
ہوتا ہے وہی اپنے کہنے کے انداز کو زیادہ سے
زیادہ پُراثر بنانے کی کوشش کرتا ہے،
یہاں تک کہ ایک قسم کا تبلیغی مشن اس کے
پیش نظر ہوتا ہے، اور وہ اپنے پیغام کو
مؤثر بنانے کے لئے اپنے کلام کی بہتر سے
بہتر تزئین و ترتیب کرتا ہے۔"

"ابلاغ کا سارا معاملہ فنکار اور
اس کے قاری کے درمیان رابطے پر مبنی ہوتا
ہے، متکلم پاگل ہوگا اگر اس کا کوئی مخاطب
نہ ہو۔ جس فن کار کے پاس کہنے کو جتنے کچھ
سرمایہ ہوگا اس کی زبان اتنی ہی مالا مال
ہوگی۔" (قرۃ العین حیدر کا فن ص ۱۱۱)

"فن کا چہرہ اسی وقت ابھرتا ہے جب فن کار
کے ذہن کی سمت متعین ہو۔" (ص ۱۱۵)

اقبال کے احترام آدمی کے پیچھے تو اسلام
کا پورا فلسفۂ حیات ہے۔ قرۃ العین کا ہیومن
ازم کس نظامِ فکر پر مبنی ہے؟ کہا جا سکتا
ہے کہ فلسفۂ حیات اور نظام فکر کی کوئی
ضرورت نہیں، بس ایک مجرد خوش اخلاقی
کافی ہے۔ خواہ فلسفہ و نظام کچھ بھی ہو یا
کچھ بھی نہ ہو، یہ جواب ایک سادہ لوحی اور
بے خبری پر مبنی ہے، اس لئے کہ اخلاق
کسی تصورِ حیات کی عملی شکل ہے، خواہ وہ
باشعور تعلیم کی بجائے صرف تربیت و عادت
ہی سے کیوں نہ حاصل کیا گیا ہو، تہذیب
کا بے ساختہ اظہار عادۃً ہی ہوتا ہے
لیکن تہذیب کی کچھ قدریں ہوتی ہیں، جو
دراصل اصول ہیں حیوانی جبلتیں نہیں۔ اور
اقدار و اصول کا معاملہ سرتاسر نظریاتی

سے تعلق رکھتا ہے جو اقدار و اصول کا منبع و
محور ہے۔" (قرۃ العین حیدر کا فن ص۱۶۵)
زندگی ادب اور فن، متکلم اور مخاطب کے درمیان
باہم، اخلاق و تہذیب، اصول و نظریہ، کے بارے میں
غنی کا یہ موقف اسلامی حقیقت نگاری ہے۔ وہ
کار اور ادیب جو نہ اسلام کی طرف ہیں، نہ اشتراکیت
رف صریحاً سرمایہ داری کی طرف ہیں۔ انہیں لوگوں کے
ے میں عبد المغنی نے لکھا ہے:
"ناوابستگی فقط مہمل گوئی اور نااہلی اظہار
نیز افلاسِ خیال کا بہانہ ہے۔" (ص۱۱۵)
جارج برنارڈ شاہ نے ادب و فن کے معاملے میں
جانبداری اور وابستگی کی حمایت میں قطعی مجاہدانہ انداز
یصلہ کن بات کہی ہے:
"جس کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے وہ اسلوب
کو بڑھانے کے لئے اس حد تک جائیگا جس
حد تک بات کی اہمیت اور اس کا اعتقاد لے
جائیگا۔" (مقدمہ مین اینڈ سپر مین بحوالہ قرۃ
العین حیدر کا فن)
یہ ہوا کہ بات اور اعتقاد تخلیقِ فن کا منبع و محور ہیں۔
جس کے پاس اعتقاد ہوگا اس کے پاس بات ہوگی، گمراہ
بے سمتوں کا کوئی اعتقاد ہے نہ کوئی بات۔ لہٰذا گمراہوں
بے سمتوں کے پاس نہ اعتقاد ہے نہ بات۔
اقبال اور قرۃ العین حیدر کے درمیان کھوئے ہوؤں
کی جستجو" میں کچھ اشتراک ہے۔ اقبال کا ماضی ابوذر

غفاری کا فقر ہے۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں اودھ کے
جاگیردارانہ نظام کی تلاش۔ خود ہندوستان میں اس نظام اور
نوآبادیاتی تسلط کے خلاف جو جنگیں لڑی گئی ہیں، مالابار
میں برطانوی سامراج کے خلاف موپلا کسانوں کی بغاوت،
تلنگانہ کا کسان اندولن، عصر حاضر میں مغربی بنگال میں
مارکسی لیننی و چاردوں سے لیس کسانوں اور مزدوروں
کی مسلح جدوجہد، ان کا تذکرہ تک اردو کے بڑے
ناولوں "آگ کا دریا"، "اداس نسلیں"، یا "خدا کی بستی"
میں نہیں ہے۔ اس پس منظر میں ان فکشن نگاروں کے
بارے میں عبد المغنی کے الفاظ میں یہ کہنا درست ہے:
"جاگیردارانہ نظام کی خاکستر پر تعمیر ہونے
والے طبقے کا معاشرہ ہے۔ جو طبقہ امرار
سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو اپنا آدرش
سمجھتا ہے۔" (ص۳۷)
اس تجزیے کی بنیاد پر کیا یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ قرۃ العین
حیدر، عبد اللہ حسین اور شوکت صدیقی بورژوا
فکشن رائٹر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبد المغنی نے بار بار اس
نکتے پر زور دیا ہے کہ:
"کیا قرۃ العین حیدر مستقبل سے منہ موڑ کر
ماضی ہی میں سانس لینا چاہتی ہیں یا ان
کے نزدیک مستقبل صرف ماضی کا نیا ظہور
ہے۔" (ص۶۰)
جب مغربی بنگال میں مارکسی لیننی آدرشوں سے
مسلح جوانوں نے پرچم آزادی لہرا دیا تو ہونا ان کے

…نے …میں ان کا خیر مقدم کیا :-

"WE PEOPLE OF SHAOSHAN ALONG WITH PEOPLE OF THE WHOLE COUNTRY ARE FIRMLY CONVINCED THAT ONCE MARXISM-LIENINISM-MAOTSETUNG THOUGHT IS INTEGRATED WITH THE CONCRETE CONDITION OF INDIA, IT WILL GENERATE A POWERFUL FORCE AND BECOME A SPIRITUAL ATOMBOMB OF INFINITE POWER, WHAT EVER PLOTS AND SCHEMES THE REACTIONARIES RESORT TO THEY CAN IN NO WAY PREVENT THE RAPID DEVELOPMENT OF THE REVOLUTIONARY STORM IN INDIA."

(PEKING REVIEW NO-32-1969)

ہندوستان کے بڑے اور موٹے موٹے ناول تخلیق کرنے والے فکشن

ڈاکٹر قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، حیات اللہ انصاری کا لعدم شوکت صدیقی جیسے ہی کیا ان کی خاموشی الفتہ کا سبب یا محرک؟ اس کا جواب ماؤزے تنگ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے :-

"WORKS OF LITERATURE AND ART AS IDEOLOGICAL FOQOUS ARE PRODUCTS OF THE REFLECTION IN HUMAN BRAIN OF THE LIFE OF A GIVEN SOCIETY."

(SELECTED READING FROM THE WORK OF MAUTSETUNG PAGE 265)

عظیم روسی ناول نگاروں نکولائی آستراوسکی اور الکزنڈر فدائیف کے مقابلے میں اردو کے ناول نگار قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور شوکت صدیقی بونے نظر آتے ہیں اور عالمی ناول نگاروں میں ان کا کوئی شمار اب تک نہیں ہے۔ ان کے یہاں تو کوئی ہوری بھی نہیں جو پریم چند تخلیق کر کے چلے گئے۔

جو بات ماؤزے تنگ نے ۱۹۴۲ء میں کہی تھی تخلیق ادب و فن کا دہی نقطۂ نظر عبدالمغنی ۱۹۸۵ء میں پیش کرتے ہیں کیونکہ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر ہندوستان آج بھی نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ یعنی پیرو استبداد کے شکنجے میں گرفتار ہے،

گیا

...کے خیال کردار صرف اُوپری طبقے سے
...ر رکھتے ہیں۔ اور نچلے طبقے کے ساتھ ان کا
...ق تصور لمس کا ہمدردی کے سوا کچھ نہیں،
...اناول میں طبقاتی شعور کی جھلکیوں کے
...جوڑ موضوع بنایا گیا ہے، مٹتے ہوئے اعلیٰ
...قے یا اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے کو، اس سے
...بڑھ کر یہ کہ مصنف کے سامنے مزدوروں
...کسانوں کی زندگی کا کوئی نصب العین
...نا ملکہ مطمحِ نظر یا تو آسودہ حال ماضی کے
...رات کی تہذیبی اقدار ہیں یا ایک مبہم سے
...مستقبل کا خوابِ پریشاں"۔

"یہ اعلیٰ متوسط طبقے کے خوشحال اور
...باش نوجوان ہیں جو زندگی کو ایک تفریح،
...کھیل اور ایک تماشہ سمجھتے ہیں"۔
"انکا فلسفۂ حیات بالکل کھوکھلا بجز
...یا مجہول ہے"۔

قرۃ العین حیدر کا فن ص ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴)
...نقطۂ نظر کی رُو سے عبدالمغنی کا تنقیدی نظام،
...تفکر و تجربے ملا ہے۔ اور اسلامی تفکر نے انکے
...ناتی شعور پیدا کیا ہے جس کی بصیرت و فضیلت
...ہی مسلمہ ہے۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں
...بت اور اسلام کے درمیان سرمایہ داروں نے
...اور مفادی تحفظ کے لئے جو تنازعہ کھڑا کیا ہے
...یریاں ٹوٹتی نظر آرہی ہیں۔ اگر ہم نے خالص اسلامی

نادیدۂ نگاہ کے ساتھ دُنیا سے سرمایہ داری کو مٹانے
کے لئے جدوجہد کی تو اشتراکی اپنے اصولوں کی روشنی
میں سرمایہ داری کو مٹا دیں گے، اور اس راہ میں جو روڑے
بھی کھڑے کئے جائیں گے انھیں اشتراکیت کا سیلاب
بہالے جائیگا۔

اسلامی تفکر کے راستے سے عبدالمغنی بھی بصیرت و
عرفان کی اس منزل پر پہنچے ہیں:

"یہ شاید قانونِ مکافات کے تحت قدرت
کا انتقام ہے۔ نوع عذر ایسے جیرہ دستان
سخت ہیں فطرت کی تعزیریں"۔ ص ۱۸۳

اگر جیرہ دستوں نے اپنے رویّے میں تبدیلی نہیں کی تو قانونِ
مکافات کی گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ قانونِ مکافات
مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کرتا، اس کی نگاہ
عدل ظالم و مظلوم دیکھتی ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:
"اے ایمان والو! اگر تم واقعی معنوں میں
مسلمان ہو تو اللہ سے ڈرو، اور تمہارا
جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو،
ورنہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
بر سرِ جنگ سمجھ لو۔" (پ ۳، ع ۶)
یہی بر سرِ جنگ "قانونِ مکافات" ہے اور یہی اسلامی
حقیقت نگاری۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تنقیدی نظام
جدلیاتی ہے۔ اور ان کے الفاظ میں یہ انکی روحانی
جدلیات ہے۔

مولانا حاذق ضیائی سہسرامی راقم الحروف کے

انہوں نے تسلیم کیا

... اپنے مکتوب میں مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں ان (عبدالمغنی) کی فکر اصلاً
مابعد الطبیعاتی ہے۔"

لیکن عبدالمغنی کی ادبی تنقیدوں کا مطالعہ جہاں تک میری رہنمائی کرتا ہے، میں عازم صدیقی صاحب کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ خود عبدالمغنی نے اپنے فکر کا اصل ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"یہی وہ روح اور روحانی جدلیات ہے جس
پر دنیا کی ہر تہذیبی کشمکش مبنی ہے اور
جس کے نتیجے میں تاریخ کے انقلابات رونما
ہوئے ہیں۔ اور ارتقائے حیات کا بھی سامان
ہوا ہے۔ جس سے گریز کوتاہی شکست اور مسائل
زندگی سے فرار ہے۔"

("اقبال اور عالمی ادب" ص ۳۸)

یہی وجہ ہے کہ عبدالمغنی کی تنقیدوں میں زندگی ... کے آثار کثرت سے پائے جاتے ہیں، یہی آثار ان کی تنقیدوں میں جدلیاتی نظام کے اساس ہیں:

"حیات کی ارتقا کی کوئی حد نہیں، ہر منزل
ترقی کے بعد ایک اور بلند تر منزل کا تصور
کیا جا سکتا ہے۔" (ایضاً ص ۱۰۲)

"کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون"

کیا یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی ارتقائے حیاتِ انسانی کا تصورِ جدید نہیں ہے؟ اور کیا اسی کو ادب میں اسلامی حقیقت نگاری نہیں کہا جا سکتا ہے؟ اور اگر اشتراکی اسی جدید کے تصور کو اشتراکی حقیقت نگاری کہتے ہیں تو اس قدر حیرانی پانے کی ضرورت کیا ہے؟ ادب میں اسلامی حقیقت نگاری کو اس قدر فروغ دینے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ سرمایہ دارانہ ابہام نگاری کا طلسم توڑا جا سکے۔ "ادب ابہام نہیں ابلاغ ہے" (ع۔ح) "ادب وحشت کا نام بھی نہیں، یہ ایک مہذب عمل ہے" (ع ح)۔ اور تہذیب کے پیچھے ہمیشہ اخلاقی قدروں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہ صرف ادب و فن کے لئے نہیں، تنقید کے لئے بھی ضروری ہے۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے اسی ہنرمندی پر زور دیا ہے:

"ادبی تنقید کی تکمیل ایک متعین اخلاقی اور
دینی موقف سے کی جانی چاہیئے۔"

اور برنارڈ شاہ کے نزدیک اسلوب کی طاقت کے لئے اعتقاد لازمی ہے۔ عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"فن ایک قدرِ جمال اور ایک مظہر تہذیب ہے۔
اس میں ہیئت اور تکنیک کے ہر تجربہ کو جمالی
تہذیب کا آئینہ دار ہونا چاہیئے، کریہہ،
کرخت اور بھونڈا نہیں ہونا چاہیئے۔"

(قرۃ العین حیدر کا فن ص ۱۱)

ظاہر ہے کہ یہ قدرِ جمال اور مظہر تہذیب کسی مضبوط عالمگیر اخلاقی اور دینی موقف کے بغیر ممکن نہیں اور اخلاقی اور دینی موقف جدلیاتی تفکر و تفلسف کا محتاج ہے۔ عبدالمغنی روحانی جدلیات کے ہم نوا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی نظام کی آراستگی اور شائستگی میں اسلامی

حقیقت نگاری کی جلوہ گری ہے۔ چونکہ روح کا ظہور مادہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے روحانی جدلیات' مادی جدلیات کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا (غالب)

عبدالمغنی کی اسلامی بصیرت اور تفکر انہیں نہ صرف یہ کہ اپنے سماج سے وابستہ رکھتی ہے بلکہ یہ بھی کہ ملکی اور بین الاقوامی تحریکات اور صورتِ حال پر ان کی نگاہ کو عمق عطا کرتی ہے اور اسی کو زبانِ نبوت سے مومن کی فراست کہلوایا گیا ہے اور جس سے ڈرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک وہ ادیب جو اپنے سماج سے کٹا ہوا ہے۔ تخلیق و تنقیدِ فن کی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا' نہ زندگی اور معاشرے کا فن ادا کر سکتا ہے' یہ قطعی اسلامی نقطۂ نظر بھی ہے کیونکہ اسلام عوامی دین ہے' اور عوام کی تمام ضرورتوں' خواہشوں اور تمناؤں کا حل ایک مکمل انسان کی تہذیب و ترتیب کا سامان اور معاشرے کی بصیرت افروز تطہیر کا سرمایہ اس میں موجود ہے۔ عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"غریبوں اور کمزوروں سے ہمدردی' ظلم کے خلاف احتجاج' استحصال سے نفرت' سماجی انصاف کی طلب یہ سب اخلاقی باتیں مذہبی بھی ہو سکتی ہیں' خاص کر اسلامی۔"
(قرۃ العین حیدر کا فن ص ۹۹)

اسلامی فکر کی عطا کردہ اسی سماجی بصیرت اور معاشرتی شعور اور سیاسی حکمت نے عبدالمغنی کو آسانِ مشرق پر سایہ فگن سامراجی اور نو آبادیاتی نظام و تسلط کے خلاف آواز احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ان کا یہ حوصلہ مندانہ تنقیدی آہنگ "اقبال اور عالمی ادب" میں زیادہ کر و فر کے ساتھ رواں دواں ہے۔ "قرۃ العین حیدر کا فن" میں بھی یہ بے محابا بے باکانہ اظہار کر دینے کا حوصلہ کرتی ہے' اسکی بنیادی وجہ "اقبال اور عالمی ادب" کے درمیان فکر و احساس کا تضاد ہے۔ اقبال زندگی بھر برطانوی سامراج اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف لکھتے رہے' اور قرۃ العین حیدر عبدالمغنی کے الفاظ میں:

"خود افسانہ نگار کی ذہنی رگ سامراجی تہذیب ہے' جو اودھ اور لکھنؤ میں گومتی کے کنارے پروان چڑھی تھی اور جس ماحول کا تنقیدی تجزیہ وہ کر رہی ہیں اس کی ایک نمائندہ اور گرویدہ وہ خود بھی ہیں۔" (قرۃ العین حیدر کا فن ص ۴۸)

امرا اور غربا کے درمیان فرق و امتیاز کا یہ شعور عبدالمغنی کی تنقید نگاری میں اسلامی حقیقت نگاری کی بصیرت مندی کا اظہار ہے جس کے سوز و ساز سے اور مروسامان سے اکثر ناقدین بے بہرا ہیں۔ یہ امتیاز و سربلندی عبدالمغنی کا طرۂ امتیاز جہاں نہ ہو' نشانِ فضیلت ضرور ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو' مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مانک ٹالہ
ای-۱۰- سینسیڈ اپارٹمنٹ- پالی ہل- کھار- بمبئی

اُوپندر ناتھ اشک اور اُردو

اُردو کے بیشتر قارئین کی طرح میں بھی اشک صاحب کو صرف اُردو کا ادیب ہی سمجھتا تھا۔ ملک کی آزادی اور اس سے بھی پہلے بمبئی میں منتقل ہونے سے پہلے اشک، کرشن چندر اور منٹو آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں لازم تھے۔ ریڈیو میں کرشن چندر اور منٹو بطور اُردو ادیب کام کرتے تھے۔ لیکن اشک صاحب بطور ہندی صلاح کار یا ہندی ڈرامہ نویس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ بات مجھے "نقوش" کے "منٹو نمبر" میں اشک صاحب کے منٹو کے بارے میں ایک مضمون سے معلوم ہوئی تھی۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد اشک صاحب نے زیادہ تر ہندی میں لکھا۔ الہ آباد میں انھوں نے اپنا اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا۔ اس ادارے سے بیشتر ہندی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ سوائے اشک صاحب کی سبھی کتابیں ان کے اپنے ادارے سے شائع ہوتی رہیں۔ چند برس پہلے انھوں نے اپنی اُردو کی تین چار کتابیں بھی شائع کی ہیں۔

اشک صاحب سے مجھے ابھی تک شرف ملاقات حاصل نہیں ہوا ہے۔ نہ ہی اُن سے میری خط و کتابت تھی۔ پچھلے سال منشی پریم چند پر میری تحقیقی کتاب "پریم چند اور تخلیقات پریم چند" شائع ہوئی تو میں نے انکی خدمت میں بھی کتاب کی ایک جلد ارسال کر دی۔ اسی سے ہماری خط و کتابت کی ابتدا ہوئی۔ انکے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انتہائی سلجھے ہوئے اور متوازن ذہن کے انسان ہیں۔

لیکن وہ کسی کی بدکلامی، بدتمیزی یا رعونت کو بھی ہضم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ منٹو اور ان کے بعد فراق صاحب نے ان کے ساتھ کچھ نا روا سلوک کیا تھا۔ جو تہذیب کی حدود سے باہر تھا۔ اشک صاحب نے ان حضرات کو ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ ان واقعات کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے ـــــ ملک کی تقسیم کے بعد حالات اس حد

تک مہرل کئے گئے تھے کہ اُردو کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندی والے اپنی متعصب ذہنیت کا کھلے عام مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ان حالات میں اگر اشک صاحب چاہتے تو ہندی میں سستی شہرت حاصل کرنے کی خاطر اُردو اور اُردو کے ادیبوں کے خلاف اور ہندی والوں کے موقف کی حمایت میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔

لیکن انکی حق پرست اور صاف گو ذہنیت نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ بلکہ انہوں نے ہندی ادیبوں کے موقف پر ہی اردو کے بارے میں ان کے غلط اور متعصب رویے کی مخالفت کی اور معتوب ہوئے۔

سال سوا سال پہلے میں نے کہیں یہ خبر پڑھی تھی کہ ہندی اور اُردو کے ادیبوں کی ایک مشترکہ میٹنگ میں اُردو کے خلاف ہندی کے ادیبوں نے کچھ اوٹ پٹانگ اور اشتعال انگیز باتیں کہیں۔ اس مجلس میں موجود اُردو کے سبھی ادیب بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ کسی نے بھی اس غلط رویے کے خلاف پروٹسٹ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن اشک صاحب نے ہندی کے ان خود غلط قسم کے ادیبوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اشک صاحب سے میری خط و کتابت شروع ہوئی تو میں نے اس خبر کے متعلق مکمل تفصیل جاننے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے جواباً تحریر فرمایا:

"اُردو کے مسئلہ پر تو میں پچھلے دنوں کئی جگہ بولتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے جس میٹنگ کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ یونیورسٹی کا ایک سیمینار تھا جس میں زبان اور قوم کی یک جہتی پر تبادلۂ خیال کیا گیا تھا۔ اور وہیں میں نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ میں ذرا وقت نکال کر (جو آج کل ناول لکھتے لکھتے میرا ہاتھ رکا) آپکو اپنے خیالات لکھ بھیجوں گا۔"

اشک صاحب ۱۹۶۴ء سے ہندی ساہتیہ سمیلن کے اکزیکیٹیو وائس پریسیڈنٹ چلے آرہے تھے۔ جب اُتر پردیش اسمبلی میں وشو ناتھ پرتاپ سنگھ منتری تھے۔ اور اُردو کو دوسری بھاشا بنانے کا بل پیش ہوا تھا۔ تو ہندی ساہتیہ سمیلن میں اس بل کی مخالفت کا ریزولیوشن پیش ہوا۔ اشک صاحب اُردو کے بھی ادیب ہوتے ہوئے نہ اس بل کی مخالفت کر سکتے تھے نہ تائید۔ اگر وہ موقع پرست ہوتے تو کان لپیٹے بیٹھے رہتے۔ اور اپنے عہدے پر ڈٹے رہتے۔ لیکن انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا کہ ہندی والوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا اسی لئے اُردو کو دوسری بھاشا بنانے کی مانگ اٹھی ہے۔

اشک صاحب نے اُردو میں اپنا ادبی کیریر ایک شاعر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ ان کا تخلص بھی اسی بات کا شاہد ہے۔ لیکن استاد کی کوئی بات ناگوار گذری [illegible] انھوں نے نثر کی طرف رجوع کیا۔ اور ہزاروں ہزار صفحے لکھ ڈالے۔ ہندی میں

اہندی سمیلنوں کی

ناول اور افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ان کی ہندی نظموں کے بھی آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور نواں مجموعہ طباعت کے آخری مرحلوں پہ ہے۔

مصلحت کوشی اور موقع پرستی اشک صاحب کا کبھی شیوہ نہیں رہا۔ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں برملا زبان پہ لے آتے ہیں۔

ہندی ساہتیہ سمیلن میں قانون سے متعلق ایک پریس کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس میں ایک کوی سمیلن بھی تھا۔ وہاں اشک صاحب نے اپنی کویتا پڑھنے سے پہلے ہندی کے ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہندی والے اردو کو ہندی کی شیلی (اسلوب)
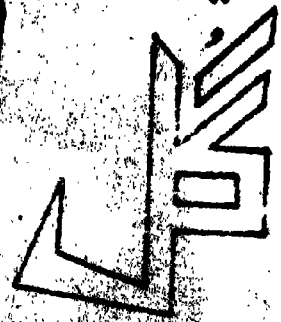
سمجھتے ہیں تو آج تک انھوں نے اردو ادب کو ہندی میں کھپانے کے لئے اقدامات کیوں نہیں کئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اشک صاحب اپنی نظم سنا کر چلے گئے۔ تو بے دھڑک بناری نے انہیں بھی بھر کر گالیاں دیں۔ اس واقعے سے متعلق انھوں نے ہندی میں ایک نظم لکھی ہے۔ ظاہر ہے ہندی میں تو یہ چھپ نہیں سکیگی۔ اسلئے ان کی یہ کویتا میں اردو کے قارئین کی نذر کرتا ہوں ؎

بلا دھڑک جی گرجے

سمیلن کے منچ

اشک ہندی والوں کو کوس رہا تھا

اردو کا ساہتیہ کرشن میں یہ ہندی کے
لفت

سجا نہ پائے
کہتے سب ہیں اردو کو ہندی کی شیلی
یہ اس کو چھپا نہ پائے
کتنی پیڑھیاں اردو بھاشی پریواروں کی
پڑھتی رہیں شروع سے ہندی
بھول گئیں اردو کی ابجد
ان کے من کی بھوک مٹانے
دھرم گرنتھ ان کے ہندی میں چھپا نہ پائے
اردو کے رچناکاروں کو (تخلیق کاروں)
ہندی میں یہ کھپا نہ پائے
اور ہندی کے اتہاسوں میں (تواریخوں)
پاٹھیہ کرموں میں (نصابوں)

برج، اودھی، راجستھانی اور بھوجپوری تو سب پڑھاتے
ہندی کی اردو شیلی کو پڑھا نہ پائے
صدیوں کا اردو سرمایہ
ہندی میں جب کہیں نہ دیکھے
کیوں نہ اردو والا چیخے
تبھی بن رہی آج دوسری بھاشا اردو
پتہ نہیں اب کیا ہوگا
جب ہیں دشمن ہندی والے ہی ہندی کے

کہہ کر اپنی بات اشک جب
کشٹھا جب کر اٹھ آیا
کومل کاشی کا پلا دھڑک اٹھا تب

مٹھائیاں اور ٹافیاں

موڈی
دھلائی کا
صابن
MODI
پنجاب سوپ فیکٹری

مجھے یاد ہے

مشتاق احمد نوری

مجھے یاد ہے
وہ لمحہ، وہ دن
اور موسم کی خوشبو
مجھے یاد ہے
اپنے تن من کی تکلیف وہ خواہش
اور اس کا اندرونی کشمکش
مجھے یاد ہے
میری زندگی کے ذرات
کس طرح انگلیوں کے شگاف سے
پھسل گئے
کس طرح سورج اور چاند کی شعاعیں
گم ہو گئیں
اور میں دبیز تاریکی کے غار میں دفن کر دیا گیا
تب سے آج تک
خاموش اور ویران گھاٹیوں میں
پتھریلی دنیا پڑا ہے
میری خوابیدہ روح چونک کر بیدار ہو گئی ہے
مجھے یاد ہے

کس طرح پانی سے بھرا ہوا آوارہ بادل
نیلے آسمان کی وسعتوں میں پھیل گیا
میری آنکھوں کی امنگیں اور خواہشیں دم توڑ گئیں
اور کس طرح میں نے اپنے خوابوں اور جذبات کا
گلا گھونٹ دیا
مجھے یاد ہے
کس طرح رشتوں کی باریک دھار
زہریلے چاقو میں تبدیل ہو کر
میرے کلیجے میں اتر گئی
خون ابلنے کا سوال ہی نہیں
کسی نے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں دیکھا
اور نہ ہی کسی نے میرا کراہنا سنا
خاموش اور تنہا
میں اپنی زندہ لاش کے نزدیک
بیٹھا ہوں
یادیں
ہمدردی اور محبت کا اظہار کر رہی ہیں
چیخیں اور سسکیاں
جاچین کر رہی ہیں
نگاہیں اننت کی اور تکی ہوئی ہیں
اور میں بڑبڑا رہا ہوں
مجھے یاد ہے
مجھے... یاد... ہے!!

ہوا

ہندی: مکیش پرتیوش

اردو: [illegible]

ہوا......
گزر رہی ہے
تو ننھی منی جھاڑیوں سے کیوں؟
درختوں سے گزرو
تاکہ
کم از کم
غرور سے اکڑی گردن کو
بدلتے وقت کا احساس تو ہو جائے

ہوا......
حرکت دینی ہی ہے
تو کھڑکھڑا کر بکھر جانے والے دیمک
زدہ پتوں کو کیوں!
پرواز دو بند کھڑکیوں کو
تاکہ
کم از کم
وہ حامی بھر دا کر
تالیاں پیٹنے والوں کی

منصور اعجاز (دو نظمیں) مہاراشٹر

جمہوریت، استحصال

.....پھر پیاسا
گھڑے کے تھوڑے پانی کو
کنکر سارا پی گئے
کوا جنگل جنگل بھٹکے
اتنی زیادہ محنت کرکے
پھر بھی پیاسا رہ گیا

بچپن کی وہ کہانی
کتنی حقیقی، کتنی سچ تھی
اور ہزاروں ایسے قصے
بھاگے لیکن چھوٹ گئے
میرا کچھ بھی کیسا ٹھیک ہے
چھوٹا بھی تو ننگا ٹھیک ہے

فنکار

تحریر کی آگ میں جلنے والے
فن کے آداب کو چھوڑ
[تو اس دور کا المیہ ہے]
تیرے فن میں
سورج، صحرا، جنگل، چشمہ
چہرہ، سایا، خوشبو، سراب
نقادوں کو خوش کرنے کے لئے
سب کچھ ہے۔
گیت، بھجن کے گانے والے
اندھے گویے.....
نگری نگری، بستی بستی
میلوں میں، بازاروں میں
گلی گلی، چوراہوں میں
آخر سب کا بک جائے گا.....

ایک شراب کی بوتل پینے
آس کی نگری کو چمکانے
اپنی کہانی اور گیتوں کو
فنانسروں کی بھینٹ چڑھا کر
کن کن ناموں سے بیچے گا.....

ریڈر شپ کو اسکالرشپ کی
پی ایچ ڈی کی دھاک جما
ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ جیسے عہدے
یا ایسے ہی.....
سب بک جانے والوں کو خرید
تحریر کی آگ میں جلنے والے
فن کے آداب کو چھوڑ !

جگن ناتھ آزاد

غزلیں

کافر بھی نہ تھے صاحبِ ایماں بھی نہیں تھے
ہم راہ سے بھٹکے ہوئے انساں بھی نہیں تھے

ہر شخص کو مانا کہ نظر آ نہ سکے ہم
پر دیدۂ مشتاق سے پنہاں بھی نہیں تھے

جو تو نے کیے ہم سے سوال اے دلِ پُرفن
مشکل تو نہیں تھے مگر آساں بھی نہیں تھے

ہم جتنے پریشان بظاہر نظر آئے
ہم اتنے بہرحال پریشاں بھی نہیں تھے

کانٹوں بھرے رستے سے تو بے گانہ رہا میں
لیکن مرے رستے میں گلستاں بھی نہیں تھے

بالا نہ ہوا گرچہ کبھی نرخ ہمارا
بازار میں لیکن کبھی ارزاں بھی نہیں تھے

●

کبھی گزشتہ جو دن رات یاد آتے ہیں
عجیب طرح کے حالات یاد آتے ہیں

لباسِ رنگ و نوا جو پہن کے آئے تھے
وہ سب فسون و طلسمات یاد آتے ہیں

نگاہِ شوق نے کھائے تھے جو فریب اُن پر
خود اپنے دل کے جوابات یاد آتے ہیں

زبانِ گل کی خموشی نے شورِ دریا نے
دیے تھے جتنے پیامات یاد آتے ہیں

ہمیں بھلا تو نہ دو گے کسی نے پوچھا تھا
کچھ اس طرح کے سوالات یاد آتے ہیں

یہاں پہ رات، یہاں دوپہر گزاری تھی
سفر میں کتنے مقامات یاد آتے ہیں

زباں پہ سچ کے سوا کچھ نہ تھا جب اے آزاد
وہ نیم پختہ خیالات یاد آتے ہیں

سیدہ شانِ معراج

کیا دیکھتا ہے حال کے منظر، اِدھر بھی دیکھ
ماضی کے نقش، یاد کی دیوار پر بھی دیکھ

دیکھے ہیں میرے عیب تو میرا ہنر بھی دیکھ
سودا ہے جس میں اپنی انا کا، وہ سر بھی دیکھ

لے کام مجھ سے سخت اڑانوں کا تو، مگر
پہلے مری نگاہ، مرے بال و پر بھی دیکھ

چہرے کے رنگ و نور کو میرا ہنر سمجھ
مجھ کو مری غزل سے کبھی جھانک کر بھی دیکھ

اک بار بچ کے اور زمانے کی آنکھ سے
ہوں دیکھنے کی چیز تو بارِ دگر بھی دیکھ

ماضی کے جلتے بجھتے چراغوں کے سلسلے
دل میں ہیں داغ داغ اجالوں کے سلسلے

ہیں پیاس کے ندیم، سفر کے شریک ہیں
صحرا میں ساتھ چلتے سرابوں کے سلسلے

جوڑے میں قید ہو تو گیا انگلیوں کا لمس
رخصت مگر ہوئے وہ گلابوں کے سلسلے

مجھ کو مری نظر کے زیاں کا حساب دیں
بے رنگ و نور و آب نظاروں کے سلسلے

یادوں کا دشت برف کے خیموں میں چھپ گیا
روشن کہیں کہیں ہیں ستاروں کے سلسلے

غزلیں

ملک نواز جاوید احمد

ہمارے نام سے شہرت ملی ہے
ہمیں خیرات میں عزت ملی ہے

میں جس دن سے لگا ہوں نوکری پر
مرے اس باپ کو راحت ملی ہے

وہ اب برباد ہو کر ہی رہے گا
اسے اجداد کی دولت ملی ہے

بس اتنا ہی بتا دے میرے قاتل
تجھے اس سر کی کیا قیمت ملی ہے

ہمارے بارے میں کچھ سوچنے کی
بزرگوں کو کہاں فرصت ملی ہے

لکیریں دیکھ کر بولا نجومی !
بہت اچھی تمہیں قسمت ملی ہے

○

عمران عظیم

وہ بزرگوں کی وراثت کیا ہوئی
شہر میں اپنی عمارت کیا ہوئی

چاند کو چھونے کی ضد کرتے نہیں
شوخ بچوں کی شرارت کیا ہوئی

ریل کے چلتے ہی آنکھیں بجھ گئیں
ماں کی حالت وقتِ رخصت کیا ہوئی

کچے دھاگے ہیں یہ رشتے خون کے
وہ گلے اور وہ شکایت کیا ہوئی

ہر طرف ہیں یاس کی پرچھائیاں
بے سبب ہنسنے کی عادت کیا ہوئی

وقت کے ہاتھوں میں خنجر ہے عظیم
اب وہ بھولی شان و شوکت کیا ہوئی

○

شفیق بستوی

نام سے کس کے میں ساون کی حسیں رات لکھوں
بھیگتے دل کے امنڈتے ہوئے جذبات لکھوں

اک تبسم اگر موقوف ہو رونے پہ مرے
حق میں تیرے خوشی اپنے لئے آفات لکھوں

اک جھلک حسنِ سحر خیز کی دیکھی تھی مگر
سوچتا ہوں کہ اسے جانِ طلسمات لکھوں

یاد آتا ہے وہ شام اودھ کا منظر
جب کبھی اس کی پرانی وہ ملاقات لکھوں

کوئے لیلیٰ سے جو مجنوں کا جنازہ نکلا
کوچۂ حسن سے جاتی ہوئی بارات لکھوں

دہر میں کون ہے بِلا مثالِ یوسفؑ
جس کی الفت میں زلیخا کی حکایات لکھوں

زندگی ہو گئی افسانہ در افسانہ شفیق
کس طرح اپنی محبت کی حکایات لکھوں

○

خواجہ عبدالرزاق
وارڈ ۱۱، اسٹرائیک ہائیل روڈ، ساکچی، جمشید پور

ریحانہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ باپ کی دولت نے اس کے مزاج میں نخوت اور غرور کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اسے عام عورتوں کی طرح مرد کے ہاتھ کا میل اور پاؤں کی جوتی بننا پسند نہیں تھا۔ وہ مرد کا دل بن کر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ ایسا دل جو چاند کی طرح گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ اور جو اس کی ہر خواہش کو پورا کر سکتا ہو۔ وہ ایسے مرد کی عورت بن کر رہنا چاہتی تھی جس کے پاس بینک بیلنس ہو، عالیشان مکان ہو جس میں ایئرکنڈیشنڈ کمرے ہوں، فریج ہو، ٹی وی ہو، قیمتی فرنیچر اور ضروریات زندگی کی تمام چیزیں مہیا ہوں۔

پرویز کالج میں اس کا کلاس فیلو تھا۔ ریحانہ کی رئیسانہ شان و شوکت اور نمائشی کروفر کو دیکھ کر دل میں پیچ و تاب کھایا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش دن بہ دن گرہ بنتی جا رہی تھی کہ ریحانہ کو اپنے پاؤں کے نیچے کی چیونٹی کی طرح کچل دے مگر یہ کوئی انتقامی جذبہ نہیں تھا۔

وہ ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کی سگھڑ ماں نے اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی شادی کے لئے آہستہ آہستہ زیورات، قیمتی کپڑے اور ضروری لوازمات اکٹھا کر لیے تھے۔ پرویز ابھی بی ایس سی کے آخری سال میں تھا کہ اچانک نمونیہ کے شدید حملے میں اس کی شفیق ماں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بدنصیب پرویز کا مقدر پھوٹ گیا۔ پھر سوتیلی ماں آگئی تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ سوتیلی ماں اسے طرح طرح سے بدنام کرنے لگی۔ باپ کی نظریں بھی بدل گئیں۔ آخر اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس بے سروسامانی میں اس کا کالج چھوٹ گیا۔ اس کی کسمپرسی دیکھ کر اس کی خالہ جان نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ پرویز بہت ذہین اور سمجھدار لڑکا تھا۔ چند ہی دنوں کی تگ و دو کے بعد اسے شہر کے مشہور ڈاکٹر چودھری کے نرسنگ ہوم میں ملازمت مل گئی۔ کچھ دن کے بعد پھر اس نے خالہ جان کی ہدایت پر نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا مگر اتفاق سے اس کا

ہوئی تھی۔ بالکل خاموشی طاری ہوگئی۔ جب تمام لوگ جا چکے تو پرویز ریحانہ کے قریب آکر نہایت خلوص سے بولا۔

"معاف کیجئے گا، ویٹنگ آورس ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ بھی تشریف لے جائیں۔"

ایک اجنبی آواز سن کر یک لخت وہ چونک پڑی جیسے اس کے سر پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اسکا بدن کانپ سا گیا مگر دوسرے ہی لمحے پرویز پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں خفت اور شرمندگی سے بوجھل ہو گئیں۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی وہ پرویز ہے، اپنا ہم جماعت پرویز! آخر بمشکل تمام اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوز می (EXCUSE ME)! جی ہاں جا رہی ہوں۔" ایک بار پھر اس نے باپ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابّو میں جا رہی ہوں کل آؤں گی۔" وہ آہستہ آہستہ قدموں سے باہر جانے لگی۔ پرویز بھی نہ جانے کس خیال میں اس کے پیچھے صدر دروازے تک چلا آیا۔ وہ یکایک دروازے پر رک گئی۔ پرویز اس کی دلجوئی کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کے ابّو پر فالج کا سخت حملہ ہوا ہے۔ ضعیف آدمی ہیں۔ خیر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گے آپ اطمینان رکھیں۔"

ریحانہ کی رحم طلب آنکھوں میں بیچارگی کے آنسو

جھک پڑے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے میرے ابو کی جان بچا لیجئے۔ میں عمر بھر آپکی احسان مند رہوں گی۔ دیکھئے اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں بے موت کے مر جاؤں گی۔"

پرویز نے اس کی آبدیدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت اعتماد سے کہا۔ "ریحانہ اللہ پر بھروسہ رکھئے۔ حیات و موت اسی کے اختیار میں ہے۔ یقین جانئے آپ کے ابو کے علاج معالجہ میں ہم کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ کسی پھلدار شاخ کی طرح جھک کر نہایت انکساری سے بولی۔ "اچھا میں جا رہی ہوں، کل پھر آؤں گی، خدا حافظ!"

"اچھا خدا حافظ!" پرویز دروازے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی ہلکی پھلکی چال چلتے ہوئے اپنی کار میں جا بیٹھی اور کار فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔

ڈاکٹر چودھری کی ہدایت کے مطابق ریحانہ کے باپ کو اسپیشل کیبن میں رکھا گیا تھا اور ان کے علاج پر خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ دو ہفتے کے اندر وہ صحت یاب ہو کر گھر چلے گئے لیکن سہارے کے بغیر وہ تنہا نہیں چل سکتے تھے۔ پرویز ایک دن چھوڑ کے دن انہیں ضرور دیکھنے آتا اور اسی بہانے ریحانہ سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ وہ کبھی کبھی بہت دیر تک بیٹھے خوش گپیاں کرتے رہتے اور ایک دوسرے کے دل کی

[illegible] کو مسرت کرتے، یہ دونوں ہمدرد طاقتیں جب دنیا
میں [illegible] لگیں۔ وہ بے لوث ہمدردیاں دونوں
دلوں میں [illegible] چھوڑتی رہیں۔ نتیجتاً دونوں کے
جوان دلوں میں ایک غیر مرئی درد کا احساس ہونے
لگا۔ اور وہ اپنی تمناؤں کے چراغ روشن کرنے کی
کوشش کرتے۔

ریحانہ کہتی: "پرویز تمہارے بے لوث توجہات
نے میرے ابو کی جان بچالی۔ تمہاری ہمدردیاں، تمہارا
احسان میری رگ رگ میں مچل رہا ہے۔ میں اس کی
تلافی نہیں کر سکتی۔ سچ کہتی ہوں میرا سر بار احسان
سے تمہارے سامنے جھکا رہے گا۔"

"یہ کیا کہتی ہو ریحانہ، پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تم؟"
پرویز نے قدرے ندامت سے کہا: "شفا دینا خدا
[illegible] ڈاکٹر تو صرف ایک ذریعہ ہے۔ [illegible]
[illegible] تمہارے ابو صحت یاب ہو گئے۔ مالک
کا لاکھ شکر ہے۔"

ریحانہ کچھ لمحے سوچ میں کھو گئی تھی۔ تھوڑی
دیر کے بعد بولی: "اگر برا نہ مانو تو ایک بات
عرض کروں کہ تمہارا [illegible] توجہ کی ضرورت ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔
[illegible] ہم دونوں
[illegible] ایک [illegible]۔ دیکھو تمہاری میڈیکل
پریکٹس [illegible] ہے۔ میں بھی [illegible] کی طالب

ہوں۔ تمہاری ہر قدم پر مدد کر سکتی ہوں۔ اس کلینک
میں مریضوں کے علاج کے لئے ہر طرح کا انتظام کریں گے۔"

"خیال تو بہت اچھا ہے۔"

"ایک دن یہ تجویز میں نے ابو کے سامنے بھی رکھی
تھی۔ وہ بھی اس سے متفق ہیں۔ مزید برآں اس
منصوبہ پر مالی امداد بھی دینے کو تیار ہیں۔"

"اللہ تمہارے ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔"

"اللہ یقیناً ہمیں کامیابی عطا کرے گا پرویز۔"
ریحانہ ایک عجیب نسوانی ادا سے بولی: "اچھا اب
بتاؤ کیا پیو گے؟ ٹھنڈا یا گرم؟"

"جو تمہاری پسند ہو۔" پرویز کے لہجہ میں سنجیدگی
تھی

شربت روح افزا کے دو گلاسوں کے ساتھ
ایک پلیٹ میں نمکین کاجو آ گیا۔ ریحانہ نے کاجو کا
پلیٹ پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "لو کاجو
کھاؤ۔ بڑے ذائقہ دار ہوتے ہیں یہ۔"

ناشتہ کے دوران ریحانہ نے شدت جذبات
سے بیتاب ہو کر کہا: "پرویز میں تمہارے تعاون سے
یہاں اپنے ارادوں میں ضرور کامیاب ہوں گی۔ مجھے تم
جیسے ہمدرد اور خوش مزاج ساتھی کی تمنا تھی۔"

"اچھا تو پھر اپنے کلینک کا کام شروع ہو جانا چاہیے۔
میری نیک خواہشات ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔"
[illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے خواہاں حضرات اپنی مطبوعات کی دو جلدیں بھیجا کریں۔ اس کے بغیر تبصرہ شائع نہیں کیا جائے گا۔ (مدیر)

رسالہ: انکشاف

مدیر: ایوب جوہر
قیمت: دو روپے ۱۵ ٹاکا
ملنے کا پتہ: ۱۲۶ لال چند مقیم لین۔ ڈھاکہ، بنگلہ دیش
تبصرہ نگار: محمد شمیم خان، شعبۂ اردو، راجشاہی یونیورسٹی (بنگلہ دیش)

بنگلہ دیش وجود میں آنے کے بعد اردو زبان معتوب تھی پھر بھی چند جیالوں نے اردو کی شمع روشن کر رکھی ہے۔ ہر سال کتابیں اور رسائل طباعت کے مرحلوں سے گزر کر منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ جس سرزمین میں اردو زبان شجرِ ممنوعہ تھی وہاں بنگلہ دیشی اردو ادب کی داغ بیل پڑ چکی ہے اور اپنے دامن میں ادبِ عالیہ کے ذخائر چھپائے ہوئے ہے۔

ڈھاکہ سے "انکشاف" کا دوسرا شمارہ منظر عام پر آیا ہے۔ رسالہ صوری و معنوی لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ اور بنگلہ دیش سے اتنا شاندار رسالہ نکالنا باعثِ تعجب ہے۔ سرورق بہت جاذبِ نظر ہے۔ [illegible] پاکستان اور بنگلہ دیش کے [illegible] ادیب اور نقادوں کی شمولیت میں گراں قدر تخلیقات سے پرچے کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے بنگالی ڈرامے کے سمندر سے انمول موتی نکالے ہیں جو اردو قارئین کے لئے معلومات کا خزانہ ہے۔ ڈاکٹر ابو سعید نورالدین نے اپنے مضمون میں شام بارکپوری کے افسانے کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ غلام محمد اپنے مضمون "ہم عصر اردو افسانے" میں اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے برہم معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر اپنے معاصرین پر پتھر مار رہے ہیں۔ اگرچہ وہ بعض دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً احمد سعدی اور شام بارک پوری کے متعلق مشکوک ہیں کہ ان کی افسانہ نگاری کی عمر ان سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابو سعید نورالدین نے شام بارک پوری کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے بنگلہ دیش میں اردو افسانہ نگاری کے پس منظر سے جو بحث کی ہے اس سے غلام محمد صاحب کے اختلاف اور اعتراض کا جواب مل جاتا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے [illegible]

یں لکھے جانے والے اُردو افسانے کو بین الاقوامی نظر
سے کم تر قرار دیا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ کیا ان کے افسانے بھی بین الاقوامی سطح پر پورا اُترتا
ہے۔ ہر تخلیق کار اپنی تخلیق اپنی زبان اور اپنے
احول کے مطابق پیش کرتا ہے۔ غلام محمد صاحب نے
خواہ مخواہ ایک زبان کے افسانے کو دوسری زبان کے
افسانے میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کسی
طرح مستحسن نہیں ہے۔

ایوب جوہر نے اپنے افسانے "انا الحق" میں
اُردو اور بنگلہ زبان میں آمیزش جس طرح پیش کی ہے،
وہ ایک نیا تجربہ ضرور ہے لیکن یہ زبان عام فہم نہیں،
اور نہ قاری اس کے مطالعے کے بعد افسانہ نگار کے
مفہوم اور مقصد سمجھ سکتا ہے۔ شام بارک پوری کے
افسانے "گگن کی چیخ" میں بظاہر دو جانوروں کی کشمکش
نظر آتی ہے لیکن دراصل ایک حریص انسان کی توسیعی
حکمتِ عملی اسے اس طرح بے نقاب کر دیتی ہے جس سے
انسانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے یعنی وہ جانور جو اپنے
ملک کے لئے قربانی پیش کرتا ہے، اسے بھی ملک اور اس
کی سرزمین میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ غلام محمد صاحب
کا افسانہ جس کا عنوان "شور" ہے، بظاہر اس میں شور
انگیزی تو نظر آتی ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے
اس میں فرسودگی پائی جاتی ہے۔

نظموں اور غزلوں کے حصّوں کا جہاں تک تعلق
ہے، اس میں قدیم و جدید کہنہ مشق اور نو مشق دونوں
قسم کے فن کار نظر آتے ہیں جن سے رسالے کی اہمیت
میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس کی شہرت میں
چار چاند لگ جاتا ہے۔ جمال شرقی کی نظم موضوعاتی
تازہ بھی ہے اور اس میں تاثر بھی پایا جاتا ہے۔
اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ کاتب نے اس میں جس
سن کا اندراج کیا ہے وہ موضوع کے لحاظ سے
۱۹۶۵ء کی جگہ ۱۹۵۵ء ہونا چاہئے۔

رسالے کے آخر میں حسبِ معمول چند کتابوں پر
تبصرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ جن میں ایک کتاب
"چراغِ لالہ" خود محاذ پبلیکیشن کی طرف سے شائع
کی گئی ہے، اور یہ بنگلہ دیش کے ایک کہنہ مشق اور
قابلِ احترام شاعر پروفیسر شمس رشیدانی کی قطعے
مضامین کا نمونہ ہے۔

نام کتاب: کرچیں
فن کار: انور ندیم
پبلیشر: ہم لوگ پبلیشرس، لکھنؤ
قیمت: ۱۵ روپے
مبصر: جمیل احمد علوی

انور ندیم اُردو دنیا میں ایک ایسا نام ہے
جس کے پاس کہانیوں کی فصلیں بونے والی
کی دولت ہے اور ان کا یہ کمال جوہر ہے کہ انہوں نے
فلمی دنیا کا رخ نہیں کیا کہ فلمی دنیا کی خوشنمائیں
شہرت کی چمک، دولت کی بہتات اور چہروں کے

سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک
ہمیشہ استعمال

The SOHAIL Monthly, River Side Road, Gaya-823

years of Publication

Phone :